کلیاتِ پریم چند

5

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

5

پردۂ مجاز

مرتبہ

مدن گوپال
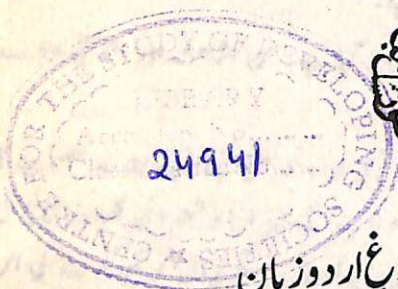
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک-1، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

Kulliyat-e-Premchand-5

Edited by : Madan Gopal

Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

سنہ اشاعت : جون 2002 شک 1924

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : -/117

سلسلہ مطبوعات : 991

کمپوزنگ : محمد موسیٰ رضا

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے.پورم، نئی دہلی 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، 1397 پہاڑی املی، بازار ٹمیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظر عام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیات پریم چند" کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈارمے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

"کلیات پریم چند" کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

آئندہ اگر پریم چند کی کوئی تحریر/ تحریریں دریافت ہوتی ہیں، آئندہ ایڈیشنوں میں ان کو شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ "کلیات پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور معاون ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

دیباچہ

چوگانِ ہستی کے بعد پریم چند نے "کایا کلپ" لکھنا شروع کردیا تھا۔ سرسوتی پریس کی پریشانیوں کے باوجود چھ مہینے میں اس کا پہلا حصہ تیار ہوگیا۔ دوسرا حصہ نومبر 1924 کو شروع ہوا اور ستمبر 1925 کو ختم ہوا۔ ہندی میں لکھا جانے والا پریم چند کا یہ پہلا ناول تھا۔ بعد کے دیگر دوسرے ناول بھی پہلی بار ہندی میں لکھے گئے۔ کلیاتِ پریم چند کی اولین تین جلدوں میں بتایا گیا ہے کہ چوگانِ ہستی اور اس سے قبل کے سب ناول پہلی بار اردو میں لکھے گئے لیکن ان کے ہندی تراجم اس لیے پہلے شائع ہوئے کہ بازارِ حسن، گوشۂ عافیت اور چوگانِ ہستی کی اشاعت کے لیے کوئی اردو ناشر تیار نہیں تھا۔ ادھر ہندی کے ناشر تیار کھڑے تھے اسی لیے ہندی تراجم (سیواسدن، پریم آشرم اور رنگ بھومی) پہلے شائع ہوئے۔

کایا کلپ ہندی میں لکھا گیا اور سرسوتی پریس سے 1926 میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ "پردۂ مجاز" پانچ سال بعد لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا۔ دیانرائن نگم نے زمانہ کے فروری 1926 کے شمارہ میں لکھا تھا۔

"مشہور و معروف افسانہ نگار منشی پریم چند کے کایاکلپ نامی ہندی ناول کی تنقید بہت عرصہ ہوا رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ اب ہم کو خوشی ہے کہ پریم چند نے اس کا اردو ترجمہ پردۂ مجاز کے نام سے مکمل کرلیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ پردۂ مجاز میں پریم چند نے مسئلہ تناسخ کو اٹھایا ہے۔ اس کے کردار پچھلے جنم کے واقعات کو یاد کرتے ہیں اور اس میں اپنے زمانے کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ترک موالات اور خلافت تحریک میں سب ہندستانی رہنماؤں نے

کندھے سے کندھا ملاکر انگریزی حکومت کے خلاف حصہ لیا تھا۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کی مماثلت رام لکھن سے کی گئی ہے۔ انگریز حکمراں پریشان تھے مگر 1922 میں یوپی کے چوراچوری مقام پر بے قابو بھیڑ کی طرف سے ایک پولس تھانہ کو آگ لگانے کے بعد گاندھی جی نے تحریک کو یکایک واپس لے لیا تھا۔ اس کے بعد سیاسی ماحول میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا اور انگریز حکومت نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور ہندو مسلم عوام کے درمیان اختلافات کو خوب ہوا دی۔ ہندو مسلم فسادات شروع کروائے۔

پریم چند کے مطابق "فرقہ وارانہ کشیدگی" سوسائٹی کی قدرتی حالت کا اظہار نہیں بلکہ ایک مجلس یا ملکی بیماری ہے جو سوسائٹی کا ایک عارضی عارضہ ہے جسے انسان کی بیماری کلی میعاد عموماً چند دنوں یا چند مہینوں تک رہتی ہے۔ اور اس کے بعد مریض یا تو لقمہ اجل ہوجاتا ہے یا صحت حاصل کرلیتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی خانہ جنگی اور کشیدگی کی بھی ایک حد ہوتی ہے جس کے پہنچنے پر لوگ روزانہ لڑائی جھگڑوں سے تنگ آکر اس سے منحرف ہوجاتے ہیں یا خود بخود ایسے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس وقت ہندستان کے آسمان پر فرقہ وارانہ جنگ جوئی اور کشیدگی کے جو بادل دکھائی دیتے ہیں اور ہندو مسلم عناد کا جو طوفان سارے ملک کو تباہ و برباد کررہا ہے۔ اس کی بھی آخر کوئی حد ہے۔ دنیا کی تاریخ میں مختلف عوام و مذاہب میں باہمی کشمکش اور تعصب کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دو سال سے کم عرصہ ہوا کہ پورب کے ملک میں فرانس، نیوزی لینڈ، انگلینڈ وغیرہ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار تھے۔ اس کے مقابلے میں ہندو مسلم کشیدگی کوئی وقت نہیں رکھتی۔ لیکن آج ان تمام ممالک کے باشندے خلوص و محبت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندستانی کے دن بھی ضرور بدلیں گے...... زمانہ جولائی 1927ء"

پریم چند نے حالات کو صحیح نظریہ سے پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ خواجہ حسن نظامی نے کرشن بیتی لکھی۔ پریم چند نے کربلا لکھ کر ہندو دانشوروں کو اسلام کی تاریخ سے واقف کرانے کی کوشش کی۔ اسی دور میں پریم چند نے نبی کا نیتی نرواہ، عفو، مندر مسجد وغیرہ افسانے بھی اسی غرض سے لکھے۔ "کایاکلپ" یا "پردۂ مجاز" بھی اسی صف میں

آتا ہے۔ منشی دیانرائن نگم نے اس ناول کے بارے میں زمانہ میں لکھا تھا کہ اس کا مقصد ہندو مسلم تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان میں رواداری پیدا کرنا ہے۔ نگم کا خیال تھا کہ ناول کا پلاٹ خوبصورت اور دلکش ہے۔ منشی دیانرائن نگم نے یہ بھی لکھا تھا کہ پلاٹ کی دلکشی کے اعتبار سے یہ ناول چوگانِ ہستی سے بھی بہتر ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

مدن گوپال

حصّہ اوّل

(1)

دوپہر کا وقت تھا۔ پرچاروں طرف اندھیرا تھا۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا، گویا دنیا میں کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو۔ ہوا بھی بند ہوگئی تھی۔ سورج گرہن لگا ہو تھا۔ تربینی کے گھاٹ پر جاتریوں کی بھیڑ تھی۔ وہ سبھی ہندو جن کے دل میں عقیدت اور مذہب کا جوش تھا۔ ہندوستان کے ہر ایک گوشے سے اس متبرک موقع پر تربینی کے پاک سرچشمے میں اپنے گناہوں کو غرق کرنے کے لیے آپہنچے تھے۔ لوگ اتنے جوش سے تربینی کے تنگ گھاٹ کی طرف گرتے پڑتے لپکے چلے جاتے تھے۔ گویا نجات کا دروازہ سامنے آرہا ہے۔

کتنے آدمی کچل گئے۔ کتنے ڈوب گئے۔ کتنے کھو گئے۔ کتے لولے لنگڑے ہوگئے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ سارا منظر مذہبی جذبات کو بیدار کرنے والا تھا۔ دوپہر کو تاروں کی روشنی گویا مجاز کے پردے کو پھاڑ کر حقیقت کو روشن کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ عوام کے دل میں قدیم سے یہ خیال جاگزیں تھا کہ تارے دن کو کہیں ساگر میں ڈوب جاتے ہیں۔ آج وہی ستارے آنکھوں کے سامنے چمک رہے تھے۔

گھنٹے بھر کے بعد پھر روشنی پھیلنے لگی۔ کواکب غالب ہوگئے۔ آفتاب مراقبے سے نکلنے لگا۔

جاتری لوگ اپنے اپنے گناہوں کی گٹھڑیاں تربینی میں ڈال کر جانے لگے۔ شام ہوتے ہوتے گھاٹ پر پھر خاموشی کا عالم طاری ہوگیا۔ ہاں! کچھ زخمی، کچھ نیم جان لوگ جابجا پڑے کراہ رہے تھے اور اونچے کراڑا سے کچھ دور ایک نالی میں ایک تین چار سال کی لڑکی چلا چلا کر رو رہی تھی۔

سیواسمتیوں کے نوجوان جو اب تک مجمع کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش

کررہے تھے ڈولیاں کندھوں پر لے لے کر زخمیوں اور بھولے بھٹکوں کی خبر لینے آپہنچے۔ دفعتاً ایک نوجوان کے کانوں میں اس لڑکی کے رونے کی آواز پڑی۔ اپنے رفیق سے بولا۔ جسودا! ادھر کوئی لڑکا رورہا ہے۔

جسودا نے جواب دیا۔ ہاں معلوم تو ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو کوئی کیسے سمجھائے کہ یہاں بچوں کو لانے کی ضرورت نہیں۔ چلو دیکھیں!

دونوں نے ادھر جاکر دیکھا تو ایک لڑکی نالی میں پڑی رورہی ہے۔ گورا رنگ تھا۔ بھرا ہوا بدن۔ بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھیں، گورا چہرہ، سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی، کسی اچھے گھر کی لڑکی تھی۔ دونوں نوجوانوں کو دیکھ کر وہ ڈری اور چیخ اٹھی۔ جسودا نے اسے گود میں اٹھالیا اور بولا۔ بیٹی! رومت! ہم تجھے تیری ماں کے پاس پہنچادیں گے۔ تجھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ تیرے بابو جی کا کیا نام ہے؟

لڑکی چپ تو ہوگئی۔ پر خائف سے دیکھ دیکھ کر سسک رہی تھی۔ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

جسودا نے چمکار کر پوچھا۔ بیٹی! تمھارا گھر کہاں ہے؟

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

جسودا نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ اب بتاؤ محمود کیا کریں؟

محمود ایک امیر مسلمان کا لڑکا تھا۔ جسودا نندن سے اس کی گہری دوستی تھی۔ ان کے ساتھ وہ بھی سیواسمتی میں داخل ہوگیاتھا۔ بولا۔ کیا بتاؤں۔ کیمپ میں لے چلو۔ شاید کچھ پتہ چلے۔

جسودا۔ اس وقت اگر اس کا باپ مل جائے تو سچ کہتا ہوں۔ بغیر مارے نہ چھوڑوں۔ بچہ گہنے پہنا کر لائے تھے۔ گویا کوئی تماشہ دیکھنے آئے ہوں۔

محمود۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ تمھیں پیٹوں۔ میاں بیوی یہاں آئے تو بچے کو کس پر چھوڑ لیتے ہو؟ گھر میں اگر کوئی نہ ہو۔ تو؟

جسودا۔ تو پھر انھیں کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟

محمود۔ تم تو منکر ہو۔ تو کیاجانو۔ سچا مذہبی ایمان کسے کہتے ہیں؟

جسودا۔ ایسے مذہبی ایمان کو دور ہی سے سلام کرتا ہوں۔ اس وقت دونوں میاں بی

بی بیٹھے ہائے ہائے کر رہے ہوں گے۔

محمود۔ کون جانے وہ بھی کچل کچلا گئے ہوں۔

لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ تم ہمیں گھر پہنچا دوگے؟ بابو جی تم کو پیسے دیں گے۔

یہ کہہ کر لڑکی جسودا کی گود سے چمٹ گئی۔ دونوں دوست اسے لیے کیمپ میں آئے۔ پر یہاں کچھ پتہ نہ چلا۔ تب دونوں اس طرف گئے۔ جہاں میدان میں بہت سے جاتری پڑے ہوئے تھے۔ محمود نے لڑکی کو کندھے پر بٹھالیا اور جسودا نندن بلند آواز میں پکارنے لگا۔ یہ کس کی لڑکی ہے؟ کسی کی لڑکی تو نہیں کھوگئی ہے؟ یہ آوازیں سُن سُن کر کتنے ہی جاتری۔ ہاں، ہاں، کہاں، کہاں کر کے دوڑے۔ پر لڑکی کو دیکھ کر مایوس لوٹ گئے۔

پہر رات تک دونوں دوست گھومتے رہے۔ نیچے، اوپر۔ قلعہ کے آس پاس ریل کے اسٹیشن پر۔ موٹروں کے اڈے پر جاتری ہی جاتری پڑے ہوئے تھے۔ پر اس لڑکی کے ماں باپ کا کہیں نشان نہ تھا۔ آخر مجبور ہوکر دونو آدمی کیمپ لوٹ آئے۔

دوسرے دن سمتی کے اور خادموں نے پھر پتہ لگانا شروع کیا۔ دن بھر دوڑے سارا پریاگ چھان مارا۔ سبھی دھرم شالاؤں کی خاک چھانی۔ پر سب بے سود۔

تیسرے دن اخباروں میں نوٹس دیا گیا اور دو دن وہاں۔اور رہ کر سمتی آگرے لوٹ گئی۔ لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔ لوگوں کوامید تھی کہ اخباروں سے شاید کچھ پتہ چلے۔ جب ادھر سے بھی ناکامی ہوئی، تو کارکنوں نے مجبور ہوکر اسے یتیم خانے میں رکھ دیا۔ جسودا نندن ہی اس یتیم خانے کے مینجر تھے۔

(2)

بنارس میں مہاتما کبیر کے چورے کے قریب منشی بجردھر کا مکان ہے۔ آپ ہیں تو راجپوت، پر اپنے آپ کو منشی کہتے اور لکھتے ہیں۔ منشی کے لقب سے آپ کو بڑی محبت ہے۔ آپ کئی سال سے پنشن پاتے ہیں۔ بہت چھوٹے عہدے سے ترقی کرتے کرتے بالآخر آپ تحصیلداری کے منصب جلیل پر فائز ہوئے۔ اگرچہ آپ اس عہدے پر تین مہینے سے زیادہ نہ رہے۔ اور اتنے دن بھی محض قائم مقام رہے۔ پر

آپ اپنے آپ کو سابق تحصیلدار لکھتے تھے۔ اور محلے والے بھی انھیں خوش کرنے کو تحصیلدار صاحب کہتے تھے۔ اعزاز پاکر آپ خوشی سے اکڑ جاتے تھے۔ لیکن پنشن تو پچیس ہی روپے ملتی تھی۔ اس لیے تحصیلدار صاحب کو بازار ہاٹ خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ گھر میں ان کے علاوہ دو تین آدمی اور تھے۔ لڑکا۔ لڑکی اور بیوی۔ لڑکے کا نام چکردھر تھا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ باپ کے پنشن کے زمانے میں گھر سے کسی قسم کی مدد نہ مل سکنے کے باوجود محض اپنی جاں فشانی سے ایم۔ اے پاس کرچکا تھا۔ منشی جی نے پہلے ہی سے سفارشیں پہنچانی شروع کی تھیں۔ دربار داری کے فن میں ماہر تھے۔ حکام کو سلام کرنے کا انھیں مرض تھا۔ حاکموں نے ان کی کارگزاری کے جو پروانے دیے تھے نئے حاموں سے ربط ضبط پیدا کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی۔ لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلا اور منشی جی نے چکردھر سے کمشنر کے یہاں چلنے کو کہا تو اس نے جانے سے صاف انکار کردیا۔

منشی جی نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ کیوں کیا گھر بیٹھے تمھیں نوکری مل جائے گی؟

چکردھر نے کچھ خفیف ہوکر جواب دیا ملازمت کرنے کا میرا ارادہ نہیں ہے!

بجردھر نے حیرت سے کہا۔ نوکری کے سوا اور کروگے کیا؟

"میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔"

"آزاد رہنا تھا تو ایم۔ اے کیوں پاس کیا؟"

اسی لیے "کہ آزادی کی قیمت سمجھوں۔"

اس دن سے باپ بیٹے میں آئے دن بم چیخ مچی رہتی تھی۔ منشی جی بڑھاپے میں بھی شوقین آدمی تھے۔ اچھا پہننے اور اچھا کھانے کی خواہش ابھی باقی تھی۔ اب تک اس خیال سے دل کو سمجھاتے تھے کہ لڑکا برسر روزگار ہوجائے گا تو موج اُڑائیں گے۔ اب لڑکے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ دل میں جھنجلاتے اور اُسے کام چور، مغرور، کوتاہ اندیش کہہ کر اپنا غصہ اُتارتے تھے۔ ابھی تمھیں کچھ نہیں سوجھتی۔ جب میری آنکھیں بند ہوجائیں گی تب سوجھے گی۔ تب سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔ لاکھ بار کہہ دو کہ یہ زمانہ خوشامد اور سلامی کا ہے۔ تم نم کے سمندر بنے بیٹھے رہو۔ کوئی مفت

بھی نہ پوچھے گا۔ وہ زمانہ لد گیا۔ جب علم کی قدر تھی۔

چکردھر باپ کا ادب کرتے تھے۔ ان کا جواب تو نہ دیتے پر اپنی زندگی کے لیے انھوں نے جو معیار دل میں قائم کرلیا تھا۔ اس سے نہ ہٹتے تھے۔ انھیں یہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا کہ کوئی محض پیٹ پالنے کے لیے آدھی عمر پڑھنے میں صرف کردے۔ اگر پیٹ پالنا ہی زندگی کا مقصد ہو تو پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ علم کے ساتھ زندگی کا معیار کچھ اونچا نہ ہوا تو پڑھنا بیکار ہے۔ علم کو ذریعہ معاش بناتے ہوئے انھیں شرم آتی تھی۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ منشی بجردھر نے سمجھا تھا جب یہ بھوت اس کے سر سے اُتر جائے گا۔ شادی بیاہ کی فکر ہوگی۔ تو آپ ہی آپ نوکری کی تلاش میں دوڑے گا۔ جوانی کا نشہ بہت دنوں تک نہیں ٹھہرتا۔ لیکن جب دو سال گزر جانے پر بھی بھوت کے اترجانے کی کوئی علامت نظر نہ آئی تو ایک دن انھوں نے چکردھر کو خوب پھٹکارا۔ دنیا کا دستور ہے۔ پہلے اپنے گھر میں دیا جلاکر مسجد میں جلاتے ہیں۔ تم گھر کو اندھیرا رکھ کر مسجد کو روشن کرنا چاہتے ہو۔ جو آدمی اپنے گھر والوں کی پرورش نہ کرسکا۔ وہ دوسروں کی کیا خاک مدد کرے گا؟ میں بڑھاپے میں پیسے پیسے کو ترسوں اور تم دوسروں کی خدمت کرتے پھرو۔ میں نے تمھیں پیدا کیا۔ دوسروں نے نہیں۔ میں نے تمھیں پالا پوسا۔ دوسروں نے نہیں۔ میں گود میں لے کر حکیم وید کے دروازے کی خاک چھانتا پھرا۔ تم پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔

چکردھر اب باپ کی مرضی سے منہ نہ موڑ سکے۔ انھیں اپنے کالج میں ہی کوئی جگہ مل سکتی تھی۔ لیکن یہ انھیں منظور نہ تھا۔ وہ کوئی ایسا دھندہ چاہتے تھے۔ جس سے تھوڑی دیر روزانہ کام کرکے اپنے باپ کی مدد کرسکیں۔ حسن اتفاق سے جگدیش پور کے دیوان ٹھاکر ہری سیوک سنگھ کو اپنی لڑکی کے لیے ایک لائق اور خوش اطوار تالیق کی ضرورت پڑی۔ چکردھر نے یہ خدمت قبول کرلی۔

(3)

کئی مہینے گزر گئے۔ چکردھر مہینے کے آخیر میں روپے لاتے اور ماں کے ہاتھ پر

رکھ دیتے۔ اپنے لیے انھیں روپے کی ضرورت نہ تھی۔ دو موٹے کرتوں پر سال کاٹ دیتے تھے۔ ہاں کتابوں سے انھیں شوق تھا۔ پر اس کے لیے یونیورسٹی کا کتب خانہ کھلا ہوا تھا۔ اب بجردھر کا منہ کچھ سیدھا ہوا۔ ڈرے کہ اس سے زیادہ دباؤں تو شاید یہ بھی ہاتھ سے نہ جائے!

دیوان صاحب کی لڑکی کا نام منورما تھا۔ عمر ۱۳ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن چکردھر کو اسے پڑھاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ یہی کوشش کرتے تھے کہ ٹھاکر صاحب کی موجودگی میں اسے پڑھائیں۔ اگر کبھی ٹھاکر صاحب گھر پر نہ ہوتے تو چکردھر کے سر پر مصیبت سی آجاتی۔

ایک روز ایسا ہی موقع پیش آیا۔ چکردھر کرسی پر تو بیٹھے پر منورما کی طرف نہ تاک کر دروازہ کی طرف تاک رہے تھے۔ گویا وہاں بیٹھے ڈرتے ہوں۔ منورما بالمیکی رامائن پڑھ رہی تھی۔ اس نے دو تین بار چکردھر کی طرف آنکھ اٹھائی تو انھیں دروازہ کی طرف تاکتے دیکھ کر پھر کتاب دیکھنے لگی۔ اس کے دل میں سیتا کے بنباس کے متعلق ایک سوال پیدا ہوا تھا۔ اور وہ اس کا جواب چاہتی تھی۔ چکردھر نے پوچھا۔ چپ کیوں بیٹھی ہو۔ آج کا سبق کیوں نہیں پڑھتیں؟

منورما بولی۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ رام چندر نے سیتا جی کو گھر سے نکال دیا تو وہ چلی کیوں گئیں؟

چکردھر نے پوچھا اور کیا کرتیں؟

"وہ جانے سے انکار کر سکتی تھیں۔ راج پران کا بھی تو حق تھا؟ پھر وہ بے گناہ تھیں۔"

"ہمارے یہاں شوہر کا حکم ماننا عورت کا فرض مانا گیا ہے۔"

یہ تو میں جانتی ہوں کہ شوہر کا حکم ماننا بیوی کا فرض ہے۔ لیکن کیا ہر حالت میں؟ جب رام چندر نے سیتاجی کی آزمائش کرلی تھی اور دل میں انھیں پاک سمجھتے تھے۔ تو محض بدنامی سے بچنے کے لیے انھیں گھر سے نکال دینا کہاں کا انصاف تھا؟۔

چکردھر بڑے خلجان میں پڑے۔ ان کے دل میں خود یہی اعتراض پیدا ہوا تھا۔ اور اب تک اس کا کوئی قابل اطمینان جواب نہ ملا تھا۔ بغلیں جھانکنے لگے۔

منورما نے انھیں خاموش دیکھ کر پھر پوچھا۔ کیا آپ بھی انھیں گھر سے نکال دیتے؟

"نہیں میں تو شاید نہ نکالتا۔"

"آپ بدنامی کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے"؟

"نہیں۔ میں تو جھوٹی بدنامی کی پرواہ نہ کرتا۔"

منورما کی آنکھیں فاتحانہ مسرت سے چمک اٹھیں۔ بولی یہی بات میرے دل میں بھی تھی۔ میں نے گھر میں سبھی سے یہ سوال پوچھا تھا۔ پر سب لوگ یہی کہتے تھے کہ رام چندر تو بھگوان ہیں۔ اب میں ان لوگوں کو خوب آڑے ہاتھ لوں گی۔

اس دن سے منورما کی طبیعت پڑھنے کی طرف کچھ زیادہ مائل ہوگئی۔ پہلے کی طرح حیلے حوالے نہ کرتی۔ جب چکردھر کے آنے کا وقت آتا۔ تو وہ پہلے ہی آ بیٹھتی اور ان کا انتظار کرتی۔ اب اُسے اُن سے اپنے دلی خیالات ظاہر کرتے تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں ان کی ہنسی نہ اُڑائی جائے گی۔

ٹھاکر ہری سیوک کی عادت تھی کہ پہلے وہ چار مہینوں تک تو نوکروں کو ٹھیک وقت پر تنخواہ دے دیتے۔ پر جیوں جیوں نوکر پُرانا ہوتا جاتا تھا وہ اس سے بے پرواہ ہوتے جاتے تھے۔ ان کے یہاں کئی نوکر ایسے پڑے تھے۔ جنھیں برسوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ چکردھر کو بھی ادھر چار مہینوں سے کچھ نہ ملا تھا۔ نہ ٹھاکر صاحب بلا مانگے دیتے تھے اور نہ چکردھر لحاظ کے مارے مانگتے تھے۔ ادھر گھر میں روز تکرار ہوتی تھی۔ منشی بجردھر بار بار کہتے۔ مانگتے کیوں نہیں؟ کیامنہ میں دہی جمایا ہوا ہے؟ لحاظ بھلے آدمیوں کا کیا جاتا ہے۔ ایسے نادہندوؤں کا لحاظ نہیں کیاجاتا۔ آخر ایک دن چکردھر نے مجبور ہوکر ایک رقعہ لکھا۔ مگر دیوان صاحب نے رقعہ لوٹادیا۔ بے ضرورت خط وکتابت کرنے کی انھیں فرصت نہ تھی۔ بولے انھیں جو کچھ کہنا ہو خود آکر کہیں۔ چکردھر شرماتے ہوئے گئے اور ایک لمبی تمہید کے بعد روپے مانگے۔ ٹھاکر صاحب ہنس کر بولے۔ واہ بھئی واہ! آپ بھی ایک ہی بے فکرے ہیں۔ چار مہینہ سے تنخواہ نہ ملی اور آپ خاموش بیٹھے رہے۔ آپ کو مہینے اپنی تنخواہ لے لینی چاہیے تھی۔ سوچئے مجھے یک مشت دینے میں کتنا تردد ہوگا۔ خیر جائیے دس پانچ دن میں مل جائے گی۔

چکردھر کچھ نہ کہہ سکے۔ لوٹے تو چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ اس خیال سے دل کانپنے لگا کہ دیکھیں آج گھر پر کیا کیفیت ہوتی ہے۔ منورما نے ان کا رقعہ دیوان صاحب کے پاس لے جاتے ہوئے راستہ میں پڑھ لیا تھا۔ انھیں اُداس دیکھ کر پوچھا۔ دادا نے آپ سے کیا کیا۔

چکردھر اس کے رُوبرو روپے پیسے کاذکر نہ کرنا چاہتے تھے۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ کچھ تو نہیں۔

"آپ کو روپے نہ دیے"؟

چکردھر کا منہ لال ہوگیا۔ بولے مل جاویں گے۔

"آپ کو ایک سو بیس روپیہ چاہیے نہ"۔

"اس وقت کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے"۔

"ضرورت نہ ہوتی تو آپ مانگتے ہی کیوں؟ دیکھیے میں جاکر....."

چکردھر نے روک کر کہا۔ نہیں نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔

منورما نے نہ مانا فوراً گھر میں گئی۔ اور پورے روپے لاکر میز پر رکھ دیے۔ گویا گنے گنائے رکھے ہوں۔

چکردھر نے کہا۔ تم نے ٹھاکر صاحب کو ناحق تکلیف دی۔

منورما نے اپنی صفائی دی۔ میں نے تو اُن سے کہا بھی نہیں۔ دادا کسی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اگر اپنے لیے ابھی موٹر منگوانی ہو تو فوراً منگوا لیں گے۔ پر جس کے روپے آتے ہیں۔ اس کو نہ دیں گے۔

وہ تو پڑھنے بیٹھ گئی۔ لیکن چکردھر کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ روپے لوں یا نہ لوں۔ انھوں نے فیصلہ کیا۔ لینا مناسب نہیں۔ سبق ختم ہوچکنے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر روپے لیے باہر نکل آئے۔ منورما روپے لیے ہوئے پیچھے برآمدے تک آئی۔ بار بار کہتی تھی اسے لیے جائیے۔ جب دادا جی دیں مجھے لوٹا دیجیے گا۔ پر چکردھر نے ایک نہ سنی اور جلدی سے باہر نکل گئے۔

(4)

چکردھر گھر پہنچے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازہ پر منشی جی کے ساتھ ایک نئے مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ نائی کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ چکردھر کی روح فنا ہوگئی۔ گھر میں جاکر ماں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آگرے کے کوئی وکیل ہیں۔ منشی جسووانندن! فراست سے ان کے آنے کا منشا تاڑ کر ماں سے کہا۔ میں ذرا گھومنے جاتا ہوں۔

نرملا نے کہا۔ نہیں ابھی کہیں مت جاؤ۔ آؤ۔ ذرا سر میں تیل ڈال دوں۔ صاف کپڑے پہن کر ذرا دیر کے لیے باہر جا بیٹھو!

چکردھر نے دروازے کی طرف ایک قد بڑھا کر کہا۔ گھر میں کھانا بھی ہے کہ شادی کر دینے کا جی چاہتا ہے۔

مگر نرملا کب سننے والی تھی۔ اس نے انھیں زبردستی پکڑ کر سر میں تیل ڈال دیا۔ صندوق سے ایک دھلا ہوا کرتا نکال لائی۔ اور یوں پہنانے لگی جیسے کوئی بچے کو پہنائے۔ چکردھر نے گردن پھیرلی۔

نرملا بولی۔ مجھ سے شرارت کروگے تو مار بیٹھوں گی۔ کیا مجھ سے مرتے دم تک چولھا چکی کراتے رہوگے؟

اتنے میں منشی جی نے پکارا۔ ننھے کیا کر رہے ہو۔ ذرا یہاں تو آؤ۔ چکردھر کے رہے سہے حواس بھی غائب ہوگئے۔ ماں سے بولے میں کہے دیتا ہوں۔ میں یہ جُوا گلے میں نہ ڈالوں گا۔ اور دبے پاؤں جاکر کھڑے ہوگئے۔ جسووانندن نے اُٹھ کر انھیں چھاتی سے لگالیا اور بولے۔ اب کی سرسوتی میں آپ کا مضمون دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس مسئلہ پر ایسی فاضلہ تحریر میری نظر سے نہیں گذری۔

وکیل صاحب کے بزرگانہ اخلاق اور قدر دانی نے چکردھر کو رام کرلیا۔ وہ کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ بجردھر بول اُٹھے۔ تم نے بہت دیر لگادی؟ راجہ صاحب سے کچھ بات چیت ہونے لگی کیا؟ (جسووانندن سے) راجہ صاحب کی ان پر بڑی نوازش ہے۔ بالکل لڑکوں کی طرح مانتے ہیں۔ ان کی باتیں سننے سے انھیں سیری ہی نہیں ہوتی (نائی سے) دیکھ چلم بدل دے اور جاکر جھنکو سے کہہ دے۔ ستارو تارلے

کر آجائے۔ ادھر ہی سے گنیش کے گھر جاکر کہنا۔ تحصیلدار صاحب نے ایک ہانڈی اچھا دہی مانگا ہے۔ کہہ دینا دہی خراب ہوا تو دام نہ ملیں گے۔

یہ حکم دے کر منشی جی اندر آگئے۔ ادھر کی فکر ٹلی ہوئی تھی۔ آج ان کا ٹھاٹھ باٹ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے عارضی عروج کے زمانے کا الپا کے کا چغہ نکالا تھا۔ اسی زمانہ کی مندیل بھی سر پر رکھی تھی اور آنکھوں میں سرمہ بھی تھا۔ بالوں میں تیل بھی۔ گویا انھیں کی شادی ہونے والی ہو۔ چکردھر دل میں شرما رہے تھے کہ یہ حضرت ان کا یہ بھیس دیکھ کر دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ راجہ صاحب کا تذکرہ سن کر تو وہ گڑے گئے۔

منشی جی چلے گئے۔ تو جسوانندن نے پوچھا۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟

چکردھر نے سر جھکا کر کہا۔ ابھی تو کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ ہاں ارادہ ہے کہ کچھ دن آزاد رہوں۔

جسوا نندن نے کہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے؟ آپ جتنی خوبی سے سمتی کو چلارہے ہیں۔ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ آپ کے انھیں اوصاف نے مجھے گرویدہ کرلیا ہے۔ میری نگاہ میں اطوار کی وقعت دولت اور جائداد سے کہیں زیادہ ہے۔

چکردھر نے شرماتے ہوئے کہا۔ لیکن میں تو ابھی خانہ داری کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ خانہ داری میں پھنس کر قومی کام کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

ایسی بات تو نہیں۔ اس وقت بھی قومی خادموں میں عیالداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

"اسی سے تو یہ مردہ دلی چھائی ہوتی ہے"۔

جسوانندن نے ملائمت سے کہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر بیوی اور شوہر کے خیالات میں اتفاق ہو۔ تو عورت مرد کے کاموں میں حائل ہونے کے بدلے معاون ہوسکتی ہے۔ میری لڑکی کو نہ گہنے کپڑے کا شوق ہے، نہ نمائش کا۔ آپ کے ساتھ وہ ہر حالت میں خوش رہے گی۔ اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو میں کہوں گا کہ ایشور نے اسے آپ کے لیے ہی بنایا ہے اور آپ کو اس کے لیے۔ میں اس کی تصویر لیتا آیا ہوں۔

یہ کہہ کر جسووانندن نے اپنا صندوق کھول کر ایک تصویر نکالی۔ اور چکردھر کے سامنے بڑھاتے ہوئے بولے۔ میں تو اسے معیوب نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ عورت مرد کو تبادلہ خیالات کا بھی موقعہ ملا چاہیے۔

چکردھر کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے کہ تصویر کو کیوں کر غور سے دیکھوں وہاں دیکھتے شرم آتی تھی۔ مہمان کو تنہا چھوڑ کر گھر میں جاتے نہ بنتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا۔ پان کی طشتری اور تصویر لیے ہوئے گھر میں چلے گئے۔ چاہتے تھے کہ اپنے کمرے میں جاکر تصویر دیکھیں کہ نرملا نے پوچھا۔ کیا بات چیت ہوئی ؟ کچھ دیں دلائیں گے؟

چکردھر نے چڑھ کر کہا۔ اگر تم میرے سامنے دینے والے کا نام لوگی تو زہر کھالوں گا۔

"واہ رے ! تو کیا پچیس سال تک یوں ہی پالا پوسا ہے۔ منہ دھو رکھیں"۔

"تو بازار میں کھڑا کرکے بیچ کیوں نہیں لیتیں؟"

"تم تو ابھی سے خسر کے غلام ہوگئے۔ شادی کے نام ہی میں جادو ہے"۔

چکردھر کی چھوٹی بہن منگلا طشتری میں پان رکھ کر ان کو دینے لگی۔ تو کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر نظر آئی۔ ان سے تصویر لے لی اور لالٹین کے سامنے لے جاکر بولی۔ ماں دیکھو۔ کتنی اچھی تصویر ہے!

نرملا نے جاکر تصویر دیکھی تو آنکھوں میں نور آگیا۔ بولی۔ بیٹا۔ تیرے نصیب جاگ گئے۔ مجھے تو کچھ بھی نہ ملے۔ تو بھی اس سے تیرا بیاہ کردوں۔

چکردھر نے اڑتی ہوئی نظر سے تصویر دیکھی اور ہنس کر بولے۔ گاجر کی سی تو ناک ہے۔ اس پر کہتی ہو۔ کتنی خوبصورت ہے۔

نرملا بولی۔ چل۔ دل میں تو پھولا نہ سماتا ہوگا۔ اوپر سے باتیں بناتا ہے۔

چکردھر پان کی طشتری اور تصویر لے کر چلے۔ تو باہر نہ جاکر اپنے کمرے میں گئے اور تصویر کو آنکھوں سے پینے لگے۔ انھیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا تصویر نے شرم سے آنکھیں نیچی کرلی ہیں۔ گویا ان سے کچھ کہہ رہی ہے۔ انھوں نے اب تک جتنی صورتیں دیکھی تھیں۔ ان سے دل میں کچھ موازنہ کرنے لگے۔ منورما ہی اس سے ملتی تھی۔ آنکھیں دونوں کی ایک سی ہیں۔ رنگ بھی ایک سا۔ سراپا میں کوئی فرق نہیں۔

مگر یہ کتنی شرمیلی ہے۔ وہ کتنی شوخ۔ تصویر ہاتھ میں لیے ہوئے چکردھر آنے والی زندگی کے میٹھے خواب دیکھنے لگے۔ یہ دھیان بھی نہ رہا کہ منشی جسوداننددن باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔

یکایک طبلے کی تھاپ نے انھیں بیدار کیا۔ منشی بجردھر کو گانے بجانے کا شوق تھا گلے میں لوچ تو نہ تھا مگر تال سر سے واقف تھے۔ چکردھر ڈرے کہ دادا اس وقت کہیں گانے نہ لگیں۔ نہیں تو خفیف ہونا پڑے گا۔ جاکر ان کے کان میں کہا۔ نہ گایئے گا۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ منشی جی کتھکوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک معزز مہان کے سامنے گائیں۔

جب ساز مل گئے۔ تو جھنکو نے کہا۔ تحصیلدار صاحب! پہل تو آپ ہی کی ہو۔

چکردھر کا سینہ دھڑکنے لگا۔ لیکن منشی جی نے ان کی طرف تسلی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم لوگ اپنا گانا سناؤ۔ میں کیا گاؤں۔ جھنکو بولا۔ واہ حضور! واہ! آپ کے سامنے ہم کیا گائیں گے۔ اچھے اچھے اُستادوں کی تو ہمت نہیں پڑتی۔

بجردھر اپنی تعریف سُن کر موقع و محل کو بھول جاتے تھے۔ دوچار بار تو نہیں نہیں کی۔ پھر دھرپد کی ایک گت چھیڑدی۔ آواز پھٹی ہوئی۔ سانس اُکھڑتی تھی۔ بار بار کھانس کر گلاصاف کرتے تھے۔ کبھی کبھی بے سُر سے بھی ہو جاتے تھے۔ مگر سازندے واہ واہ کی دھوم مچائے ہوئے تھے۔

منشی جی کو گانے کی دھن سوار ہوتی تھی۔ تو جب تک گلا نہ پڑ جائے۔ خاموش نہ ہوتے تھے۔ گت ختم ہوتے ہی آپ نے سور کا پد چھیڑ دیا اور دیش کی دُھن میں گانے لگے۔ بیچ بیچ میں بھاؤ بھی بتاتے جاتے تھے۔ چکردھر سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ ناحق اپنی ہنسی کرا رہے ہیں۔ اُس بے سُرے پن پر جسوا ننددن کتنا ہنس رہے ہوں گے۔ اٹھ کر گھر میں چلے گئے۔ مگر جسوانندن ہمہ تن گوش بنے ہوئے سن رہے تھے۔ جب گت ختم ہوا تو بولے۔

تحصیلدار صاحب آپ اس فن کے استاد ہیں۔

بجردھر۔ یہ آپ کی قدر دانی ہے۔ میں گانا کیا جانوں۔ ان لوگوں کی صحبت میں کچھ شدبُد آگیا۔

جھنکو۔ ایسا نہ کہیے حضور! ہم سب آپ کے شاگرد ہیں۔

جسودا۔ میرا تو جی چاہتا ہے۔ آپ کا شاگرد ہو جاؤں۔

بجردھر۔ کیا کہوں۔ آپ نے والد مرحوم کا گانا نہیں سنا۔ بڑا کمال تھا لاکھوں کی جائداد اسی کے پیچھے لٹادی۔ اب تو اس کا چرچا ہی اٹھتا جاتا ہے۔

جسودا۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ بھائی صاحب! آج کل کے نوجوانوں میں تو اس مذاق کا نام ہی نہ رہا۔ نہ گا سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔

جسودانندن کی باتوں سے معلوم ہوگیا کہ انھیں بھی اس فن میں دخل ہے۔ سبھی گانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ وکیل صاحب نے بھی عام رواج کے مطابق دوچار بار انکار کرنے کے بعد کافی کی دُھن میں ایک ٹھمری چھیڑدی۔ ان کا گلا صاف تھا۔ خوب مجاہوا۔ ایسی مست ہوکر گایا کہ سننے والے جھوم جھوم گئے۔ اس پرلطف یہ کہ ساتھ ساتھ ستار بھی بجاتے تھے۔ آس پاس کے لوگ آکر جمع ہوگئے۔ سماں بندھ گیا۔ چکردھر نے ان کی آواز سنی تو سمجھ گئے۔ یہ حضرت بھی اسی ٹکڑی کے لوگوں میں ہیں۔ جھیپ جاتی رہی۔ باہر آکر بیٹھ گئے۔

بجردھر نے کہا، بھائی صاحب! آپ نے تو کمال کردیا۔ آپ اس فن کے بادشاہ ہیں۔ کیسی رہی جھنکو؟

جھنکو۔ حضور کچھ نہ پوچھیے۔ سر دھن رہاہوں۔ آپ نے تو ہم لوگوں کا رنگ پھیکا کردیا۔ پرانے زمانے کے رئیسوں کی کیا باتیں ہیں۔

جسودا۔ کبھی کبھی جی بہلالیا کرتا ہوں۔ وہ بھی لک چھپ کر۔ لڑکے سنتے ہیں تو کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جس میں مذاق نہیں۔ وہ کسی صحبت میں بیٹھنے کے لائق نہیں۔ کیوں بابو چکردھر۔ آپ کو تو کچھ شوق ہوگا۔

بجردھر۔ کہاں کی بات بس اپنے صاحبزادوں کا حال سمجھیے۔

چکردھر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ میں گانے کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں! اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ شریف لوگ شریفوں کے ساتھ گائیں۔

جسودا۔ بیٹا! گینوں کی ذات پات نہیں دیکھی جاتی۔ ہم نے تو برسوں اندھے فقیر کی غلامی کی۔ تب جاکے ستار بجانا آیا۔

آدھی رات کے قریب گانا ختم ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد جب دونوں آدمی باہر آئے۔ تو بجردھر نے پوچھا۔ آپ سے کچھ بات چیت ہوئی؟۔

جسودا۔ مجھے توراضی معلوم ہوتے ہیں۔

بجردھر۔ نہیں جناب اسے راضی کرنا مشکل ہے۔ سینکڑوں آدمی آکر لوٹ گئے۔ کئی آدمی تو دس دس ہزار تک دینے کو تیار تھے۔ ایک صاحب تو اپنی ساری ریاست ہی لکھے دیتے تھے۔ لیکن اس نے حامی نہ بھری۔ دونوں آدمی سوئے۔ صبح کو جسودا نے چکردھر سے کہا۔ کیوں بیٹا! ایک دن کے لیے میرے ساتھ آگرے چلوگے۔

چکردھر نے کہا۔ میں تو ابھی جنجال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔

جسودا نندن نے بزرگانہ انداز سے کہا۔ میں جنجال میں نہیں پھنساتا تمھیں ایسا سچا رفیق، ایسا سچا مشیر دے رہا ہوں جو تمھارے مقصد حیات کو پورا کرنا اپنا خاص فرض سمجھے گی۔ میں اپنی غرض سے ایسا نہیں کہہ رہاہوں۔ میں خود آگرے کے ہندو سبھا کا سکریٹری ہوں اور قومی کام کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔ اگر میں سمجھتا کہ یہ شادی آپ کے کام میں رخنہ انداز ہوگی۔ تو ہر گز اصرار نہ کرتا۔

چکردھر بڑے شش وپنج میں پڑے۔ اصولاً تو وہ شادی کے معاملے میں عورتوں کو پوری آزادی دینے کے حامی تھے۔ پرڈر رہے تھے کہ کہیں اس حسینہ نے من پھیکا کرلیا تو مفت کی خفت ہوگی۔ بہت حیص بیض کے بعد بولے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں۔ میں ابھی.......

جسودانندن نے قطع کلام کرکے کہا۔ ان حیلوں سے میں آپ کا دامن چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ میں آپ کے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ مگر اطمینان رکھیے۔ اہلیا ان چنچل لڑکیوں میں نہیں ہے۔ جس کے سامنے جاکر آپ کو شرمانا پڑے۔ آپ اس کا بھولا پن دیکھ کر خوش ہوں گے۔ ہاں! میں آپ کی خاطر سے اتنا کرسکتا ہوں کہ آپ کو اپنا مہمان تلاؤں اور کہوں کہ آگرے کی سیر کرنے آئے ہیں۔

چکردھر نے پھر عذر کیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں کچھ دنوں بعد حاضر ہو جاؤں۔

جسودا نندن نے سرہلا کر کہا۔ نہیں میں اس کام میں توقف نہیں کرنا چاہتا مجھے تو اس میں بھی اعتراض نہیں ہے کہ اسے دوچار روز کے لیے یہاں لے آؤں مگر آپ کے گھر والے اسے پسند نہ کریں گے۔

اب چکر دھر کے عذر کی گنجائش نہ رہی۔ چلنے پر راضی ہوگئے تعلیم کے ساتھ رسوم کی قیدیں بھی ڈھیلی پڑجاتی ہیں۔ نرملا تو خوشی سے راضی ہوگئی۔ ہاں! منشی بجردھر کو کچھ تامل ہوا۔ مگر جسودانندن کے اصرار اور کسی بیش قرار رقم کے ملنے کی اُمید نے انھیں بھی نیم راضی کرلیا۔ اب صرف ٹھاکر ہری سیوک سنگھ سے رخصت لینی باقی تھی۔ چکردھریوں تیسرے پہر جایا کرتے تھے۔ پر آج نو بجے ہی جا پہنچے۔

ٹھاکر صاحب اپنی معشوقہ لونگی سے اس وقت کچھ باتیں کررہے تھے۔ منورما کی ماں اسے گود میں ہی چھوڑ کر مرچکی تھی۔ لونی اس وقت لونڈی تھی پر اس نے گھر کو اتنی خوبی سے سنبھالا کہ ٹھاکر صاحب اس پر ریجھ گئے اور گھر کے ساتھ اپنا دل بھی اسے سونپ دیا۔ نام اور صفت میں اتنا صریح اختلاف بہت کم ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے وہ اتنی دُبلی تھی کہ پھوک دو تو اڑجائے۔ پر زوجیت کا رتبہ پاتے ہی اس کی نزاکت فربہی کی جانب مائل ہوگئی۔ نہ آنکھوں کا پتہ تھا۔ نہ ناک کا نہ منہ کا۔ ہر ایک عضو پر فربہی مسلط تھی۔ پر باہر کی کرختگی متحمل مزاج عورت تھی۔ جو نوکروں کو تنخواہ نہ ملنے پر بھی غلام بنائے رکھتی تھی۔ غصہ، حسد، غرور اس سے چھو بھی نہ گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب اس پر بھی کبھی کبھی بگڑ جاتے تھے۔ دو ایک بار مارا بھی تھا۔ پر اس کے ماتھے پر بل نہ آتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کا سر بھی دکھے تو وہ بے تاب ہوجاتی تھی۔

اس وقت دونوں آدمیوں میں کوئی بحث چھڑی ہوئی تھی کہ منورما نے آکر کہا۔

بابو جی آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب کی بھویں تن گئیں۔ بولے۔ کہنا کیا چاہتے ہوں گے؟ روپے مانگنے آئے ہوں گے۔ اچھا جاکر کہہ دو۔ آتے ہیں۔ بیٹھیے!

لونگی نے سفارش کی۔ ان کے روپے دے کیوں نہیں دیتے۔ بیچارے شرم کے مارے مانگتے نہیں۔ کئی مہینے چڑھ گئے۔

ٹھاکر صاحب چڑھ کر بولے۔ یہ بھی تمھاری ہی حماقت تھی۔ جس کی بدولت

مجھے یہ تاوان اٹھانا پڑتا ہے۔ کہتا تھا۔ کوئی عیسائن رکھ لو۔ دس پانچ روپے میں کام چل جائے گا۔ تم نے کہا نہیں۔ کوئی لائق آدمی ہونا چاہیے۔ ان کے لائق ہونے میں شک نہیں۔ پر یہ تو بُرا معلوم ہوتا ہے کہ جب دیکھو روپے کے لیے سر پر سوار۔

لونگی۔ کوئی ایسی ضرورت ہی آپڑی ہوگی۔ تبھی آئے ہوں گے۔ ایک سو بیس روپے ہوئے نہ۔ میں لائے دیتی ہوں۔

ہاں!صندوق کھول کر تو لانا مشکل نہیں۔ درد تو اسے ہوتا ہے۔ جسے کنواں کھودنا پڑتا ہے۔

"وہی کنواں تو انھوں نے بھی کھودا ہے۔ مجھے تو بے چارے پر رحم آتا ہے"۔

یہ کہہ کر لونگی گئی اور روپے لاکر ٹھاکر صاحب سے بولی۔ لو دے آؤ۔ ٹھاکر صاحب نے اُسے قہر کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ لائیں بھی تو روپے کیا نوٹ نہ تھے؟

"جیسے نوٹ ویسے روپے۔ کیا اس میں بھی کوئی فرق ہے؟"

"اب تم سے کیا کہوں۔ اچھا رکھ دو۔ جاتا ہوں۔ پانی تو نہیں برس رہا ہے"۔

ٹھاکر صاحب آئے اور اس کے پہلے کہ چکردھر کچھ کہیں۔ روپے میز پر رکھ دیے۔ چکردھر نے خفیف ہوکر کہا۔ میں اس وقت اس کے لیے آپ کو تکلیف دینے نہ آیا تھا۔ مجھے ایک ضرورت سے آگرے جانا ہے۔ شاید دو تین دن لگیں۔ آپ کی اجازت چاہتا ہوں۔

ٹھاکر صاحب ان کی فرمانبرداری پر خوش ہوکر بولے۔ ہاں شوق سے جائیے۔ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔

جب ٹھاکر صاحب چلے گئے۔ تو منورما نے پوچھا۔ آپ آگرے کس لیے جارہے ہیں؟

"ایک ضرورت سے جارہا ہوں"۔

"کوئی بیمار ہے کیا"؟

"نہیں بیمار تو کوئی نہیں"۔

"پھر کیا کام ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں"؟

"لوٹ کر بتادوں گا"۔

"جی نہیں۔ میں یہ نہیں مانتی۔ ابھی بتلائیے"۔

"ایک دوست سے ملنے جاتا ہوں"۔

"آپ مسکرا رہے ہیں۔ میں سمجھ گئی۔ نوکری کی تلاش میں جاتے ہیں"۔

"نہیں منورما! یہ بات نہیں۔ نوکری تو میں کرنا ہی نہیں چاہتا"۔

"تو کیا ہمیشہ یوں ہی رہیں گے"؟

"ارادہ تو ایسا ہی ہے۔ آیندہ جیسی ایشور کی مرضی"۔

"آپ روپے کہاں سے لائیں گے"؟

"بھیک مانگوں گا۔ کار خیر کے لیے بھیک مانگنا معاف ہے"۔

"تو آج کل بھی آپ بھیک مانگتے ہوں گے"۔

"ہاں! مانگتا کیوں نہیں۔ نہ مانگوں تو کام کیسے چلے"؟

منورما مسکرا کر بولی۔ "مجھ سے تو آپ نے کبھی نہیں مانگا"۔

"تمھارے اوپر تو بھروسہ ہے کہ جب مانگوں گا۔ دے دوں گی۔ اس لیے جب کوئی خاص ضرورت آئے گی تب مانگوں گا"۔

"اور جو اس وقت میرے پاس روپے نہ ہوئے"؟

"تو پھر کبھی مانگوں گا"۔

تو آپ مجھ سے ابھی مانگ لیجیے۔ ابھی میرے پاس روپے ہیں۔ دے دوں گی۔ پھر آپ نہ جانے کس وقت مانگ بیٹھیں"۔

یہ کہہ کر منورما اندر گئی، اور کل والے ایک سو بیس روپے لاکر چکردھر کے آگے رکھ دیے۔

چکردھر نے پوچھا۔ تم نے ٹھاکر صاحب سے پوچھ لیا ہے!

"ان سے کیوں پوچھوں۔ روپے میرے ہیں۔ ان کے نہیں"۔

چکردھر نے معذوری کے انداز سے کہا۔ تو پھر میں تمھارے روپے نہ لوں گا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ میں نے تم سے روپے پھسلاکر لے لیے۔ تمھیں سوچو، ہوسکتا ہے یا نہیں؟

منورما نے لاجواب ہوکر کہا۔ اچھا آپ امانت سمجھ کر رکھ لیجیے!

دفعتاً سامنے سے مشکی گھوڑوں کی ایک فٹن جاتی ہوئی دکھائی دی۔ گھوڑوں کے سازوں پر گنگا جمنی کام کیاہوا تھا۔ چار سوار بھالے اٹھائے پیچھے دوڑے چلے آتے تھے۔

چکردھر بولے۔ کوئی رانی معلوم ہوتی ہیں۔

منورما نے جواب دیا۔ جگدیش پور کی مہارانی ہیں۔ جب ان کے پاس جاتی ہوں تو مجھے ایک گنی دیتی ہیں۔ یہ آٹھویں گنیاں انھیں کی دی ہوئی ہیں۔ میں نے انھیں بھنا کر روپے کر لیے۔

"ان کی کوٹھی درگاکنڈ کی طرف ہے نا۔ میں ایک دن ان کے پاس چندہ مانگنے جاؤں گا"۔

"میں جگدیش پور کی رانی ہوتی۔ تو آپ کو بغیر مانگے بہت سے روپے دے دیتی"۔

چکردھر نے مسکراکر کہا۔ "تب بھول جاتیں"۔

"جی نہیں۔ میں کبھی نہ بھولتی"۔

"اچھا کبھی یاد دلاؤں گا۔ اس وقت یہ روپے اپنے ہی پاس رہنے دو"۔

منورما نے خودداری کے ساتھ کہا۔ آپ کو انھیں لینے میں تامل کیا ہوتا ہے۔ روپے میرے ہیں۔ مہارانی نے مجھے دیے ہیں۔ میں انھیں پانی میں ڈال سکتی ہوں کسی کو مجھے روکنے کا حق نہیں۔ آپ نہ لیں گے تو میں آج ہی جاکر گنگا میں پھینک آؤں گی۔

چکردھر نے مجبور ہوکر کہا۔ تم اتنی ضد کرتی ہو تو میں لیے لیتا ہوں۔ ہاں امانت سمجھوں گا۔

منورما خوش ہوکر بولی۔ ہاں امانت ہی سمجھیے گا!

"تو چلا میں۔ کتاب دیکھتی رہنا"۔

"آپ اگر مجھ سے بغیر بتائے چلے جائیں گے تو میں کچھ نہ پڑھوں گی"۔

"یہ تو بڑی ٹیڑھی شرط ہے۔ بتلاہی دوں اچھا۔ ہنسنا مت۔ تم ذرا بھی مسکرائیں اور میں چلا"۔

"میں دونوں ہاتھوں سے منہ بند کیے لیتی ہوں"۔

چکردھر نے شرم گیں ہو کر کہا۔ میری شادی کی کچھ بات چیت ہے۔

چکردھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ منورما بھی ان کے ساتھ ساتھ آئی۔ جب وہ برآمدے سے نیچے اترے تو وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور بار بار رونا آتا تھا۔ گویا چکردھر سے ہمیشہ کے لیے جدائی ہورہی ہو۔

(5)

شام کے وقت جب ریل گاڑی بنارس سے چلی تو جسودانندن نے چکردھر سے پوچھا۔ کیوں بیٹا! تمھاری رائے میں جھوٹ بولنا کسی حالت میں معافی کے قابل ہے یا نہیں؟

چکر دھر نے حیرت میں آکر کہا میں تو سمجھتا ہوں نہیں۔ حالانکہ کچھ لوگ کسی کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا معافی کے قابل سمجھتے ہیں۔

جسودا۔ میں بھی انھیں لوگوں میں ہوں۔ میں نے اہلیا کے متعلق آپ سے کئی جھوٹی باتیں کہی ہیں۔ دراصل وہ میری لڑکی نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ کا ہمیں کچھ بھی پتہ نہیں!

چکردھر نے آنکھیں پھاڑ کر کے کہا۔ تو وہ آپ کے یہاں کیسے آئی؟

جسودا نندن نے کہا۔ لمبی داستان ہے۔ پندرہ سال ہوئے۔ ایک بار سورج گرہن لگا تھا۔ آگرے میں ہماری ایک سیوا سمتی تھی۔ ہم لوگ جاتریوں کی خدمت کرنے کے لیے پریاگ آئے تھے۔ تم تو اس وقت بہت چھوٹے سے رہے ہوگے۔ اتنا شاندار میلہ پھر نہیں لگا۔ اسی میلے میں ہمیں یہ لڑکی کھوئی ہوئی ملی۔ پیدائش سے نہ ہو۔ پردھرم سے وہ میری لڑکی ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ جو فیصلہ چاہے کریں۔ آپ کے مضامین رسالوں میں دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی جانب سے تو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ رہے آپ کے والد صاحب انھیں راضی کرلینے کا میرا ذمہ!

چکردھر کے دل میں حق وباطل کا مناظرہ ہونے لگا۔ باطل نے کہا۔ جگ ہنسائی ہوگی۔ حق نے کہا۔ اصول کو رسوائی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ باطل نے فلسفہ کی آڑ لی۔ کیا معلوم کس کی لڑکی ہے۔ اس کے والدین کس قماش کے لوگ تھے۔ خون کا اثر

کبھی زائل نہیں ہوتا۔ حق نے کہا۔ صحبت اور تعلیم کا اثر بھی تو اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے۔ آخر حق نے فتح پائی۔ بولے۔ میری طرف سے آپ اطمینان رکھیں۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔ ماں باپ کی اطاعت لازمی ہے۔ پر فرض اور حق کا خون کرکے نہیں۔ فرض کے سامنے والدین کی مرضی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

جسوداننددن نے چکردھر کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ایشور تمھاری عمر دراز کرے مجھے تم سے یہی امید تھی۔

گاڑی آگرے پہنچی تو دن نکل آیا تھا۔ سنہرا شہر ہری ہری کنجوں کے بیچ میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بچہ ماں کی گود میں سویا ہو۔ جسودا نندن بھی قلیوں کو پکار ہی رہے تھے کہ ان کی نگاہ پولیس کے سپاہیوں پر پڑی۔ چاروں طرف پہرہ تھا۔ مسافروں کے بسترے اور صندوقیں کھول کر دیکھے جانے لگے۔ ایک تھانہ دار نے جسوداننددن کا اسباب بھی دیکھناشروع کیا۔

جسودا نندن نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں صاحب! آج یہ سختی کیوں ہے؟

تھانہ دار نے جواب دیا۔ شہر میں ایک ہنگامہ ہوگیا ہے۔

معلوم ہوا کہ کل کسی مولوی صاحب نے پنجاب سے آکر مسلمانوں کے مجمع میں ایک تقریر کی تھی۔ اس وقت سے مسلمانوں کو قربانی کی دھن سوار ہے۔ ادھر ہندوؤں کو بھی یہ ضد ہے۔ چاہے خون کی ندی بہ جائے۔ پر قربانی نہ ہونے پائے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خواجہ محمود اس جلسے کے صدر تھے۔

جسوداننددن کو گولی سی لگی۔ جس آدمی کو آج ۲۵ سالوں سے دیکھتا آتا ہوں۔ جسے کبھی تعصب کی ہوا بھی نہیں لگی۔ جو ایک زمانہ میں سیوا سمتی کا ممبر تھا۔ کیا وہ آج قربانی پر آمادہ ہوجائے گا۔ غیر ممکن! انھوں نے محمود سے ملنے کا ارادہ کرلیا۔ اس وقت تک تانگہ خواجہ محمود کے مکان تک آپہنچا۔ ہزاروں آدمیوں کا اژدہام تھا۔ اگرچہ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی یا ڈنڈے نہ تھے۔ مگر سب کے چہرے جہاد کے نور سے سرخ ہورہے تھے۔ جسودانند کو دیکھتے ہی کئی آدمی ان کی طرف لپکے اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ جسودا نندن ہیں تو لوگوں نے خواجہ محمود کو بلایا۔ اور ذرا دیر میں ایک لانبا سا آدمی گاڑھے کی اچکن پہنے آکر کھڑا ہوگیا۔ بھرا ہوا

بدن تھا۔ گورا رنگ لمبی داڑھی چہرے سے شرافت اور متانت جھلک رہی تھی۔

جسودا نندن نے لہجہ کو نرم بنانے کی کوشش کرکے کہا۔ کیوں خواجہ صاحب آپ کو خوب معلوم ہے کہ اس محلے میں کبھی قربانی نہیں ہوئی۔ آپ یہ نئی رسم کیوں نکال رہے ہیں؟

خواجہ محمود نے متانت کے ساتھ کہا۔ اس لیے کہ قربانی کرنا ہمارا حق ہے۔ جب تک آپ ہمارے جذبات کا لحاظ کرتے تھے۔ ہم بھی آپ کے جذبات کا لحاظ کرتے تھے۔ جب آپ نے ہمارے جذبات کا لحاظ کرنا چھوڑ دیا۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم آپ کے جذبات کی قدر کریں!

جسودانندن نے پوچھا۔ آپ ایسی کوئی مثال دے سکتے ہیں؟

خواجہ محمود نے جواب دیا۔ بے شک۔ مثلاً مسلمانوں کے شدھی کرنے کا آپ کو پورا حق حاصل ہے۔ لیکن کم سے کم پانچ سو برسوں سے آپ نے اس حق کا استعمال نہیں کیا۔ اب آپ لوگوں نے ایک مردہ حق کو زندہ کیا ہے۔ اگر ہم بھی آپ کی پیروی کریں۔ تو آپ کو ناگوار نہ ہونا چاہیے۔

جسودا۔ آپ نے بھی تو تبلیغ جاری کی۔

محمود۔ ہم نے اسے مردہ کب ہونے دیا تھا؟

جسودا۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کل آپ ہمارے دروازوں پر یا مندروں میں قربانی کریں اور ہم خاموش رہیں۔ آپ یہاں ہرگز قربانی نہیں کرسکتے، اور کی، تو اس کی ذمہ داری آپ کے سر ہوگی۔

یہ کہہ کر جسودانندن پھر تانگے پر جابیٹھے اور تھوڑی دیر میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ وہاں بھی ہزاروں آدمی جمع تھے۔ انھیں دیکھتے ہی چاروں طرف ہل چل مچ گئی!

جسودانندن تانگے سے اُتر پڑے اور للکار کر بولے۔ کیوں بھائیو! اب کیا ارادے ہیں۔ وہ لوگ قربانی پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ اس محلے میں کبھی قربانی نہیں ہوئی۔

کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔ یہاں قربانی ہرگز نہیں ہوسکتی۔

جسودا۔ ”اور وہ نہ مانیں تو“۔

کئی آوازیں آئیں۔ خون کی ندی بہ جائے گی۔
ادھر اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔ ادھر مہابیر اور سری رام چندر کی جے کار ہوئی۔
قریب تھا کہ دونوں جماعتوں میں آویزش ہوجائے کہ یکایک چکردھر آگے بڑھ کر بولے۔ آپ لوگ وہاں جاکر کیا کریں گے؟
جسودا۔ وہی کریں گے جو ہمیں کرنا چاہیے۔ ہم جیتے جی اپنے دھرم کا خون آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔
چکردھر۔ یہ موقع بہت ضبط سے کام لینے کا ہے۔
اس پر کئی آوازیں بول اُٹھیں۔ ضبط سے کام لینا بے غیرتوں کا کام ہے۔
ایک سکھ نے کہا۔ جب ڈنڈے سے کام لینے کا موقعہ ہو تو ضبط کو بند کر کے رکھ دینا چاہیے!
چکردھر۔ میں چاہتاہوں کہ ایک بار مجھے اُن لوگوں سے کچھ باتیں کرنے کا موقعہ دیجیے۔ اگر پھر بھی وہ لوگ باز نہ آئیں تو آپ کو اختیار ہوگا۔ جو چاہے کریں۔
میں التماس کروں گا کہ میری واپسی تک آپ لوگ کامل ضبط اور تحمل کے ساتھ یہیں کھڑے رہیں!
یہ کہہ کر چکردھر تنہا مسلم جماعت کے روبرو جا پہنچے۔ اور بلند آواز سے بولے حضرات! میں آپ لوگوں سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اگر اس گائے کی قربانی کرنا آپ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ تو شوق سے کیجیے۔ لیکن کیا لازمی ہے کہ اس جگہ کی جائے؟۔
ایک مولوی صاحب نے تند لہجہ میں کہا۔ یہ ہماری خوشی ہے۔ تمھیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔
چکردھر۔ بے شک مجھے بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لیکن اسلام کی جو عزت میرے دل میں ہے وہ مجھے بولنے کے لیے مجبور کررہی ہے۔ اسلام نے کبھی دوسرے مذاہب کی دل آزاری نہیں کی۔ بغداد اور روم، قرطبیہ اور مصر کی تاریخیں اسلام کی مذہبی رواداری کی شاہد ہیں۔ اگر آپ ہندو جذبات کا لحاظ کرکے کسی دوسری جگہ قربانی کرلیں۔ تو یقیناً اسلام کے وقار میں فرق نہ آئے گا۔

مولوی صاحب نے اور تیز ہوکر کہا۔ ایسی میٹھی میٹھی باتیں ہم نے بہت سنی ہوئی ہیں۔ قربانی یہیں ہوگی اور اسی وقت ہوگی۔

خواجہ محمود بڑے غور سے چکردھر کی باتیں سن رہے تھے۔ مولوی صاحب کی بددماغی پر ترش ہوکر بولے۔ کیا شریعت کا حکم ہے کہ قربانی یہیں ہو؟۔

مولوی صاحب نے خواجہ محمود کی طرف بدگمان آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ شریعت کے معاملات میں علماء کے سوا اور کسی کو دخل دینے کا مجاز نہیں ہے۔

ایک موٹے تازے دڑھیل آدمی نے کہا۔ جناب! آپ بسم اللہ کیجیے۔ دھمکیوں کے سامنے مصالحت نہیں ہوتی۔

چھرا دیکھتے ہی گائے کی بوٹیاں کانپنے لگیں۔ اس وقت چکردھر فدایانہ سرفروشی کے ساتھ اچھل کر گائے کے سامنے آگئے اور اس کی گردن پکڑتے ہوئے بولے۔ تو آج آپ کو اس گائے کے ساتھ ایک انسان کی بھی قربانی کرنی پڑے گی۔

دو تین آدمیوں نے چکردھر کو وہاں سے ہٹا دینا چاہا پر انھوں نے گائے کی گردن نہ چھوڑی۔ ان کے چہرے پر عزم صادق نور بن کر چمک رہا تھا۔ جس نے قصاب کے ہاتھ میں لرزہ پیدا کردیا۔

دفعتاً خواجہ محمود بولے۔ کیوں بھائی نوجوان تمھارا گھر کہاں ہے؟

چکر دھر نے کہا۔ پردیسی مسافروں ہوں۔

خواجہ۔ خدا کی قسم تم جیسا دلیر آدمی نہیں دیکھا۔ میں تمھیں یقین دلاتاہوں کہ یہاں قربانی نہ ہوگی۔ مگر ایک التماس یہ ہے کہ ذرا منشی جسودانندن کو سمجھا دیجیے گا کہ مذہبی معاملات میں تحمل سے کام لیاکریں۔ وہ میرے لنگوٹیے یار ہیں۔ مگر بدقسمتی سے عمر کے ساتھ ساتھ ان پر سوادویت غالب آتی جاتی ہے۔

چکر دھر بولے۔ ممکن ہے۔ آپ کی نسبت ان کا بھی یہی خیال ہو۔

خواجہ۔ وہ تو شاید مجھے انسان ہی نہ سمجھتے ہوں۔ آپ ٹھہرے کہاں ہیں۔ آپ سے اطمینان کے ساتھ ملنے کو جی چاہتا ہے۔

چکردھر۔ میں خود حاضر ہوجاؤں گا۔

خواجہ صاحب کی پاک نفسی اور شرافت نے انھیں اپنی قوم کا پیشوا بنادیا تھا۔

ان کے فیصلے کو رد کرنا ملاؤں کے حکم کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پر ان کے مقابلے میں مصلحت پسندوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ مجمع رفتہ رفتہ منتشر ہونے لگا۔

چکردھر کو آتے دیکھ کر جسوادانندن اپنے کمرے سے نکل آئے اور سینے سے لگا کر بولے۔ بیٹا! آج تمھارا ضبط اور استقلال دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ تم نے آج ہماری لاج رکھ لی۔

منت سماجت کرنے کے بھی کتنے ہی طریقے ہیں۔ منت تو ہم نے سینکڑوں ہی بار کی۔ لیکن ہر دفعہ گتھی اور ہی اُلجھتی گئی۔

جسوادانندن کی اہلیہ کا نام باگیشوری تھا۔ وہ اہلیہ کے ساتھ چھت پر کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ چکردھر جیوں ہی کمرے میں آئے۔ دونوں کوٹھے سے اُتر آئیں۔ اہلیہ تو پیچھے رہ گئی۔ باگیشوری نے کمرے میں آکر کہا۔ بیٹا! آج تم نے ہم لوگوں کی لاج رکھ لی۔ کیا یہیں مکان ہے؟

جسوادانندن نے کہا۔ نہیں پریاگ کے رہنے والے ہیں۔ مجھ سے راستے میں ملاقات ہوگئی۔ منصوری سیر کرنے جارہے ہیں۔

"تو آج تو رہوگے بیٹا! آگرے میں بھی تو دیکھنے کی بہت چیزیں ہیں"۔

جب تم مسلمانوں کے سامنے کھڑے تھے۔ تو میری چھاتی دھڑک رہی تھی کہ کہیں سب کے سب تم پر ٹوٹ نہ پڑیں۔

جسوادانندن نے اہلیا سے کہا۔ پیچھے کیوں کھڑی ہے۔ اہلیا آکر درشن کرلے۔ ایسے ہمت کے دھنی نوجوان کہاں ملتے ہیں۔

اہلیا نے دو قدم اور آگے بڑھ کر چکردھر کو پرنام کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

چکردھر نے اُڑتی ہوئی نگاہوں سے اہلیا کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا آنکھوں کی روشنی تیز ہوگئی ہے۔ گویا ان کی زندگی کا سنہرا خواب آنکھوں میں پھر گیا ہو۔

باگیشوری نے کہا۔ جب تم مسلمانوں کے سامنے اکیلے کھڑے تھے۔ تو یہ ایشور سے تمھاری جان کی خیر منا رہی تھی۔ جانے کتنی منوتیاں کرڈالیں۔

جسوادانند نے تخلیہ میں باگیشوری کو چکردھر کے آنے کا منشا بتلادیا باگیشوری باغ

باغ باغ ہوگئی۔

رات کو جب باگیشوری اور اہلیا چھت پر لیٹیں تو باگیشوری نے پوچھا۔ کیوں اہلیا سوگئی کیا؟ مہمان سے تیری شادی کی بات چیت ہورہی ہے۔

اہلیا۔ اماں! مجھے گالیاں دوگی تو میں نیچے جاکر لیٹوں گی۔ چاہے مچھر نوچ ہی کیوں نہ ڈالیں۔

باگیشوری۔ تو میں کون سی گالی دے رہی ہوں۔ ایسا اچھا بَر تجھے کہاں اور کون ملے گا۔

اہلیا۔ تم نہ مانوگی! تو میں جاتی ہوں۔

باگیشوری۔ دل لگی نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر تیری مرضی ہو تو کہہ دے۔ اپنی ہی برادری کے ہیں۔ تمھارے بابو جی انھیں کاشی سے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ دولت تو ان کے پاس نہیں ہے۔ لیکن دل ضرور ہے۔ اور ایسا دل جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔

اہلیا نے ڈرتے پوچھا۔ کیا انھیں ساری باتیں معلوم ہیں؟

باگیشوری۔ تمھارے بابو جی نے سارا ماجرا بیان کردیا ہے۔

اہلیا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔

باگشوری۔ ٹالو مت۔ دل کی بات صاف صاف کہہ دو۔

اہلیا۔ تم میرے دل کا حال مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔

باگیشوری۔ مالدار نہیں ہیں یاد رکھنا۔

اہلیا۔ میں تو دولت کی لونڈی کبھی نہیں رہی۔

باگیشوری۔ کل ان کی دعوت کرنی ہوگی۔ ان کا امتحان تو ہوگیا ہے۔ اب تیرا امتحان ہوگا۔

اہلیا نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے باگیشوری کو دیکھا۔ پر منہ سے کچھ نہ بولی۔ تشکر لفظوں میں آکر رسم ہوجاتا ہے۔ اس کی حقیقی صورت وہی ہے جو آنکھوں سے باہر نکلتے ہوئے کانپتی اور لجاتی ہے۔

(6)

چکردھر کی شہرت ان سے پہلے ہی بنارس پہنچ چکی تھی۔ احباب ملنے کے لیے بے قرار ہورہے تھے۔ جب وہ پانچویں دن گھر پہنچے۔ تو اسٹیشن پر عقیدت مندوں کا ایک انبوہ کھڑا تھا۔ کئی دن تک اس کی چرچا رہی۔ اگرچہ چکردھر منکسر واقع ہوئے تھے۔ پر اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد کے متعلق کوئی غلطی ہوتی تو فوراً اسے صحیح کردیتے تھے۔ ایک ہزار! اجی پورے پانچ ہزار آدمی تھے اور سبھی کی تیوریاں چڑھی ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کھڑا نگل جائیں گے۔ جان پر کھیل گیا تھا اور کیا کہوں۔

اور لوگ تو تعریفیں کررہے تھے پر منشی بجردھران کی نادانی پر افسوس کرتے تھے۔ تمھارے ہی سر پر بھوت کیوں سوار ہوجاتا ہے۔ تمھیں کو اپنی جان کیوں بھاری پڑی ہے۔ مان لو مسلمان طیش میں آجاتے تو کیا نتیجہ ہوتا۔ پھر تو کوئی پاس نہ پھٹکتا۔

شام کو چکردھر منورما کے گھر گئے۔ وہ باغیچہ میں دوڑ دوڑ کر ہزارے سے پودوں کو سینچ رہی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی ہزارہ پھینک کر دوڑی اور پاس آکر بولی۔ آپ کب آئے بابو جی؟ میں اخباروں میں روز وہاں کا حال دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ آپ آئیں گے تو آپ کی پوجا کروں گی۔ آپ نہ ہوتے تو وہاں ضرور فساد ہوجاتا۔ آپ کو اتنے آدمیوں کے سامنے اکیلے جاتے ہوئے ذرا بھی خوف نہ ہوا۔

چکردھر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مطلق نہیں۔ مجھے تو یہی دُھن تھی کہ اس وقت قربانی ہونے نہ دوں گا۔ اب سوچتا ہوں۔ تو تعجب ہوتا ہے کہ مجھ میں اتنی قوت اور ہمت کہاں سے آگئی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ مسلمانوں کو لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ ان کو یہ دہشت ہوگئی ہے کہ ہندو ان سے پُرانا بیر چکانا چاہتے ہیں اور ان کی ہستی کو مٹادینے کی فکر کررہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ذرا ذرا سی بات پر تنک اُٹھتے ہیں۔

منورما۔ وہ خبر دیکھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آپ کو اپنی جان کی ذرا بھی محبت نہیں ہے۔

چکردھر نے مسکرا کر کہا۔ جان اور ہے ہی کس کے لیے۔ پیٹ پالنے ہی کے لیے ہم آدمی نہیں بنائے گئے ہیں۔ ہماری زندگی کا نصب العین کچھ تو اونچا ہونا چاہیے۔ خاص کر ان لوگوں کا جو مہذب کہلاتے ہیں۔ ظاہری نمائش تو تہذیب نہیں۔

منورما ایک لمحہ تک زمین کی طرف تاکتی رہی۔ پھریکایک بولی۔ اچھا اس وقت اگر آپ کو پانچ ہزار روپے مل جائیں تو آپ لیں یا نہ لیں۔

چکردھر نے ہنس کر کہا کہہ نہیں سکتا۔ اس وقت دل کی کیا حالت ہو۔ پر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسے عیش وآرام میں نہ اڑاؤں گا۔ دولت سے مجھے نفرت نہیں خوف ہے۔ دوسروں کا محتاج بننا تو شرم کی بات ہے لیکن اپنی روش اتنی سادہ رکھنا چاہتا ہوں کہ ساری قوت محض دولت کمانے اور فرضی ضرورتوں کو پورا کرنے میں صرف نہ ہو۔

منورما بولی۔ دولت کے بغیر ثواب بھی تو نہیں ہو سکتا۔

چکردھر۔ میں ثواب کے لیے سادگی کی زندگی نہیں چاہتا۔ بلکہ اپنے نفس کی اصلاح کے لیے مجھے اپنے اوپر اتنا بھروسہ نہیں ہے کہ دولت پاکر بھی نفس کا غلام نہ بن جاؤں۔ اس لیے میں اُس سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔

منورما پھر خاموش ہوگئی۔ اس کے دل میں ایک بات پوچھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ مگر لحاظ مانع ہوتا تھا۔ چکردھر نے اس کی منتظر صورت دیکھ کر کہا۔ کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ منورما کوئی نئی بات ہے؟

منورما شرماتی ہوئی بولی۔ آپ ناراض نہ ہوں تو پوچھوں۔ آپ سے بہو نے کیا باتیں کیں (مسکراکر) میں تو سمجھتی ہوں کہ آپ اور وہ دونوں لجاتے بیٹھے ہوں گے۔

چکردھر نے ہنس کر کہا۔ ہاں منورما! ہوا تو ایسا ہی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کہوں۔

دفعتاً اندر سے کسی کی کرخت آواز کانوں میں آئی۔ منورما کی تیوریاں پر بل پڑ گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بولی۔ شاید بھائی صاحب آگئے نہ جانے ان کی کیسی عادت ہے کہ جب آتے ہیں تو لونگی اماں سے جھوٹ موٹ تکرار کرنے لگتے ہیں۔ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ پر شرافت کا نام نہیں۔

اتنے میں گرسیوک سنگھ لال لال آنکھیں کیے اندر سے نکل آئے۔ اور اسی کرخت لہجہ میں منورما سے بولے۔ بابو جی کہاں گئے ہیں۔ تجھے معلوم ہے؟ میں آج فیصلہ کرلینا چاہتاہوں۔

گرسیوک کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لانبے چھریرے شکیل آدمی تھے۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ بدن پر تن زیب کا کرتہ چہرے سے نخوت جھلک رہی تھی۔ چکردھر کو بیٹھے دیکھ کر کچھ جھجکے۔ اور اندر لوٹنا چاہتے تھے کہ لونگی روتی ہوئی آکر چکردھر کے پاس کھڑی ہوگئی اور بولی۔ بابوجی انھیں سمجھایئے کہ میں بڑھاپے میں کہاں جاؤں اتنی عمر تو اس گھر میں کٹی۔ اب کس کے دروازے پر ہاتھ پھیلاؤں۔ بابو جی سچ کہتی ہوں۔ میں نے انھیں دودھ پلاکر پالا ہے۔

گرسیوک سنگھ کی خواہش تو نہ تھی کہ چکردھر سے اس نزاع کے متعلق کچھ کہیں لیکن جب لونگی نے انھیں پنچ بنانے میں تامل نہ کیا تو وہ بھی کھل پڑے۔ جناب اس سے یہ پوچھیے کہ اب یہ بڑھیا ہوئی۔ مرنے کے دن آئے۔ کیوں نہیں کسی تیرتھ استھان میں جاکر اپنی شرمناک زندگی کے بچے ہوئے دن کاٹتی۔ میں نے دادا سے کہا تھا کہ اسے برندا بن پہنچا دیجیے اور وہ راضی بھی تھے۔ پر اس نے سینکڑوں بہانے کیے اور وہاں نہ گئی۔ آپ سے تو اب کوئی پردہ نہیں ہے۔ اس کے کارن میں نے یہاں رہنا چھوڑدیا۔ اس کے ساتھ اس گھر میں رہتے ہوئے ہم کسی بھلے آدمی کے دروازے پر جاسکتے ہیں۔ آج تہیہ کرکے آیا ہوں کہ اسے گھر سے نکال کر ہی چھوڑوں گا۔

لونگی نے خودداری کی شان سے سر اٹھا کر کہا۔ تو بچہ سنو! جب تک مالک جیتا ہے۔ لونگی اس گھر میں رہے گی۔ جب وہ نہ رہے گا تو جو کچھ سر پر پڑے گا۔ جھیل لوں گی۔ جو تم یہ چاہو کہ لونگی گلی گلی ٹھوکر کھاتی پھرے تو یہ نہ ہوگا میں لونڈی نہیں ہوں۔ جو گھر سے باہر جاکر رہوں۔ تمھیں مجھے کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔ چار بھانوریں پھر جانے سے ہی بیاہ نہیں ہوجاتا۔ میں نے اپنے مالک کی جتنی خدمت کی ہے اور کرنے کو تیار ہوں اتنی کون بیاہتا کرے گی۔ لائے تو ہوبہو کبھی اُٹھ کر ایک لوٹیا پانی دیتی ہے۔ نام سے کوئی بیاہتا نہیں ہوتی۔ سیوا اور پریم سے ہوتی ہے۔

گرسیوک۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تجھے باتیں بہت بنانی آتی ہیں۔ پر اپنے منہ سے جو

چاہے بن میں تو تجھے لونڈی ہی سمجھتا ہوں۔

لونگی۔ تمھارے سمجھنے سے کیاہوتا ہے۔ ابھی تو میرا مالک ہی جیتا ہے۔ بھگوان اسے امر کریں۔ جب تک جیتی ہوں۔ اسی طرح رہوں گی۔ چاہے تمھیں بھلا لگے یا برا۔ جس نے جوانی میں بانہہ پکڑی کیا وہ اب چھوڑ دے گا۔ بھگوان کو کون منہ دکھائے گا؟

یہ کہتی ہوئی لونگی گھر میں چلی گئی۔ منورما چپ چاپ سر جھکائے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے لونگی سے سچی محبت تھی۔ ماں کے پیار کا جو کچھ سکھ اسے ملا وہ لونگی ہی سے ملا تھا۔ اس کی ماں اسے گود میں چھوڑ کر سدھاری تھی اس احسان کو وہ کبھی بھول نہ سکتی تھی۔

لونگی کے جاتے ہی گرسیوک سنگھ ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور چکردھر سے بولے۔ جناب آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ آپ نے آگرے کے مسئلے کو جس خوبصورتی سے حل کیا۔ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

چکردھر۔ وہ تو میرا فرض ہی تھا۔

گرسیوک۔ مجھے بھی کچھ اسی طرح کا خبط ہے۔ اپنے علاقہ میں کچھ لڑکوں کا کھیل سا کر رکھا ہے۔ وہاں پٹھانوں کے بڑے بڑے گاؤں ہیں۔ انھیں سے ملے ہوئے ٹھاکروں کے بھی کئی گاؤں ہیں۔ پہلے پٹھانوں اور ٹھاکروں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ لیکن اب کوئی ایسی تقریب نہیں ہوتی جس میں کچھ فتنہ وفساد نہ ہو۔ آپ اگر ایک دو دن کے لیے وہاں چلے چلیں تو آپس میں بہت کچھ صفائی ہوجائے۔ آپ کو سمجھانے کا بہت اثر ہوگا۔

چکردھر۔ اثر پیدا کرنا تو ایشور کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہاں! میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ مجھ سے جو خدمت ہوسکے گی۔ اس میں دریغ نہ کروں گا۔ کب چلنے کا ارادہ ہے؟

گرسیوک۔ چلنا تو اس گاڑی سے ہے لیکن میں اس قحبہ کو اب کے نکال باہر کیے بغیر جانا نہیں چاہتا۔ اگر دادا نے مزاحمت کی تو منورما کو لیتا جاؤں گا۔ اور پھر اس گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ سوچیے کتنی بڑی بدنامی ہے۔

چکردھر۔ معاف کیجیے گا۔ اس معاملے میں میرا آپ سے اختلاف ہے۔ میں بدنامی کے خوف سے بے انصافی کرنی روا نہیں سمجھتا۔

گرسیوک۔ بے انصافی کرنا میرا بھی شعار نہیں۔ میں خود نہیں چاہتا کے میرے ہاتھوں کسی کا خون ہو۔ اگر آپ مجھے سمجھا دیں کہ اس کا یہاں رہنا مناسب ہے۔ تو میں آپ کا مشکور رہوں گا۔

چکردھر نے کچھ پس وپیش کرتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں جب کسی مرد کا ایک عورت سے میاں بیوی کا تعلق ہوجائے تو مرد کا فرض ہے کہ جب تک عورت کی طرف سے کوئی صریح بے عنوانی نہ دیکھے۔ اس تعلق کو بنا ہے۔

"چاہے عورت کتنی ہی نیچ ذات کی ہو؟"

"بے شک"!

منورما یہ جواب سن کر ایسی خوش ہوئی۔ گویا اس کے سر پر سے کوئی بڑا بھاری بوجھ اُٹھ گیا ہو۔ گرسیوک وہاں نہ ہوتے تو ضرر کہہ اٹھتی۔ آپ میرے منہ سے بات لے گئے۔

دفعتاً ایک فٹن آئی اور ٹھاکر صاحب اتر کر اندر گئے۔ گرسیوک بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے کہ لونگی کہیں موقعہ پاکر ان کے کان نہ بھردے۔

جب وہ چلے گئے تو منورما بولی۔ آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ بہت سی باتوں میں میرے اور آپ کے خیالات ملتے ہیں۔

چکردھر۔ انھیں برا تو ضرور لگا ہوگا۔

وہ پھر آپ سے بحث کرنے آتے ہوں گے۔ اب کے شاستروں کے حوالے دیں گے۔ دیکھ لیجیے گا۔

"خیر! یہ بتاؤ۔ تم نے ان چارپانچ دنوں میں کون ساکام کیا"؟

"میں نے تو کتاب تک نہیں کھولی۔ آپ نہیں ہوتے تو میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ میں آپ کو اب کبھی باہر نہ جانے دوں گی"۔

چکردھر نے منورما کی طرف دیکھا۔ تو اس کی آنکھیں پُر آب ہوگئی تھیں۔ سوچے۔ لڑکی کتنی بھولی بھالی، کتنی شریف، کتنی روشن خیال اور کتنی ذی احساس ہے۔

(7)

منشی بجردھر نے ادھر کئی دنوں سے دیوان صاحب کی سلامی کرنی شروع کردی تھی۔ ایک ذی ثروت عہدہ دار سے ربط ضبط پیدا کرنے کا ایسا نادر موقع پاکر وہ کیوں چوکنے لگے۔ کسان تھے ہی دوچار ملاقاتوں میں یہ ان کا سکہ جم گیا۔ دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ ایک دن دیوان صاحب کے ساتھ رانی جگدیش پور کے دربار میں جا پہنچے۔ اور ایسی لچھے دار باتیں کیں۔ اپنی تحصیلداری کی ایسی زیٹ وڑائی کہ رانی صاحب پر بھی جادو چل گیا۔ تحصیلداری کرنا کوئی دل لگی نہیں ہے۔ ڈینگ مارنے کی میری عادت نہیں۔ لیکن جس علاقہ میں مشکل سے پچاس ہزار کی وصولی ہوتی تھی۔ اسی علاقہ سے سال کے اندر دولاکھ وصول کرکے دکھایا اور لطف یہ کہ کسی کو حراست میں رکھنے یا جائداد قرق کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

ایسے کارگزار آدمیوں کی قدر سبھی جگہ ہوتی ہے۔ رانی صاحب نے سوچا۔ اس آدمی کی لیاقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ٹھاکر صاحب سے صلاح کی۔ انھوں نے اور بھی ردا جمایا۔ ان کے دوستوں میں بجردھر ہی ایسے تھے۔ جس پر لونگی کی نظرعنایت تھی۔ دوسر ہی سلامی میں منشی جی کو ۲۵ روپے ماہوار کی تحصیلداری مل گئی۔ سواری کے لیے گھوڑا بھی ملا۔ سونے میں سہاگہ ہوگیا۔

منشی جی کے حوصلے بہت اونچے نہ تھے۔ اس نوکری نے ان کے ارمان پورے کر دیے۔ جہاں مہینے میں ایک بار بھی نشاط کی محفل نہ جمنے پاتی تھی۔ وہاں اب تیسوں دن جھمگٹ ہونے لگا۔ اتنے بڑے اہلکار کے لیے شیشہ وساغر کی کیا کمی۔ کبھی علاقہ پر چپکے سے دس بیس بوتلیں کھنچوالیتے۔ کبھی شہر کے کسی کلوار پر دھونس جما کر دو چار بوتل اینٹھ لیتے۔ ایک کہار بھی نوکر رکھ لیا۔

لیکن یہ جانتے تھے کہ اس نوکری کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ رانی صاحب کے ساتھ نبھ ہی گئی تو کے دن۔ نئے راجہ صاحب آتے ہی پرانے نوکروں کو نکال باہر کریں گے۔ اس لیے انھوں نے پیش بندی کے لیے راجہ صاحب سے رسوخ پیدا کرنا شروع کردیا۔ ان کا نام کنور بشال سنگھ تھا۔ رانی صاحب کے دیور ہوتے تھے۔ ان کے دادا دو

بھائی تھے۔ بڑے بڑے ریاست کے مالک تھے۔ انھیں کی اولاد نے دو پشتوں تک ریاست پر حکمرانی کی تھی۔ اب رانی کے لاولد ہونے کے باعث بشال سنگھ کے بھاگ جاگے تھے۔ ان کے دادا کو جو دوچار گاؤں گزارے کے لیے ملے تھے۔ انھیں کو رہن بیچ کرکے ان لوگوں نے ۵۰سال کاٹ دیے تھے۔ یہاں تک کہ اب بشال سنگھ کا گذر بھی مشکل ہوتا تھا اس پر خاندانی وقار کا نباہ بھی لازمی تھا۔ نوکر چاکر سواری شکاری سبھی کچھ رکھنا پڑتا تھا۔ ابھی تک رس قدیم کی نقل ہوتی چلی جاتی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑرہی تھی۔ منشی بجردھرنے گرم پانی سے نہایا اور چوکی سے اترے۔ مگر کھڑاؤں اُلٹے رکھے ہوئے تھے۔ منشی جی نے اُلٹے کھڑاؤں دیکھے تو کہار کو ڈانٹا۔ تجھے کتنی بار کہاہے کہ کھڑاؤں سیدھے رکھا کرو۔ تجھے یاد نہیں رہتا۔ بتا الٹے کھڑاؤں پر کیسے پیر رکھوں۔ آج تو چھوڑے دیتا ہوں۔ لیکن کل ایسی حرکت کی تو تیرے حق میں برا ہوگا۔

نرملا نے ناشتے کے لیے حلوا بنارکھا تھا۔ منشی جی آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور جلتاہوا حلوہ منہ میں ڈال لیا۔ کسی طرح اُسے تو نگل گئے۔ پر زبان جل گئی اور آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ نرملا سے بولے۔ تمھارا کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا۔ جلتاہوا حلوہ سامنے رکھ دیا۔ سارامنہ جل گیا۔

نرملا۔ ذرا ہاتھ سے دیکھ کیوں نہ لیا؟

بجردھر۔ واہ الٹا چور کوتوال کوڈانٹے۔ تمھیں خود سوچ لینا چاہیے تھا کہ جلتا ہوا حلوہ کھاگئے تو منہ کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن تمھیں کیا غم۔ للّو کہاں ہے؟

نرملا۔ للّو مجھ سے کہہ کے نہیں جاتے۔ کہیں کسانوں کی سبھا ہونے والی ہے۔ وہیں گئے ہیں۔

بجردھر۔ نہ جانے اس کے سر سے یہ بھوت کب اترے گا۔ مجھ سے کل انسپکٹر صاحب کہتے تھے۔ لڑکے کو سنبھالیے۔ نہیں دھوکا کھائے گا۔ میرے علاقہ کے آدمی بھی اب ان سبھاؤں میں جانے لگے ہیں۔ کہیں رانی صاحب کے کانوں میں بھنک پڑگئی تو میرے سر ہوجائیں گی۔ کسانوں کو سمجھانا بری بات نہیں۔ لیکن آگ میں کودنا تو برا ہے۔

نرملا۔ جو آگ میں کودے گا۔ آپ جلے گا۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سے بحث کون کرے دوپہر تک لوٹ آؤگے نا؟

بجردھر۔ ہاں کنور نے اگر چھوڑ دیا۔ بڑے ہی ملنسار آدمی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ جاتے ہیں۔ کیا منگلا ابھی تک سورہی ہے؟

نرملا۔ جگاکے ہار گئی۔ اٹھتی ہی نہیں۔

بجردھر۔ یہ سب تمھارے لاڈ پیار کا پھل ہے۔

نرملا۔ تو للو تمھارے جیسا کیوں نہ ہوا؟

منشی جی نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ باہر گھوڑا تیار تھا۔ اس پر بیٹھے اور شیوپور چلے گئے۔ آٹھ بج گئے تھے۔ کنور صاحب دھوپ میں بیٹھے۔ ایک اخبار پڑھ رہے تھے۔ قوی ہیکل آدمی تھے۔ چہرہ نہایت رعب دار سیاہ دوشالے نے ان کے گورے رنگ کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ عمر ۵۰ سال سے تجاوز تھی۔ پر اولاد نہ تھی۔ تین شادیاں کر چکے تھے۔ پر نخلِ مراد بارور نہ ہوا تھا۔

منشی جی نے جاکر سلام کیا، اور بڑے ادب سے ایک موڑھے پر بیٹھ گئے۔ بشال سنگھ نے پوچھا کہیے دربار کی کیا خبریں ہیں؟

منشی نے مسکراکر کہا۔ وہی پرانی رفتار ہے۔ دن میں تین تین ڈاکٹر آتے ہیں۔

"شکایت کیاہے"۔

"بڑھاپا کالاعلاج مرض ہے۔ بس اندھیرا ہورہا ہے۔ روز جگدیش پور سے سولہ آدمی پالکی اٹھانے کے لیے بیگار پکڑ کر آتے ہیں۔ دس بارہ چمار روز گھاس چھیلنے کے لیے پکڑے جاتے ہیں۔ سنا ہے علاقہ بھر کے چماروں نے پنچایت کی ہے کہ جو سائیسی کرے اس کا حقہ پانی بند کردیاجائے۔ اور دیوان صاحب کہتے ہیں کہ علاقہ میں کوئی چمار رہنے ہی نہ پائے گا۔

کنور صاحب نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ابھی وہی دنیا ہے جو بابا آدم کے زمانہ مین تھی۔ دنیا میں انقلاب ہوگیا۔ کسان اور مزدور فرماں روائی کرنے لگے۔ پر اب بھی لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ آپ دیکھیں گے۔ میں ریاست کو کیا سے کیا کرد کھاتا ہوں۔ کایا پلٹ کر دوں گا۔

بجردھر۔ ریاست کی سڑکیں اتنی خراب ہوگئی ہیں کہ یکے گاڑی کا گذر بھی نہیں ہو سکتا۔

کنور۔ سڑکوں کو درست کرنا میرا پہلا کام ہوگا۔ موٹر سروس جاری کردوں گا۔ شیخی نہیں مارتا۔ علاقہ میں کنچن برسنے لگے گا۔ آپ نے کوئی مہاجن ٹھیک کیا؟

بجردھر۔ ہاں کئی آدمیوں سے ملا تھا۔ وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ضمانت کے طور پر کوئی گاؤں لکھ دیا جائے۔

"آپ نے حامی تو نہیں بھری"؟

"جی نہیں۔ لیکن بغیر ضمانت کے روپیہ ملنا مشکل ہے"۔

کنور صاحب نے بے پرواہی کی شان سے کہا۔ تو جانے دیجیے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں فاقے کروں۔ بک جاؤں۔ لیکن ریاست کی انچ بھر زمین رہن نہیں کرسکتا۔ میرے والد بزرگوار نے صرف پانچ ہزار قرض لیے تھے جس کے پچاس ہوگئے۔ اور میرے تین گاؤں جو اس وقت دو لاکھ کو سستے تھے نیلام ہوگئے۔ اسی غم میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کی آخری وصیت تھی کہ اور چاہے جو کچھ کرنا قرض نہ لینا۔

ابھی یہی باتیں ہورہی تھیں کہ زنانخانہ میں سے عورتوں کے تُوتُو میں میں کی صدائیں آنے لگیں۔ ٹھاکر صاحب کی زندگی کا یہی سب سے دردناک پہلو تھا۔ ان کی تینوں بیویوں میں ہمیشہ بم چخ مچی رہتی تھی۔ بڑی بیوی کا نام بسومتی تھا۔ وہ نہایت مغرور اور خوددار عورت تھی۔ ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتی۔ وہ اپنی سوکنوں پر اسی طرح حکومت کرنا چاہتی تھی۔ جیسے ساس بہو پر کرتی ہے۔ جواس کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا اس پر جان دیتی تھی۔ لیکن ان کی مرضی کے خلاف ذرا سی کوئی بات ہوجاتی تو شیر کی طرح غضب ناک ہوجائیں۔

دوسری بیوی کانام رام پریا تھا۔ یہ رانی جگدیش پور کی سگی بہن تھی۔ ان کے باپ پرانے کھلاڑی تھے۔ دو دھاری تلوار سے لڑتے تھے۔ دنوں ہاتھوں میں لڈو رکھنا چاہتے تھے۔ رام پریا رحم اور مروت کی مورت تھی۔ بہت ذی فہم اور شیریں زبان جتنا نازک جسم تھا۔ اتنی ہی نازک طبیعت بھی تھی گھر میں اس طرح رہتی تھیں۔ گویا ہے

ہی نہیں۔ کتابوں سے خاص ذوق تھا۔ نہ کسی سے زیادہ دشمنی نہ کسی سے زیادہ محبت۔

تیسری بیوی کا نام روہنی تھی۔ ٹھاکر صاحب کی اس پر خاص نظر عنایت تھی اور وہ بھی دل وجان سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ اس میں الفت کو زیادہ دخل تھا۔ یا حسد کا۔ اس کا تصفیہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ انھیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کنور صاحب کسی دوسری بیوی سے بات چیت بھی کرسکیں۔ بسومتی تندمزاج ہونے پر بھی تنگ دل نہ تھی۔ دل میں غبار نہ رکھتی تھی۔ روہنی کنبے کو پالتی تھی۔ جیسے چڑیا اپنے انڈے کو سیوے۔ جتنا منہ سے کہتی۔ اس سے کہیں زیادہ دل میں رکھتی تھی۔

کنور صاحب نے اندر جاکر بسومتی سے کہا۔ گھر میں رہنے دوگی یا نہیں۔ ذرا بھی شرم لحاظ نہیں کہ باہر کون بیٹھا ہوا ہے۔ جب دیکھو جنگ چھڑی ہوئی ہے اس زندگی سے تنگ آگیا۔ سنتے سنتے کلیجے میں ناسور پڑگئے۔

بسومتی۔ فعل تو تم نے کیے۔ بھوگے گا کون؟

کنور۔ تو زہر دے دو۔ جلا جلا مارنے سے کیا فائدہ؟

بسومتی۔ کیا چھوٹی رانی لڑنے کے لیے کم تھیں کہ تم ان کی حمایت کرنے آدوڑے۔

روہنی۔ آپ چاہتی ہیں کہ مجھے کان پکڑ کر اٹھائیں یا بٹھائیں۔ تو یہاں کچھ آپ کے گاؤں میں نہیں بسی ہوں۔ کیوں کوئی آپ سے تھر تھر کانپے۔

کنور۔ آخر کچھ معلوم بھی ہو۔ کیا بات ہوئی؟

روہنی۔ وہی جو روز ہوتی ہے۔ ہریا میرے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔ بس جامہ سے باہر ہوگئیں۔ آج آپ اس کا فیصلہ کردیجیے کہ ہریا انھیں کی خاص لونڈی ہے یا میری بھی۔

بسومتی۔ وہ کیا فیصلہ کریں گے۔ فیصلہ میں کروں گی۔ ہریا میرے ساتھ میرے میکے سے آئی ہے اور میری لونڈی ہے۔ اس پر کسی غیر کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

روہنی۔ سنا آپ نے ہریا پر کسی کا دعویٰ نہیں۔ وہ انھیں کی لونڈی ہے۔

کنور۔ ہریا اگر اس گھر میں رہے گی تو اسے سب کا کام کرنا پڑے گا۔

بسومتی یہ سن کر جل اٹھی۔ اس وقت تو آپ نے چہیتی رانی کی ایسی ڈگری کردی۔ گویا یہاں انھیں کا راج ہے۔ ایسے ہی منصف مزاج ہوتے تو اولاد کا منہ دیکھنے

کو نہ ترستے۔
کنور صاحب کے سینے میں تیر سا چُبھا۔ کچھ جواب نہ سوجھا۔ باہر آکر کئی منٹ تک کرب کی حالت میں بیٹھے رہے۔ بسو متی اتنی منہ پھٹ ہے۔ اس کا انھیں گمان بھی نہ تھا۔ اگر طعنہ ہی دینا تھا تو اور کوئی لگتی ہوئی بات کہہ سکتی تھی۔ یہ مہلک ترین وار تھا۔ جو وہ ان پر کر سکتی تھی۔
یکایک انھیں ایک بات سوجھی۔ منشی جی سے بولے۔ جو تشیوں کی پیشین گوئی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
منشی جی پس وپیش میں پڑے کہ اس کا کیا جواب دوں۔ کیا جواب انھیں پسند آئے گا؟ یہ انھیں نہ سوجھا۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے بولے۔ علم کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں۔ ہاں اس کا عالم چاہیے!
کنور۔ بس یہی میرا بھی خیال ہے۔ اگر آپ کی کسی جوتشی سے ملاقات ہو تو ذرا اسے میرے پاس بھیج دیجیے گا۔
منشی۔ بہت اچھا آج ہی بھیج دوں گا۔ آپ مجھے کوئی غیر نہ سمجھیے۔ جب جس کام کی ضرورت ہو مجھے کہلا بھیجئے۔ میں تو جیسے مہارانی کو سمجھتا ہوں۔ ویسے ہی آپ کو سمجھتا ہوں۔
کنور۔ مجھے آپ سے ایسی ہی اُمید ہے۔ ہاں ایک بات اور پوچھنی تھی۔ بھلا اس کا پتہ لگایئے گا کہ آج کل رانی صاحبہ کا کھانا کون پکاتا ہے۔ پہلے تو ان کے میکے ہی کی کوئی عورت تھی۔
منشی جی نے ذرا تامل کے بعد کہا۔ حضور! معاف کیجیے گا۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ مگر رانی صاحب کا بھی غلام ہوں۔ ان کا دشمن نہیں۔ آپ اور وہ دونوں شیر اور شیرنی کی طرح لڑ سکتے ہیں۔ میں گیدڑ کی طرح اپنے فائدے کے لیے بیچ میں کودنا شرمناک سمجھتا ہوں۔
کنور صاحب دل میں شرمائے ہوئے۔ پر اس کے ساتھ ہی منشی جی کی عزت ان کے دل میں اور زیادہ ہو گئی۔ بات بنا کر بولے۔ نہیں نہیں۔ آپ نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ چھی! میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔ میں صرف اس لیے پوچھتا تھا کہ نیا مہراج

برہمن ہی ہے نا؟

کنور صاحب نے بات تو بنائی۔ پر انھیں خود معلوم ہوگیا کہ بات بنی نہیں۔ جھیپ مٹانے کے لیے اخبار دیکھنے لگے۔ منشی جی نے بھی اب زیادہ بیٹھنا مصلحت نہ سمجھی۔ وہ یہاں سے چلے تو ان کے دل میں یہ خوف سمایا ہوا تھا۔ کنور صاحب مجھ سے ناراض ہوگئے۔ مگر اتنا اطمینان تھا کہ میں نے وہی کیا جو حق تھا۔ اگر کوئی سچی بات کہنے سے ناراض ہوجاتا ہے تو ہوجائے۔ منشی جی اکڑکر گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ اپنی خودداری پر انھیں کبھی اتنا غرور نہ ہوا تھا۔ فکروں کو کبھی انھوں نے اتنا حقیر نہ سمجھا تھا۔

(8)

رانی دیوپریا کی زندگی کا خلاصہ صرف دوالفاظ تھے۔ نمودار اور نشاط۔ اس عالم ضعیفی میں بھی ان کا ذوق تن پروری ایک شمہ بھی کم نہ ہوا تھا۔ کہتے ہیں۔ بڑھاپا مردہ آرزوؤں کا مدفن ہے۔ یا شباب کی بدمستیوں کا خمیازہ پر رانی دیوپریا کا بڑھاپا ہوس تھی اور ناکام آرزو۔ وہ ثواب کے کام بہت کرتی تھیں۔ سادھو سنتوں پر انھیں بے حد اعتقاد تھا۔ پر اس میں ان کی دنیاوی غرض چھپی ہوئی تھی اگر وہ کسی دیوتا کو خوش کرسکتیں تو شاید اس سے یہی برذان مانگتیں کہ پیری کی بلا کبھی ان کے سر نہ آئے۔ طرح طرح کے کشتے اور مقویات کا استعمال کرتی رہتی تھیں۔ چہرے کی جھریاں مٹانے اور رنگ کو چمکانے کے لیے انواع واقسام کے پاؤڈروں اور اُبٹنوں سے کام لیا جاتا تھا۔ فکروں کو تو وہ اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتی تھیں۔ رعایا کی راحت وتکلیف سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ ان پر کیا کیا ستم ہوتے ہیں۔ بارش کی کثرت یا قلت سے ان پر کیا گزرتی ہے۔ ان باتوں کی طرف ان کا دھیان کبھی نہ جاتا تھا۔ انھیں جس وقت جتنے روپے کی ضرورت ہو۔ اتنامہیا کرنا منیجر کا کام تھا۔ وہ قرض لے۔ چوری کرے یا رعایا کا گلا کاٹے۔ اس سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

یوں تو ہر ایک قسم کی تفریح سے انھیں یکساں دلچسپی تھی۔ پر ان کی زندگی کی سب سے پُرلطف گھڑیاں وہ ہوتی تھیں۔ جب وہ مست شباب مردوں وعورتوں کے

ساتھ عشوہ طرازیاں کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ شاید بھول جاتی تھیں کہ میرا شباب قصہ ماضی ہوگیا ہے۔ اپنی جوانی کے بجھے ہوئے چراغ کو وہ شباب کی نورانی حرارت سے روشن کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا مہمان خانہ ہمیشہ آباد رہتا تھا۔ انھیں نوجوانوں کی نظروں میں کھپ جانے کا عشق تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرے شمع حسن پر شباب کے پروانے آکر گریں اور جل جائیں۔

بھادوں کی اندھیری رات تھی۔ موسلادھار بارش ہورہی تھی۔ رانی صاحب کو آج کچھ بخار تھا۔ طبیعت بدمزہ تھی۔ سر اٹھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر پڑے رہنے کا موقع نہ تھا۔ ہرش پور کے نوجوان راجکمار کی آج دعوت تھی۔ ان کی مہمان نوازی کا سامان تیار کرنا ضروری تھا۔ ان کے لطف صحبت سے وہ اپنے کو محروم نہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے آنے کا وقت بھی قریب تھا۔ انھوں نے سوچا کیا اس حالت میں میں ان سے ملوں گی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی اکسیر نہیں ہے جو ایام کی افسردگی کو مٹادے کون جانے زندگی میں پھر کبھی ایسا موقعہ ملے یا نہ ملے۔

سامنے میز پر ایک البم رکھا ہوا تھا۔ رانی نے راج کمار کی تصویر نکال کر دیکھی۔ کتنا دل فریب حسن۔ کتنا مردانہ بانکپن۔

رانی ایک آرام کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ اس تصویر میں اتنی کشش کیوں ہے میرا دل کیوں اتنا بے تاب ہے۔ البم میں اور بھی کئی تصویریں ہیں جو اس سے کہیں دلفریب ہیں۔ لیکن ان نوجوانوں کو میں نے کٹھ پتلوں کی طرح نچاکر چھوڑا۔ یہی ایک ایسی تصویر ہے جو میرے دل کو دور گذشتہ کی یاد دلارہی ہے۔ جس کے سامنے تاکتے ہوئے مجھے شرم ہی آتی ہے۔

رانی نے گھڑی کی طرف بیتاب آنکھوں سے دیکھا۔ نو بج رہے تھے۔ اب وہ لیٹی نہ رہ سکیں۔ سنبھل کر اٹھیں۔ الماری میں سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں سے کئی بوندیں ایک پیالی میں ڈالیں اور آنکھیں بند کرکے پی گئیں۔ ان کا چہرہ روشن ہوگیا۔ گویا کوئی کملایا ہوا پھول تازہ ہوگیا ہے۔ چہرہ پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے پڑگئے۔ انھوں نے پھر آئینہ کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر دل فریب تبسم کھیل رہا تھا۔

ان کے اٹھنے کی آہٹ پاکر کنیز کمرے میں آکر کھڑی ہوگئی۔ یہی ان کی مشاطہ تھی۔ گجراتی نام تھا۔

رانی نے کہا۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔ جلدی کرو!

"حضور کو کیسی جلدی۔ جسے غرض ہوگی۔ آئے گا۔ اور بیٹھا رہے گا"۔

"نہیں آج ایسا ہی موقعہ ہے"۔

نائن نے سنگاردان کھولا اور رانی کا سنگار کرنے لگی۔ گویا کوئی مصور تصویر میں رنگ بھر رہا ہو۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ اس نے رانی کے لمبے گیسوؤں کو گونتھ کر ناگن کی سی لٹیں ڈال دیں۔ اور رخساروں پر ایسا رنگ بھرا کہ گل تر کی سی تازگی پیدا ہوگئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ کوئی شباب کی متوالی نازنین سوکر اٹھی ہے۔ رانی نے آئینہ کی طرف دیکھا اور خوش ہوکر بولیں۔ گجراتی تیرے ہاتھ میں کوئی جادو ہے۔

گجراتی۔ آپ کبھی انعام تو دیتی نہیں۔ بس بہانے کرکے ٹال جاتی ہیں۔

"اچھا تو بتا کیا لے گی"؟

"میں تو وہی چیز لوں گی۔ جو کئی بار مانگ چکی"۔

"وہ چیز تیرے کام کی نہیں۔ تو اس کی قدر نہیں کرسکتی"۔

"اچھا تو نہ دیجیے۔ لیکن پھر انعام کا ذکر نہ کیجیے گا"۔

دفعتاً موٹر کی روشنی دکھائی دی۔ رانی نے چونک کر کہا۔ کنور صاحب آگئے ہیں۔ میں جھولا گھر میں جاتی ہوں۔ انھیں وہیں لانا۔

یہ جھولا گھر ایک وسیع گل خانہ تھا۔ اتنا اونچا کہ جھولا پر بیٹھ کر خوب پینگ لی جاسکتی تھی۔ ریشم کی ڈوریوں میں پڑا ہوا ایک پٹرہ لٹک رہا تھا۔ پودوں وجھاڑیوں اور لتاؤں نے ساحل جمنا کا سا منظر پیدا کردیا تھا۔ کئی ہرن اور مور ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

رانی جھولے کی ڈوری پکڑ کر کھڑی ہوگئیں اور ایک ہرن کے بچے کو بلاکر اس کا منہ سہلانے لگیں۔ قدموں کی آہٹ ہوئی۔ رانی مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے دروازے پر آئیں۔ پر یہ راجکمار نہ تھے۔ منور ما تھی۔ رانی کو کچھ مایوسی تو ہوئی مگر منورما بھی آج کے ناٹک کا ستارہ تھی۔ انھوں نے اسے بلا بھیجا تھا۔

رانی۔ تو نے بڑی دیر لگادی۔
منورما۔ کیاکرتی۔ پانی کے مارے گھر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔
رانی۔ راجکمار نے نہ جانے آج کیوں دیر کی۔ تب تک کوئی گیت سنا۔
وہیں حوض کے کنارے ایک سنگ مرمر کا چبوترہ تھا۔ دونوں جاکراس پر بیٹھ گئیں۔
"کیا میں بہت بری لگتی ہوں؟"
"آپ! آپ تو حسن کی دیوی معلوم ہوتی ہیں"۔
"چل جھوٹی۔ مجھ سے اپنی صورت بدلے گی؟ اچھا بتادنیا میں سب سے بیش قیمت کون سی چیز ہے"۔
"کوہ نور ہیرا ہوگا اور کیا"؟
"دریگلی۔ دنیامیں سب سے انمول رتن جوانی ہے۔ تونے کبھی محبت کی ہے"؟
"جایئے! میں آپ سے نہیں بولتی"۔
رانی نے سینے پرہاتھ رکھ کر کہا۔ آہ! تو نے تیرسا ماردیا۔ کاش میرے منہ سے ایسی باتیں نکلتیں۔ سچ بتاتو نے کسی نوجوان سے محبت کی ہے؟ اچھا آ۔ آج میں سکھادوں۔
منورما۔ آپ مجھے چھیڑیں گی۔ تو میں چلی جاؤں گی۔
رانی۔ اے! تو اتنا چڑھتی کیوں ہے؟ ایسی بچی بھی تو نہیں ہے۔ دیکھ سب سے پہلی بات ہے آنکھوں سے تیر چلانے کے فن میں مشاق ہونا۔ جس میں یہ خوبی ہے۔ وہ چاہے چندر مکھی نہ ہو۔ پھر بھی مردکادل چھین سکتی ہے۔ حسن خود کچھ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جیسے کوئی سپاہی ہتھیاروں سے کچھ نہیں کرسکتا۔ جب تک انھیں چلانا نہ جانتا ہو۔ اچھا پھکیت ایک بانس کی چھڑی سے وہ کام کرسکتا ہے جو دوسرے سنگین اور بندوق سے بھی نہیں کرسکتے۔ مان لے۔ میں تیرا عاشق ہوں۔ بتا تو میری طرف کیسے تاکے گی؟
منورما نے لحاظ سے سر جھکا لیا۔
رانی نے اس کی ٹھڈی کو پکڑ کر منہ اُٹھالیا اور بولی۔ پگلی یوں سر جھکانے سے کیا

ہوگا۔ مرد سمجھے گا یہ تو کچھ جانتی ہی نہیں۔ اچھا سمجھ لے تو مرد ہے۔ دیکھ میں تیری طرف کیسے تاکتی ہوں۔ سر اٹھا کر میری طرف دیکھ۔ کہتی ہوں سر اٹھا نہیں میں چٹکی کاٹ لوں گی۔ ہاں اسی طرح۔

یہ کہہ کر رانی نے آنکھوں کی ناوک اندازی کا ایسا کمال کر دکھایا کہ منورما کو اس کے اثر کا قائل ہونا پڑا۔

رانی۔ تجھ کچھ معلوم ہوا؟

منورما۔ مجھے تو تیر سا لگا۔ آپ موہنی منتر جانتی ہوں گی۔

رانی۔ نوجوان مرد ہوتا تو اس وقت چھاتی پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوتی۔ اچھا۔ آ اب تجھے بتاؤں کہ آنکھوں سے راز نیاز کی باتیں کیسے کی جاتی ہیں؟

دفعتاً راجکمار بکرم سنگھ نے جھولے گھر میں قدم رکھا۔ کوئی تیس سال کی عمر تھی۔ چہرے سے رعب اور استقلال جھلک رہا تھا۔ اونچا قد تھا۔ گورا رنگ۔ اونچی پیشانی۔ آنکھوں میں اتنی چمک اور تیزی تھی کہ دل میں چبھ جاتی تھیں۔ وہ صرف ایک پیلے رنگ کا ریشمی کرتا پہنے ہوئے تھے اور گلے میں ایک سفید چادر ڈال لی تھی۔ رانی جھولے سے اُترنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ ان کے پاس آگئے اور بولے۔ معاف کیجیے گا میں اس تاخیر کے لیے نادم ہوں۔ میں آہی رہا تھا کہ یونیورسٹی کے کئی لڑکے آپہنچے اور مجھے ایک فلسفیانہ مسئلہ پر تقریر کرنے کے لیے گھسیٹ لے گئے۔

رانی نے شکوہ کے انداز سے کہا۔ میں آپ سے شکایت کب کرتی ہوں۔ آپ آگئے۔ یہی کیا کم احسان ہے۔ نہ آتے تو میں کیا کرلیتی۔ لیکن اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ رات بھر قید رکھوں گی۔

راجکمار۔ اگر پریم کے مندر میں رہنا تاوان ہے۔ تو میں اس میں عمر بھر رہنے کو تیار ہوں۔

رانی۔ آپ باتیں بنانے میں بہت مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا ذرا ان زلفوں کو سنبھال لیجیے، بار بار منہ پر آجاتی ہیں۔

راجکمار۔ میرے سخت ہاتھ انھیں چھونے کے قابل نہیں۔

رانی نے ترچھی آنکھوں سے راجکار کو دیکھا۔ یہ غیر متوقع جواب تھا۔ ان ملائم

معطر لہراتی ہوئی زلفوں پر دست درازی کرنے کا موقعہ پاکر ایسا کون تھا۔ جو آپ کو خوش نصیب نہ سمجھتا۔ رانی دل میں کٹ کر رہ گئیں۔ انھوں نے مردوں کو ہمیشہ دل بہلاؤ کا ایک کھلونا سمجھا تھا۔ الفت سے ان کے دل میں کبھی تموج نہ ہوا تھا۔ وہ ہوس ہی کو الفت سمجھتی تھیں۔ اس محبت سے جس میں خلوص اور وفا ہے وہ محروم تھیں۔ لیکن اس وقت انھیں اسی پر خلوص اور پاک جذبہ کا احساس ہورہا تھا۔ انھوں نے دل کو بہت سنبھال کر راجکمار سے اتنی باتیں کی تھیں۔ ان کا باطن راجکمار سے اس اختلاط پر انھیں نفرین کررہا تھا۔ سر نیچا کر کے بولیں۔ اگر ہاتھوں کی طرح دل بھی سخت ہے تو اس میں محبت کا گذر کیسے ہوگا؟

راجکمار۔ دیوی کی پوجا کے لیے مندر میں وہی آدمی جاتا ہے جس کے دل میں عقیدت ہو۔

الفاظ معمولی تھے۔ پر رانی کو ان میں پاکیزہ الفت کی جھلک نظر آئی۔ شاید زندگی میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ رانی کے دل میں جذبۂ صادق کا ظہور ہوا۔ انھیں ایسا معلوم ہورہا تھا کہ ان کی آنکھیں میرے دل میں چبھی جارہی ہیں۔ جھولے سے اُتر کر رانی نے اپنے بال سمیٹ لیے اور گھونگھٹ سے ماتھے کو چھپاتی ہوئی بولیں۔ جبین نیاز دیوتاؤں کو بھی کھینچ لاتی ہے۔

یہ کہہ کر حوض کے کنارے وہ جا بیٹھیں اور فوارہ کو کھولا تو راجکمار پر عرق گلاب کی پھوہاریں پڑنے لگیں۔ انھوں نے مسکراکر کہا۔ گلاب سے سینچا ہوا پودا لُو کے جھونکے نہ سہہ سکے گا۔ اس کا خیال رکھیے گا۔ رانی نے پرسدھ آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔ ابھی گلاب سے سینچتی ہوں۔ پھر اپنے خون دل سے سینچوں گی۔ پر اس کا پھل کھانا میری تقدیر میں ہے یا نہیں کون جانے۔

دیوپریا نے یہ کہتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دل میں ایک وشواس پیدا ہوا۔ کیا یہ بے بہا جنس مجھے مل سکتی ہے۔ میرے ایسے نصیب کہاں؟

راجکمار نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ جس چیز کو آپ محال سمجھ رہی ہیں۔ وہ آج سے پہلے آپ کی نذر ہوچکی ہے۔

رانی۔ اس رتن کو قبول کرنے کی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔ میں آپ کے رحم کے قابل ہوں۔ محبت کے قابل نہیں۔

راجکمار۔ کوئی ایسا داغ نہیں ہے جو محبت نہ مٹا سکے۔

یہ کہتے کہتے رانی کو اپنے جسم پر ضعف کا غلبہ ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ اکسیر کا اثر مٹنے لگا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جھریاں نظر آنے لگیں۔ انھوں نے شرم سے منہ چھپالیا۔ اور یہ سوچ کر کہ بہت جلد محبت کی داستان ختم ہوجائے گی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ راجکمار نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور تسکین بخش انداز سے بولے۔ دیوی میں تمھاری اسی صورت کا عاشق ہوں۔ میں وہ چیز چاہتا ہوں جو اس صورت کے پردے میں چھپی ہے۔ میری طرف غور سے دیکھو۔ مجھے پہچانتی ہو؟ کبھی دیکھا ہے؟

رانی نے حیرت میں آکر راجکمار کے چہرے پر نظر ڈالی۔ گویا آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ ہاتھ پھیلاتی ہوئی بولیں۔ پر ان ناتھ۔ کیا تم ہو اس شکل میں؟

پھر ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

(9)

رانی دیوپریا کو ہوش آیا تو ان کا سر راجکمار کے پیروں پر تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انھیں ان کی طرف تاکتے ہوئے عجیب وحشت ہورہی تھی۔ کچھ کچھ شبہ ہورہا تھا کہ میں سوتو نہیں رہی ہوں۔ کوئی انسان مجاز کی اتھاہ تاریکی کو یوں چیر سکتا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیانی خلیج کو کون پار کرسکتا ہے۔ جس میں یہ طاقت ہو وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے۔ یہ خیال آتے ہی رانی کا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ وہ رہ رہ کر چھپی ہوئی نگاہوں سے ان کے چہرے کی طرف تاکتی تھی۔ گویا تحقیق کررہی ہو کہ وہ عالم خواب میں تو نہیں ہے۔

راجکمار نے آہستہ سے اسے اٹھا کر بٹھادیا۔ بولے۔ ہاں میں تمھارا وہی پرانا رفیق ہوں۔ جو اپنی حسرتوں کو لیے کچھ دنوں کے لیے تم سے جدا ہوگیا تھا۔ جسے ہم موت کہتے ہیں اور جس کے خوف سے دنیا کانپتی ہے۔ وہ صرف ایک سفر ہے۔ اس سفر میں

بھی تمھاری یاد آتی رہتی تھی۔ بے تابی کے عالم میں اس فضاء وسیع میں دوڑا کرتا تھا۔ یہی حالت قریب قریب ہر ایک روح کی تھی۔ کوئی اپنے اندوختہ کو لٹتے دیکھ کر کڑھتا تھا۔ کوئی اپنے بال بچوں کو ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر روتا تھا۔ میں بھی انھیں بدنصیبوں میں تھا۔ دیکھتا تھا کہ میرے باغِ محبت کو دوسرے پامال کررہے ہیں۔ اور دیکھ دیکھ کر سینے میں ایک آگ سی مشتعل ہوجاتی تھی۔ کتنے دنوں میری حالت یہ رہی۔ میں قیاس نہیں کرسکتا۔ پر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس حالت میں پڑے ہوئے کئی جگ بیت گئے۔ نئی نئی صورتیں آتیں اور پرانی صورتیں غائب ہوجاتی تھیں۔ دفعتاً ایک دن میں بھی غائب ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو نوزائیدہ طفل تھا۔ میں راجہ ہرش پور کا لختِ جگر تھا۔

اس نئے گھر میں میری پرورش ہونے لگی۔ شیرخوارگی کے دن جیوں جیوں گزرتے جاتے تھے میری یاد پر پردہ سا پڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب بولنے کی طاقت آئی تو مایا اپنا کلام پورا کرچکی تھی۔ بہت دنوں تک تعلیم پاتا رہا اور وہ روحانیات سے مجھے خاص ذوق تھا۔ حق کی تلاش مجھے یورپ لے گئی اور میں وہاں سات برس تک نظری تجربات کے ذریعے روحانی حقیقتوں کو دریافت کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

وہاں جب تمنا پوری نہ ہوئی تو میں نے پاپیادہ دنیا کی سیاحت اختیار کی۔ اور برسوں دنیا کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر میں تبت جاپہنچا اور گھومتا ہوا مانسرور کے کنارے پہنچا۔ گفتار میں اتنی قوت نہیں کہ اس ہیبت ناک دلکشی اور اس مرعوب کرنے والی رفعت اور شوکت کا بیان کرسکے۔ میں ایسی حالت میں کھڑا تھا کہ یکایک میں نے ایک مرد ضعیف کو ایک غار سے نکل کر پہاڑ کی چوٹی پر جاتے دیکھا۔ جن چٹانوں پر تخیل کے بھی پاؤں ڈگمگا جائیں۔ ان پر وہ اتنی آسانی سے چلے جاتے تھے۔ گویا ہموار راستہ ہے۔ انسان کی طاقت اتنی کہ وہ برف سے ڈھکے ہوئے دشوار گذار چوٹی پر اتنی تیزی سے لپکتا چلا جائے۔ اور انسان بھی وہ جس کے سر کے بال سن کی طرح سفید ہوگئے ہوں۔ وہ انسان نہیں۔ کوئی دیوتا یا ولی ہیں۔ میرے دل میں ان کی زیارت کرنے کا اتنا اشتیاق ہوا کہ میں نے بھی اس پہاڑی پر چڑھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن دس ہی پانچ قدموں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے لیے یہ امر محال ہے رات ایک

چٹان پر بیٹھ کر کاٹی۔ سرِشام ہی سے برف گرنے لگی۔ یقین ہوگیا۔ یہیں برف کے نیچے میری مزار بنے گی۔ صبح تک میرے اوپر خدا جانے کتنی برف جمع ہوگئی۔ جسم میں ایک عجیب تکان محسوس ہونے لگا۔ بار بار نیند سی آتی تھی۔ نیند کا ایسا غلبہ مجھ پر کبھی نہ ہوا تھا۔ کب تک اس حالت میں پڑا رہا۔ کہہ نہیں سکتا۔ نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کٹی میں مرگ چھالے پر کمبل اوڑھے پڑا ہوا ہوں اور ایک مہاتما بیٹھے ہوئے میرے چہرے کی طرف شفقت کی نگاہوں میں دیکھ رہے ہیں۔ میں نے انھیں پہچان لیا۔ یہ وہی مہاتما تھے جن کے درشنوں کے لیے میں بے قرار تھا۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کر انداز ترحم سے مسکرا کر بولے۔ برف کا بستر کتنی پیاری چیز ہے۔ پھولوں کی سیج پر کبھی تمھیں ایسی نیند آئی تھی۔

میں اُٹھ بیٹھا اور مہاتما کے قدموں پر سر رکھ کر بولا۔ پھولوں کی سیج پر فیض کہاں نصیب ہوتا۔ آپ کا سایہ رحمت نہ ہوتا۔ تو شاید وہیں میرا خاتمہ ہوجاتا۔ مجھے آپ ہی جیسے باکمال مرشد کی تلاش تھی۔

مہاتما نے عارفانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ اسی لیے ایسا سمجھتے ہو کہ تم نے مجھے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے دیکھا۔ یہ تو معمولی بات ہے اور مشق سے حاصل ہوسکتی ہے۔

یکایک مجھے اپنے جسم میں برقی رو دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دل کی حرکت تیز ہوگئی۔ آنکھوں سے نور کی شعاعیں نکلنے لگیں۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ مجھ میں یہ تغیر کیوں کر ہوا۔

مہاتما جی نے ایک لمحہ کے بعد پھر فرمایا۔ تم مجھے پہاڑ پر چڑھتے دیکھ کر حیرت میں آگئے۔ مگر اب وہ زمانہ آرہا ہے۔ جب لوگ فضا میں اسی طرح چل سکیں گے۔ جسے ہم زمین پر چلتے ہیں۔ ہم زمین سے دوسرے سیاروں میں اتنی ہی آسانی سے آجاسکیں گے۔ جیسے ایک مقام سے دوسرے مقام پر۔ یہ مادیت ہمیں روحانیت کی طرف لے جائے گی۔ ہستی کے وہ اسرار جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے کھل جائیں گے۔

میں نے پوچھا۔ تو کیا ہمیں سابقہ زندگی کے حالات بھی معلوم ہوجائیں گے؟
مہاتما۔ وہ تو اب بھی معلوم ہوسکتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ ساری کائنات برقی قوت کا ایک بحر بیکراں ہے۔ جب ہم یہاں بیٹھے ہوئے یورپ اور امریکہ کی باتیں سُن سکتے

ہیں۔ جب ہم محض عمل سے دلوں میں چھپے ہوئے خیالات پڑھ سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنی سابق زندگی کے اسرار نہ معلوم کرسکیں۔

میں نے پوچھا۔ تو کیا مجھے بھی یہ کمال حاصل ہوسکتا ہے؟

مہاتما۔ اگر مجھے ہوسکتا ہے تو آپ کو کیوں نہ ہوگا۔ ابھی تو آپ تھکے ہوئے ہیں ذرا آرام کرلیجیے۔ تو میں آپ کو اپنے تجربہ گاہ کی سیر کراؤں۔

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے تھوڑے پھل کھلائے جن کا ذائقہ آج تک یاد کرتا ہوں۔ کھاتے ہی میری آنکھیں کھل سی گئیں۔ وہاں کی برقی فضا نے مجھ میں پہلے ہی حیرت انگیز رفعت پیدا کردی تھی۔ یہ پھل کھا کر مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں آسمان میں اُڑسکتا ہوں۔ وہ چڑھائی جسے میں محال سمجھتا تھا۔ آنکھوں میں حقیر معلوم ہونے لگی۔

اب مہاتما جی مجھے اپنے تجربہ گاہ کی سیر کرانے چلے۔ وہ ایک وسیع غار تھا۔ جس کی وسعت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس کی چوڑائی پانچ سو ہاتھ سے کم نہ رہی ہوگی۔ لمبائی اس کی چوگنی تھی۔ اونچی اتنی کہ ہمارے اونچے سے اونچے مینار بھی اس کے پیٹ میں سما سکتے تھے۔ بودھ سنگتراشوں کی کاریگری کے بیش بہا نمونے یہاں بھی موجود تھے۔ یہ زمانہ قدیم کا کوئی بہار تھا۔ مہاتما جی نے اسے تجربہ گاہ بنالیا تھا۔

اندر قدم رکھتے ہی میں ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ جنیوا شہر آنکھوں کے سامنے تھا اور ایک دیوان عام میں اقوام کے سفیر بیٹھے ہوئے کسی سیاسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے اشارے۔ ہونٹوں کا ہلنا اور ہاتھوں کا اٹھنا صاف دکھائی دیتا تھا۔ ان کے الفاظ صاف صاف کانوں میں آتے تھے۔ ایک لحہ کے لیے مجھے ایسا سحر افزا گمان ہوا کہ میں جنیوا میں بیٹھا ہوں۔ ذرا اور آگے بڑھا۔ تو نغمہ شیریں کی آواز کانوں میں آئی۔ میں نے جرمنی میں یہ آواز سنی تھی۔ پہچان گیا۔ قیصر کی آواز تھی۔ میرے استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ جن ایجادوں کا بڑے بڑے محققین کو محض امکان معلوم ہوتا تھا۔ وہ سب یہاں اپنے بلوغ اور کمال کی صورت میں نظر آرہے تھے۔ اس برفستانی خطہ میں اور اتنی اونچائی پر یہ تجربہ گاہ کیوں کر قائم ہوئی خدا ہی جانے۔ طبیعت پر کیسے انھوں نے ایسی فتوحات حاصل کیں۔ میں اسی خیال میں غوطے

کھا رہا تھا کہ مہاتما جی مسکراکر بولے۔ تمھیں ان مشاہدات سے حیرت ہورہی ہے حقیقت یہ ہے کہ طبیعات نے یوگ کے عملوں کو آسان کردیا ہے وہ عالم اسباب سے رفتہ رفتہ عالم حقیقت کی طرف آرہا ہے۔ نفسیاتی عمل سے جو کمال برسوں میں حاصل ہوتا تھا وہ اب لمحوں میں ہوجاتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ کیا پچھلی زندگی کے حالات بھی کسی تجربہ سے معلوم ہوسکتے ہیں؟

مہاتما۔ ہاں ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں محض شوق تجسس کو پورا کرنے وسامان عیش بڑھانے کے لیے طبیعات کو آلۂ کار بنانا میں طبیعات کا بیجا استعمال سمجھتا ہوں۔

مجھے کچھ اور پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ شام تک ان عجیب وغریب آلات کو دیکھتا رہا۔ مگر یہی دھن سوار تھی کہ کیوں کر اس عقدہ کو حل کروں۔ آخر انھیں کسی طرح پسیجتے نہ دیکھ کر میں نے اسی حکمت سے کام لیا۔ جو مایوسوں کا آخری سہارا ہے۔ بولا۔ آپ نے تو یہاں وہ معجزے کر دکھائے ہیں۔ جن کا ابھی اہل کمال محض خواب دیکھ رہے ہیں۔

اگرچہ میں نے ایک امر حق کا اظہار کیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی حق بھی خوشامد کا کام کرجاتا ہے۔ خوش ہوکر بولے۔ ابھی تم نے میرا ہوائی جہاز نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جلدی چاند کا سفر کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

میں نے کہا۔ وہ دن ہماری تاریخ میں یادگار ہوگا۔

مہاتما۔ زمانہ قدیم کے رشی لوگ یوگ بل سے علم غیب حاصل کرتے تھے۔ میں نے طبیعاتی تجربوں سے اس مشکل پر فتح پائی ہے۔ عہد تو میں نے یہی کیا تھا کہ یہ راز کسی کو نہ بتلاؤں گا۔ لیکن تمھارا اجتہاد دیکھ کر مجھے اپنے عہد پر قائم رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔

میں مہاتما کے پیچھے پیچھے ایک ایسے غار میں پہنچا۔ جہاں صرف ایک چھوٹی سی چوکی رکھی ہوئی تھی۔ مہاتما جی نے تند لہجہ میں کہا۔ تمھیں یہ راز اپنے دل تک ہی رکھنا پڑے گا۔ اگر کسی شہرت یا دولت کے حریص کو اس کا علم ہوگیا۔ تو وہ دنیا میں

ایک انقلاب عظیم برپا کردے گا۔ اور شاید مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن مجھے تمھارے اوپر اعتماد ہے۔ اس چوکی پر لیٹ جاؤ اور آنکھیں بند کرلو۔

چوکی پر لیٹتے ہی میری آنکھیں جھپک گئیں اور پچھلی زندگی کے نظارے آنکھوں کے سامنے آگئے۔ یہی محل تھا۔ یہی ماں باپ تھے۔ جن کی تصویریں دیوان خانہ میں لگی ہوئی ہیں۔ میں لڑکوں کے ساتھ اسی باغ میں گیند کھیل رہا تھا۔ پھر وہ دوسرا منظر سامنے آیا۔ میں تمھارے ساتھ ایک کشتی پر بیٹھا ہوا ندی کی سیر کررہاتھا۔ یاد ہے تمھیں وہ منظر جب ہوا زور سے چلنے لگی تھی اور تم میرے سینے سے چمٹ گئی تھیں۔

دیوپریا نے جوش کے ساتھ کہا۔ خوب یاد ہے پر ان ناتھ ! خوب یاد ہے۔

راجکمار۔ وہ بات یاد ہے جب میں سبزہ زار پر بیٹھا ہوا تمھیں پھول کے پودوں سے آراستہ کررہا تھا۔

دیوپریا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بولی۔ ماں پر ان ناتھ ! خوب یاد ہے۔ یہی تو وہ مقام ہے۔

راجکمار۔ ایک لمحہ میں میری آنکھیں کھل گئیں میں نے مہاتما جی سے پوچھا۔ میرے باپ زندہ ہیں؟

مہاتما۔ نہیں! ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ تمھارے فراق میں گھل گھل کر مرگئے۔ میں نے پوچھا اور میری بیوی؟

"وہ ابھی زندہ ہے"۔

"کس شہر میں"

"جگدیش پور میں۔ مگر تمھارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ یہ مشیت ایزدی کے خلاف ہوگا اور نظام زندگی کو پلٹنا کشتی کو سوراخ کرنا ہے!

میں نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ مگر دل میں تم سے ملنے کی ٹھان لی۔ تیسرے دن جب وہاں سے چلا تو مہاتما جی نے مجھے گلے سے لگالیا۔ میں ہردوار ہوتا ہوا ہرش پور پہنچا اور ایک ہفتہ تک ماں باپ کی خدمت کرنے کے بعد یہاں آگیا۔ یہاں ہر ایک چیز جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ دو چار پرانے دوست بھی دکھائی دیے۔ ایک دن جگدیش پور کی سیر بھی کر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا بچپن وہیں گذرا ہے۔ تم سے

ملنے کے پہلے کئی دنوں تک میں بہت پس وپیش میں پڑا رہا۔ ایک عجیب وحشت ہوتی تھی۔ اتفاقاً پارک میں تم سے ملاقات ہوگئی۔ کہہ نہیں سکتا۔ تمھیں دیکھ کر میرے دل کی کیفیت کیا ہوئی۔ یہی جی چاہتا تھا۔ دوڑ کر تمھیں سینے سے لگالوں۔ مہاتما جی کے الفاظ بھول گئے اور وہیں میں تم سے مل گیا۔

دیوپریا نے روکر کہا۔ آپ کے درشن پاتے ہی مجھے ایسامعلوم ہوا۔ گویاآپ سے میری پرانی ملاقات ہے۔ آپ کی ایک ہی نگاہ نے میرے دل کے ان جذبات کو بیدار کردیا۔ جنھیں میری ہوس پرستیوں نے بے جان کردیا تھا۔

یہ کہتے کہتے رانی کے دل پر ندامت اور افسوس نے پردہ سا ڈال دیا۔ بولی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کے قدموں پر سر رکھ سکوں۔ لیکن جب تک جیوؤں گی آپ کی یادکو سینے میں محفوظ رکھوں گی۔

راجکمار نے پوچھا۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تمھیں اب بھی میری نسبت کچھ شبہ ہے؟

دیوپریا نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کررہے ہیں۔ میرا الٹا ہوا سہاگ پھر ملے گا۔ اس کی تو مجھے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ اس نعمت کو پاکر کیا میں اسے چھوڑ سکتی ہوں؟ آپ کو پاکر مجھے کسی بات کی تمنا نہیں رہی۔

دوسرے دن صبح ہری سیوک سنگھ رانی کو سلام کرنے کو گئے۔ تو اس نے کہا میرا ارادہ اب کسی تیرتھ استھان میں رہنے کا ہے۔اس مایا جال سے نکلنا چاہتی ہوں۔ شاید یہاں لوٹ کر نہ آؤں۔ آپ جاکر کنور بشال سنگھ سے کہہ دیں۔ ان کاراج میں انھیں سونپے جاتی ہوں۔

آدھ گھنٹہ میں یہ خبر ساری ریاست میں پھیل گئی۔

(10)

منشی بجردھربشال سنگھ کے پاس سے لوٹے تو بیوی سے بولے۔ رئیس ہو تو ایسا ہو۔ کسی طرح چھوڑتے ہی نہ تھے۔ لڑکر آیا ہوں۔ ان کے زمانہ میں رعایا چین کرے گی۔ یہ تعریف سُن کر چکردھر کو بھی کنور صاحب سے ملنے کاشوق ہوا۔ اور پہلے ہی

ملاقات میں ان کے معتقد ہوگئے۔ اپنے انجمن کے سرپرستوں میں ان کا نام بھی درج کرلیا۔

کنور صاحب کرشن بھگت تھے۔ لیکن ان کی بیویوں میں اس معاملے میں ابھی اختلاف تھا۔ روہنی جنم اشٹمی کے دن جشن مناتی تھی۔ تو بسومتی رام نومی کے دن وہ نوراترہ کا برت رکھتی۔ زمین پر سوتی اور درگا پاٹھ سنتی رہتی۔ رام پریا کوئی برت نہ رکھتی تھی۔ کہتی کہ اس نمائش سے فائدہ؟ دل صاف چاہیے۔ یہی سب سے بڑی عبادت ہے!

شام ہوگئی تھی۔ چکردھر اپنے دوستوں کے ساتھ آرائش میں مصروف تھے۔ گانا شروع ہونے والا ہی تھا کہ بسومتی اور روہنی میں تکرار ہوگئی۔ بسومتی جب رام نومی کی تقریب مناتی تھی تو کنور صاحب کچھ کنارہ کش سے رہتے تھے۔ اس کے خیال میں اس موقعہ پر ان کی دلچسپی کا باعث کرشن کی بھگتی نہیں، روہنی کی خاطر داری تھی۔ وہ دل میں جل بھن رہی تھی۔ روہنی سولہوں سنگار کیے پکوان بناتی تھی۔ گھر کے سارے برتن پھنسے ہوئے تھے۔ اس کی یہ تیاریاں دیکھ دیکھ کر بسومتی کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کوئی ناگہانی آفت آجائے اور یہ سارا اہتمام خاک میں مل جائے۔ سوچتے سوچتے اسے ایک بہانہ مل گیا۔ مہری کو بھیجا۔ جاکر برتن مانگ لا۔ ان کا کھانا رات بھر پکتا رہے گا۔ تو کوئی کب تک بیٹھا راہ دیکھتا رہے گا۔ مہری نے جاکر کہا۔ تو روہنی جھلا کر بولی۔ کیا آج سرشام ہی بھوک ستانے لگی۔ اگر ایسی ہی جلدی ہے تو کمہار کے یہاں سے ہانڈیاں منگوالیں۔

بسومتی نے یہ سنا تو آگ ہوگئی۔ ہانڈیاں چڑھائیں میرے دشمن۔ میں کیوں ہانڈی چڑھاؤں۔ نئے برتن کیوں نہیں منگوالیتیں۔ اپنے کرشن سے کہہ دیں گاڑی بھر برتن بھیج دیں۔

روہنی رسوئی گھر سے باہر نکل کر بولی۔ بہن ذرا منہ سنبھال کر باتیں کرو۔ دیوتاؤں کی توہین کرنا اچھا نہیں۔

بسومتی۔ توہین تو تم کرتی ہو۔ جو برت کے دن یوں بن ٹھن کر اٹھلاتی پھرتی ہو۔ دیوتا رنگ روپ نہیں دیکھتے دل دیکھتے ہیں۔

روہنی۔ کیا آج لڑنے پر آمادہ ہو کر آئی ہو؟ ایشور سب دُکھ دے بُرا ساتھ نہ
دے۔ یوں ہی گہنے کپڑے آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں نا۔ نہ پہنوں گی لے
جا ری مہری سب برتن اٹھالے جا۔ اور باہر جاکر کہہ دے جو کچھ بنوانا ہو، کسی
حلوائی سے بنوالیں۔

یہ کہہ کر روہنی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سارے گہنے کپڑے اتار پھینکے اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہی۔ کنور صاحب نے یہ خبر سنی تو دانت پیس کر بولے۔ ان کم بختوں سے آج بھی خاموش نہیں بیٹھاجاتا۔ اس زندگی سے تو موت ہی اچھی۔ گھر میں آکر روہنی سے بولے۔ تم منہ ڈھانپ کر سورہی ہو۔ یا پکوان بناتی ہو۔ روہنی نے پڑے پڑے جواب دیا ایسے تیوہار سے باز آئی۔ جیسے دیکھ دوسروں کی چھاتی پھٹے۔

بشال سنگھ نے کہا۔ تم سے بار بار کہہ چکا کہ ان کے منہ نہ لگا کرو۔ پھر تم سے بڑی ہیں۔ یوں بھی تم کو ان کا لحاظ کرنا چاہیے۔

جس دن بسومتی نے کنور صاحب کو اولاد کا طعنہ دیا تھا۔ اسی دن سے انھوں نے اس سے بولنا چالنا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے کچھ خائف رہنے لگے تھے۔ مگر روہنی کیوں دبنے لگی تھی جھنجلا کر بولی۔ رہنے بھی دو۔ جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ جب بڑا دیکھ دیکھ کر جلے۔ بات بات پر کوسے تو کوئی کہاں تک اس کا لحاظ کرے۔ الٹے مجھی کو نصیحت کرتے ہو۔ سامنے تو بیٹھی ہوئی ہیں۔ جاکر پوچھتے کیوں نہیں۔ منہ میں کالکھ کیوں نہیں لگاتے۔

کنور صاحب جیوں جیوں روہنی کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اور بھی بپھرتی جاتی تھی اور بار بار کہتی تھی۔ تم نے میرے ساتھ کیوں بیاہ کیا؟ آخر وہ بھی گرم ہوکر بولے۔ اور لوگ عورتوں سے شادی کرکے کون سا آرام پہنچاتے ہیں۔ جو میں تمھیں نہیں دے رہا ہوں۔ وہی لڑائی جھگڑے کی بات۔ تم نہ لڑو۔ تو کوئی زبردستی تم سے نہیں لڑے گا۔ آخر رام پریا بھی تو اسی گھر میں رہتی ہے۔

روہنی۔ تو میری ہی سینگ بڑھی ہوئی ہے۔ میں ہی دوسروں سے چھیڑ چھیڑ کر لڑتی
ہوں۔ یہ تمھیں بہت دور کی سوجھی۔ واہ! کیا نئی بات نکالی ہے۔
کنور۔ تم خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو۔ میں نے تو دنیا کی بات کہی تھی۔ اور تم اپنے اوپر

لے اڑیں۔

روہنی۔ کیا کروں۔ ایشور نے عقل ہی نہیں دی۔ وہاں بھی اندھیر نگری اور چوپٹ راجہ، ہوں گے۔ عقل تو دو ہی آدمیوں کے حصہ میں پڑی ہے ایک مہارانی کے دوسرے آپ کے۔

کنور۔ اچھا اُٹھ کر پکوان بناتی ہو یا نہیں۔ کچھ خبر ہے۔ نو بجے ہیں۔

روہنی۔ میری بلا جاتی ہے۔ تیوہار منانے کی آرزو نہیں رہی۔

کنور۔ تم نہ اُٹھوگی؟

روہنی۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں! یا اور دوچار بار کہہ دوں ؟

بسومتی سائبان میں بیٹھی ہوئی ہمہ تن گوش دونوں آدمیوں کی باتیں سن رہی تھی۔ گویا کوئی فوج کا سردار غنیم کی نقل وحرکت کا مطالعہ کررہا ہو کہ یہ کب چوکے اور کب میں دبا بیٹھوں۔ دم دم میں صورت حال تبدیل ہورہی تھی۔ کبھی موقعہ آتا ہوا نظر آتا۔ تو پھر نکل جاتا۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کی ایک بھاری چال نے اسے وہ مبارک موقعہ دے ہی دیا۔ بشال سنگھ کو منہ لٹکائے دیکھ کر روہنی اپنے کمرے سے بولی۔ کیا میری صورت دیکھنے کی قسم کھالی ہے؟ یا تمھارے حساب میں گھر میں ہوں ہی نہیں۔ بہت دن تو ہو گئے روٹھے۔ کیا عمر بھر روٹھے ہی رہوگے۔ جو اتنے دل گیر کیوں ہو۔

بشال سنگھ نے ٹھٹھک کر کہا۔ تمھاری ہی لگائی ہوئی آگ کو تو بجھا رہا ہوں۔ پر اُلٹے ہاتھ جل گئے۔ کیا روز روز طوفان کھڑا کیا کرتی ہو۔ چار دن کی زندگی سے اسے ہنس کھیل کر نہیں کاٹتے بنتا۔ میں تو ایسے تنگ آگیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔

بسومتی۔ کہاں بھاگ کر جاؤ گے۔ نئے بیاہ کے کچھ لطف تو اٹھائے ہی نہیں۔

کنور۔ بہت اٹھا چکا۔ طبیعت سیر ہو گئی۔

بسومتی۔ بس میرے خاطر سے ایک بیاہ اور کرلو۔ جس میں چوکڑی پوری ہو جائے۔

کنور۔ کیوں بیٹھے بیٹھے جلاتی ہو۔ کیا شادی کی تھی۔ لطف اٹھانے کے لیے یا تم سے کوئی بڑھ کر نازنین ہوگی۔

بسومتی۔ اچھا۔ آؤ سنتے جاؤ!
کنور۔ جانے دو۔ لوگ باہر بیٹھے ہوں گے۔
بسومتی۔ اب یہی نہیں اچھا لگتا۔ ابھی گھنٹے بھر وہاں بیٹھے چکنی چپڑی باتیں کرتے رہے تو دیر نہیں ہوئی۔ میں ایک لمحہ کے لیے بلاتی ہوں۔ تو بھاگے جاتے ہو۔ اسی دوامکھی کی تو تمھیں سزا مل رہی ہے۔

یہ کہتی ہوئی بسومتی نے آکر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرہ میں لے گئی۔ اور چارپائی پر بٹھاتی ہوئی بولی۔ عورتوں کو سرچڑھانے کا یہی نتیجہ ہے۔ جب دیکھو اپنی تقدیر کو رویا کرتی ہے۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ یہی میری خطا ہے۔ تم اس کے من کے نہیں ہو۔ ساری جلن اسی بات کی ہے۔ پوچھو تجھے کوئی زبردستی نکال لایا تھا۔ یا تیرے ماں باپ کی آنکھیں پھوٹ گئی تھیں۔ یہی باتیں کہہ دیتی ہوں تو تلملا اٹھتی ہے اور تم دوڑتے ہو منانے۔ بس اس کا مزاج اور آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔
کنور۔ اب بتاؤ۔ پکوان کون بناوے؟
بسومتی۔ تو کیاجہاں مرغا نہ ہوگا۔ وہاں سویرا ہی نہ ہوگا۔ آخر جب وہ نہیں تھیں تب بھی تو جنم اشٹمی منائی جاتی تھی۔ میں بنائے دیتی ہوں۔ ایسا کون سا بڑا کام ہے۔

کنورصاحب باغ باغ ہوکر بولے بس تمھارے انھیں اداؤں پر تو میری جان جاتی ہے۔ شریف گھرانے کی عورتوں کا یہی دستور ہے۔ آج تمھاری دھانی ساڑھی غضب ڈھارہی ہے۔ شاعروں نے سچ کہا ہے۔ ماہتاب کی طرح جس بھی روز بروز کمال کا درجہ حاصل کرتا ہے۔

فتح کے نشے میں متوالی بسومتی آدھی رات تک بیٹھی طرح طرح کے پکوان بناتی رہی۔ حسد نے برسوں کی سوئی ہوئی بھگتی کو بیدار کردی۔ وہ ان کاموں میں برق تھی۔ روہنی جس کام کو دن بھر میں مرمر کے کرتی۔ اُسے وہ دو گھنٹوں میں ہنستے ہنستے پورا کردیتی تھی۔ رام پریا نے اسے بہت مصروف دیکھا تو وہ بھی آبیٹھی۔

بشال سنگھ کچھ دیر تو بیٹھے گانا سنتے رہے۔ پر وہاں دل نہ لگا۔ پھر بھیتر چلے آئے اور رسوئی کے دروازہ پر موڑھا ڈال کر بیٹھ گئے۔ خوف تھا کہ کہیں دونوں پھر نہ

لڑمریں۔

بسومتی نے کہا۔ باہر کیا ہورہاہے؟

کنور۔ گانا شروع ہوگیا ہے۔ تم اتنی مہین پوریاں کیسے بناتی ہو۔ پھٹ نہیں جاتیں؟

بسومتی۔ چاہوں تو اس سے مہین بیل دوں۔ کاغذ مات ہوجائے۔

کنور۔ مگر کھلیں گی نہیں۔

بسومتی۔ کھلا کے دکھادوں؟ ابھی مہارانی نہیں اُٹھیں کیا؟ اس میں چھپ کر باتیں سننے کی بری لت ہے۔ بہت عورتیں دیکھیں۔ لیکن اس کے ڈھنگ سب سے نرالے ہیں۔ محبت تو اسے چھو نہیں گئی۔

کنور۔ سب دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔ نرا گدھا نہیں ہوں۔

بسومتی۔ یہی تو رونا ہے کہ تم دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ جہاں اس نے مسکراکر باتیں کیں مست ہوگئے۔ آدمی میں سب عیب ہوں۔ زن مرید نہ ہو۔

کنور۔ میں زن مرد ہوں؟ ایسی ایسی باتیں کہتاہوں کہ وہ بھی یاد کرتی ہوگی۔

بسومتی۔ کیاجانیں۔ یہاں تو جب دیکھتی ہوں۔ اسے مسکراتے ہی دیکھتی ہوں۔

رام پریا۔ کڑی بات بھی ہنس کر کہی جائے تو میٹھی ہوجاتی ہے۔

کنور۔ ہنس کر نہیں کہتا۔ ڈانٹتاہوں۔ پھٹکارتاہوں۔ لونڈا نہیں ہوں کہ صورت پر لٹو ہوجاؤں۔

بسومتی۔ ڈانٹتے ہوگے۔ مگر محبت کے ساتھ ڈھلتی عمر میں سبھی مردوں کا یہی وطیرہ ہوجاتاہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں تم سے لاکھ روٹھی رہوں۔ لیکن تمھارا منہ ذرا بھی گرادیکھا اور جان نکل گئی۔ وہاں جب تک جاکر پیر نہ سہلاؤ۔ دیوی جی سیدھی نہیں ہوتیں۔ آدمی کڑے دم چاہیے۔ جس کا قصور دیکھا۔ اسے ڈانٹے۔ خون پی لینے پر آمادہ ہوجائے۔ ایسے ہی مردوں سے عورتیں قابو میں آتی ہیں۔ اس کی ناز برداری کی اور آنکھوں سے گرا۔

رام پریا منہ پھیر کر مسکرائی اور بولی۔ بہن تم سب گُر بتائے دیتی ہو۔ کس کے ماتھے جائے گی۔

بسومتی۔ ہم لوگوں کی لگام کب ڈھیلی تھی؟

رام پریا۔ جس کی لگام کبھی کڑی تھی ہی نہیں۔ وہ آج لگام کھینچنے سے تھوڑے ہی قابو میں آئی جاتی ہے اور دولتیاں جھاڑنے لگے گی۔

"میں نے تو اپنی دانست میں کبھی لگام ڈھیلی نہیں کی۔ آج ہی دیکھو۔ کیسی پھٹکار بتلائی۔

بسومتی۔ کیا کہنا ہے۔ ذرا مونچھیں کھڑی کرلو۔ لاؤ پکیا میں سنواردوں۔

دفعتاً کسی کے پیروں کی آہٹ پاکر بسومتی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ روہنی دبے پاؤں چلی جارہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ دانتوں سے ہونٹ دباکر بولی۔ چھپی کھڑی تھی۔ میں نے صاف دیکھا۔

کنور صاحب نے پیچھے کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ بڑا غضب ہوا۔ مجھے ذرا آہٹ نہ ملی۔

بھادوں کی اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ زمین پاتال میں چلی گئی ہے۔ موم بتی کی روشنی اس اتھاہ تاریکی میں پاؤں رکھتے کانپتی تھی۔ بشال سنگھ تھالیوں میں پکوان بھروا بھروا کر باہر رکھوانے میں لگے ہوئے تھے۔ اتنے میں روہنی ایک چادر اوڑھے ہوئے گھر سے نکلی اور باہر کی طرف چلی۔ بشال سنگھ دہلیز کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس بھری سبھا میں اسے یوں بے خوف نکلتے دیکھ کر ان کا خون جوش کھانے لگا۔ ذرا بھی نہ پوچھا۔ کہاں جاتی ہو۔ کیا بات ہے؟ دل نے کہا۔ جس نے اتنی بے حیائی کی۔ اس سے اور کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ جہاں جاتی ہوجائے۔ میری بلا سے۔ جب اس نے میرا سرہی نیچا کردیا۔ تو اس کی مجھے کیا پرواہ۔ بے شرم تو ہے ہی۔ کچھ پوچھوں اور گالی دینے لگے تو منہ میں اور کالکھ لگ جائے۔

اتنے میں چکردھر کنور صاحب سے کچھ پوچھنے آئے تو دیکھا کہ مہری ان کے سامنے کھڑی ہے اور وہ غصہ سے آنکھیں لال کیے کہہ رہی ہیں۔ اگر وہ میری لونڈی نہیں ہے تو میں بھی اس کا غلام نہیں ہوں۔ اگر وہ عورت ہوکر اتنی آپے سے باہر ہوسکتی ہے تو میں مرد ہوکر اس کے پیروں پر سر نہ رکھوں گا۔ لوٹ کر آئی تو سرکاٹ لوں گا۔ (چکردھر دیکھ کر) آپ نے بھی تو اسے دیکھا ہوگا۔

چکردھر نے پوچھا۔ کسے۔ میں تو کیلے چھیل رہا تھا۔ کون گیا ہے؟

کنور۔ میری چھوٹی رانی صاحب روٹھ کر باہر چلی گئی ہیں۔ آپ سے کوئی پردہ نہیں۔ آج عورتوں میں کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ بس مزاج گرم ہوگیا۔ میں اسے منانے نہیں جاتا۔ آپ دھکے کھائے گی سر پر شامت سوار ہے۔ چکردھر نے مہری سے پوچھا۔ کدھر گئی ہیں۔ تو نے دیکھا ہے؟

مہری نے کہا۔ میں تو برتن مانج رہی تھی۔ بابو جی! میں کیاجانوں؟

چکردھر نے لپک کر ایک لالٹین اٹھالی اور باہر نکل کر دائیں بائیں نگاہیں دوڑاتے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے چلے۔ کوئی دو سو قدم گئے ہوں گے کہ روہنی ایک درخت کے نیچے کھڑی دکھائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کررہی ہے۔ چکردھر اسے دیکھتے ہی اس کے پاس گئے اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ روہنی بولی۔ کیا مجھے پکڑنے آتے ہو؟ اپنا بھلا چاہتے ہو تو لوٹ جاؤ۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

آپ اندھیرے میں کہاں جائیں گے۔ ہاتھ کو ہاتھ تو سوجھتا نہیں۔

روہنی نے چشم پُر آب سے تاکتے ہوئے کہا۔ اندھیرے میں اسے ڈر لگتا ہے جس کی پیٹھ پر کوئی ہو۔ جس کا دنیا میں کوئی نہیں اسے کس کا خوف؟ جاکر کہہ دینا کہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کے سوئیں۔ اب تو کانٹا نکل گیا۔

چکردھر۔ آپ کنور صاحب کے ساتھ بڑی بے انصافی کررہی ہیں بے چارے شرم اور غم سے کھڑے رو رہے ہیں۔

روہنی۔ کیوں باتیں بناتے ہو۔ وہ روئیں گے اور میرے لیے۔ میں جس دن مر جاؤں گی۔ اس دن گھی کے چراغ جلیں گے۔ اپنے ماں باپ کو کیا کہوں۔ سوچتے تھے۔ بیٹی رانی ہوجائے گی۔ یہاں ڈولی سے اُترتے ہی سر پر مصیبت سوار ہوگئی۔

چکردھر۔ اس سے کنور صاحب کی کتنی بے عزتی ہورہی ہے۔ اس کا آپ کو ذرا بھی خیال نہیں۔ آخر آپ کہاں جارہی ہیں؟

روہنی۔ تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو۔ میرا جہاں جی چاہے گا۔ جاؤں گی۔ ان کے پاؤں میں مہندی نہیں رچی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکلتے ہی دیکھا۔

کیا اس کا مطلب میں نہیں سمجھی؟

چکردھر۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں۔ لوٹ چلیے۔

روہنی۔ تمھیں یہ کہنے کا کیا حق ہے؟

چکردھر۔ اندھے کو کوئیں میں گرنے سے بچانا ہر ایک کا کام ہے۔

روہنی۔ میں نہ اندھی ہوں۔ نہ بے وقوف اور بے ہوش۔ عورت ہونے ہی سے باولی نہیں ہوگئی ہوں۔ جس گھر میں مجھے دیکھ کر دوسروں کو جلن ہوتی ہے اور طرح طرح کے بہتان لگائے جاتے ہیں۔ اس گھر میں پھر قدم نہ رکھوں گی۔

یہ کہہ کر روہنی آگے بڑھی کہ چکردھر نے سامنے کھڑے ہوکر کہا۔ میں آپ کو ایک قدم بھی آگے نہ رکھنے دوں گا۔ سوچیے۔ آپ کے اس فعل کا اثر دوسری عورتوں پر کیا ہوگا۔ جب وہ دیکھیں گی کہ بڑے گھروں کی عورتیں روٹھ کر گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں تو انھیں بھی ذرا ذرا سی بات پر ایسی ہی جرأت ہوگی۔ یا نہیں؟

روہنی۔ میں تو چپکے سے چلی جاتی تھی۔ تمھیں تو ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہو۔

چکردھر۔ میں آپ کے سامنے بچہ ہوں۔ آپ کو سمجھانا میری بے ادبی ہوگی۔ لیکن شریف خاندان کی عورتوں کا یہ شعار نہیں۔

روہنی۔ کیا آپ چاہتے ہیں۔ پھر اسی گھر میں جاؤں؟

چکردھر۔ ہاں یہی چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا کو آپ کے اوپر ہنسنے کا موقعہ ملے۔ اور اس گھر کو دیویاں آپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگائیں۔

روہنی کئی منٹ تک پس وپیش کرنے کے بعد بولی۔ خیر چلیے۔ آپ بھی کیا کہیں گے۔ جب میں کانٹا ہی ہوں۔ تو پھر اچھی طرح گڑوں گی۔ مگر کنور صاحب سے اتنا ضرور کہہ دیجیے گا کہ جن مہارانی کو آج وہ گھر کی لکشمی سمجھ رہے ہیں وہ ایک دن انھیں دھوکا دیں گی۔ میں روٹھوں گی تو اپنی ہی جان دوں گی۔ وہ بگڑیں گی تو جان لے کر چھوڑیں گی۔

یہ کہہ کر روہنی گھر کی طرف لوٹ پڑی۔ یہ چکردھر کی فہمائش کا اثر تھا یا اس کی عاقبت اندیشی کا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ مگر لوٹتے وقت وہ غرور سے گردن اٹھائے ہوئے تھی۔ اپنی واپسی کو وہ اپنی شکست نہیں بلکہ فتح سمجھ رہی تھی۔ جیسے کوئی مغرور

سپاہی سنبھل کر پھر وار کرنے کے لیے تیار ہو۔

جب دونوں آدمی دروازے پر پہنچے تو بشال سنگھ وہیں اسی طرح خاموش کھڑے تھے۔ روہنی نے دہلیز پر قدم رکھا۔ انھوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا۔ جب وہ اندر چلی گئی تو چکردھر سے بولے میں تو سمجھتا تھا اب کسی طرح نہ مانے گی۔ مگر آپ کھینچ ہی لائے۔

چکردھر۔ بڑی بڑی منتیں کیں۔ تب جاکر راضی ہوئی۔ مزاج بے حد نازک ہے۔

کنور۔ خیر آج ان کے مزاج کا بھی رنگ معلوم ہوگیا۔

اس وقت بینڈ بجنے کی آوازیں کان میں آنے لگیں اور ذرا دیر میں آدمیوں کا ایک جلوس مسلح سپاہیوں کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔

(11)

یہ وہ جماعت تھی جو کنور صاحب کو گدی کی خوشخبری دینے آئی تھی۔ ہری سیوک سنگھ اور بجردھر اس کے سرغنہ تھے۔ کنور صاحب نے لوگوں کو لے جاکر فرش پر بٹھایا اور خود مسند پر بیٹھے۔ قدرانہ کی رقم ادا ہوئی۔ بینڈ نے مبارک باد بجایا۔ پھر لوگوں کی پان اورالایچی سے خاطر کی گئی۔ کنور صاحب کا بار بار جی چاہتا تھا کہ اندر جاکر مژدہ سناؤں۔ پر موقع نہ پاکر ضبط کیے ہوئے تھے۔ منشی بجردھر اب تک خاموش بیٹھے تھے۔ بولے۔ حضور! آج سب سے پہلے مجھی کو یہ خبر معلوم ہوئی۔

ہری سیوک سنگھ نے تصحیح کی۔ میں بھی تو آپ کے ساتھ ہی پہنچ گیا تھا۔

بجردھر۔ آپ مجھ سے ذرا دیر بعد پہنچے۔ میری عادت ہے کہ بہت سویرے اٹھتاہوں۔ دیر تک سوتا تو ایک دن بھی تحصیلداری نہ نبھتی۔ بڑی ذمہ داری کا کام ہے حضور! شیر ڈیوڑھا پر پہنچا۔ تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ دربان کا پتہ تھا نہ سپاہی کا۔ گھبرایا۔ ماجرا کیا ہے۔ فوراً اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی گجراتی نے رانی صاحب کا خط لاکر میرے ہاتھ میں رکھ دیا۔ رانی صاحب نے شاید اسے تاکید کی تھی کہ وہ خط میرے ہاتھ میں دینا۔ ہری سیوک نے قہر کی نگاہ سے منشی جی کی طرف دیکھا۔

بجردھر۔ وہ خط پڑھ کر میری جو حالت ہوئی بیان نہیں کرسکتا۔ کبھی روتا تھا۔ کبھی ہنستا تھا۔ بس یہی چاہتا تھا کہ آکر حضور کو خبر کردوں۔ ٹھیک اسی وقت دیوان صاحب پہنچے۔ کیوں دیوان صاحب ہے یہی بات؟

ہری سیوک۔ مجھے باہر ہی خبر مل گئی تھی۔ آدمیوں کو خبردار رہنے کی تاکید کررہا تھا۔

بجردھر۔ آپ نے باہر جو کچھ کہا ہو۔ مجھے اس کی خبر نہیں۔ اندر آپ اسی قت پہنچے جب میں خط لیے کھڑا تھا۔ میں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا۔ سب کمروں میں قفل ڈلوادیجیے اور دفتر میں کسی کو جانے کی اجازت نہ دیجیے۔

ہری سیوک۔ اتنی موٹی سی بات کے لیے مجھے آپ کے مشورہ کی ضرورت نہ تھی۔

بجردھر۔ یہ میرا مطلب نہیں۔ میں تو واقعہ عرض کررہا ہوں۔ حضور سارے دن دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ اب آج تو گستاخی معاف ہو۔ اب تو دھوم دھام سے جلسہ ہونا چاہیے۔ اور دعوت ایسی ہو کہ شہر والے یاد کریں!

بشال سنگھ۔ اب اس وقت بھجن ہونے دیجیے۔ کل یہیں محفل جمے گی۔

بجردھر۔ حضور میں نے پہلے ہی محفل کا انتظام کرلیا ہے۔ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ سارے شہر کے چنے ہوئے کلاونتوں کو نوید دے آیا ہوں۔

ابھی تحصیلدار نے بات بھی پوری نہ کی تھی کہ جھنکو نے اندر آکر سلام کیا اور بولا۔ دینا ناتھ استاد لوگ آگئے ہیں۔ حکم ہوں تو حاضر ہوں۔

منشی جی باہر گئے اور استادوں کو ہاتھوں ہاتھ لے آئے۔ کوئی دس بارہ آدمی تھے۔ سب کے سب بوڑھے کسی کا منہ پوپلا کسی کی کمر جھکی ہوئی۔ کوئی آنکھوں کا اندھا ان کا لباس دیکھ کر ایسا خیال ہوتا تھا کہ کم سے کم تین صدی قبل کے آدمی ہیں۔ وہی نیچی چپکن جس پر ہری گوٹ لگی ہوئی۔ وہی چناؤ دار پاجامہ وہی اُلجھا ہوا تار تار سرپیچ۔ کمر میں پٹکا بندھا ہوا۔ وہ تین استاد ننگ دھڑنگ تھے۔ جس کے بدن پر لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

استادوں نے اندر آکر سب کو جھک کر سلام کیا اور دوزانو ہوکر بیٹھے۔ منشی جی نے ان کا تعارف کرانا شروع کیا۔ یہ استاد مینڈو خاں ہیں۔ مہاراج الور کے درباری ہیں۔ وہاں سے دوہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا ہے۔ آپ ستار بجانے میں اپنا ثانی نہیں

رکھتے۔ یہ چندو مہراج ہیں۔ پکھاوج کے پکے استاد۔ مہاراج گوالیار آپ کو دو ہزار روپیہ ماہوار تک دیتے ہیں۔ لیکن آپ کو کاشی سے پریم ہے۔ چھوڑ کر نہیں جاتے۔ یہ استاد فضلو ہیں۔ سروں سے راگنیوں کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ ایک بار آپ نے لاٹ صاحب کے سامنے گایا تھا۔ جب گانا بند ہوا تو صاحب نشے سے جھومنے لگے۔ جب ڈاکٹروں نے دوا دی تب نشہ اترا۔

بشال سنگھ۔ یہاں وہ راگنی نہ گوایئے گا۔ نہیں تو لوگ پاگل ہوجائیں گے۔ یہاں تو ڈاکٹر بھی نہیں ہیں۔

تعارف کے بعد گانا شروع ہوا۔ فضلو نے ملار چھیڑا اور منشی جی جھومنے لگے۔ فضلو بھی منشی جی ہی کو اپنا کمال دکھاتے تھے۔ استاد لوگ واہ! واہ! کا تار باندھے ہوئے تھے۔ منشی جی آنکھیں بند کیے سر ہلا رہے تھے۔ اور محفل کے لوگ ایک ایک کرکے کھسکتے جاتے تھے۔ دوچار اصحاب جو باقی تھے وہ سو رہے تھے۔ مگر فضلو کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ استاد استادوں کے لیے گاتے ہیں۔ گنی اہل کمال ہی سے داد چاہتا ہے۔ عوام کی اسے پرواہ نہیں ہوتی۔ اگر اس محفل میں اکیلے منشی جی ہی ہوتے تو بھی فضلو اتنا ہی مست ہوکر گاتے۔

ملار کے بعد فضلو نے نرگن گانا شروع کیا۔ راگنی کا نام تو استاد ہی بتاسکتے ہیں استادوں کے منہ میں سبھی راگنیاں یکساں معلوم ہوتی ہیں۔ آگ میں پگھل کر بھی دھاتیں یکساں ہوجاتی ہیں۔ منشی جی کو اس راگ نے متوالا کردیا۔ پہلے بیٹھے بیٹھے جھومتے تھے۔ جھومتے جھومتے ان کے پیروں میں خود بخود ایک حرکت ہونے لگی۔ ہاتھوں سے پیروں سے بھی تال دینے لگے۔ یہاں تک کہ وہ ناچنے لگے۔ گنی کو اپنا کمال دکھاتے شرم نہیں آتی۔ پہلوان کو اکھاڑے میں تال ٹھوک کر اُترتے کیا شرم۔ جو کشتی کا فن نہیں جانتے۔ وہ دھکیلنے سے بھی اکھاڑے میں نہیں اترتے۔ سبھی عملے منہ پھیر کر ہنستے تھے۔ یہاں تک کہ بشال سنگھ بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن منشی جی اپنے دھن میں مگن تھے۔ بے خبر ہنستے تھے۔ باخبر رقص کا لطف اٹھاتے تھے۔

اتنے میں کرشن کی ولادت کا وقت سعید آپہنچا۔ ساری محفل کھڑی ہوگئی اور استادوں نے ہم آواز ہوکر مبارک باد گانا شر ع کیا سماں بندھ گیا۔ صرف دو ہی آدمی

ایسے تھے جن کے سر اس وقت بھی فکر سے دبے ہوئے تھے۔ ایک ہری سیوک سنگھ۔ دوسرے کنور صاحب۔ ایک کو یہ فکر بھی تھی کہ دیکھیں کل کیامصیبت آتی ہے۔ دوسرے کو یہ فکر تھی کہ اس موذی سے کیوں کر پرانی کدورتیں نکالوں۔ چکردھر شرم سے اب تک منہ چھپائے باہر کھڑے تھے۔ مبارک باد ختم ہوتے ہی آکر پرشاد بانٹنے لگے۔ دیوان صاحب نے تو خوب ہاتھ صاف کیے ہوں گے۔

بجردھر۔ حضور! میں نے ان کی جانب سے کوئی بے عنوانی نہیں دیکھی بے وجہ کسی کی برائی نہ کروں گا۔ حضور! ایشور کو منہ دکھانا ہے۔ دیوان صاحب کو آپ سے عداوت تھی۔ یہ میں جانتا ہوں۔ رانی صاحب کے غلام تھے کیاکرتے۔ لیکن اب آپ کے نمک خوار ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ اتنی ہی ایمانداری سے آپ کی خدمت کریں

بشال سنگھ۔ آپ کو پرانا قصہ معلوم نہیں۔ اسی کے باعث مجھے جگدیش پور چھوڑنا پڑا۔ اس کا بس چلتا تو اس نے مجھے قتل کرادیا ہوتا۔

بجردھر۔ گستاخی معاف ہوحضور! آپ کا بس چلتا تو کیا رانی صاحب کی جان بچ جاتی۔ یادیوان صاحب زندہ رہتے۔ ان پچھلی باتوں کو بھول جایئے!خدا نے آپ کو رتبہ بخشا ہے۔ اب آپ کو فراخ حوصلہ کرنا چاہیے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کے دل میں نہ آنی چاہئیں۔ ماتحتوں سے ان کے افسر کے متعلق تحقیقات کرنا افسر کو ذلیل کرنا ہے۔ میں نے اتنے دنوں تحصیلداری کی لیکن اس اصول کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا۔ میں تو خیر ان نکات کو سمجھتا ہوں۔ لیکن حضور! دوسرے ماتحتوں سے ایسی باتیں پوچھیں گے تو وہ اپنے افسر کی ہزاروں برائیاں آپ سے کریں گے۔

بشال سنگھ نے شرمندہ ہوکر کہا۔ میں آپ کو دیوان صاحب کا ماتحت نہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں اور اسی رشتہ سے میں نے آپ سے یہ بات دریافت کی تھی میں نے عہد کرلیا تھا کہ پہلا وار انھی پر کروں گا۔ لیکن آپ کی باتوں نے وہ خیال پلٹ دیا۔ آپ بھی انھیں سمجھا دیجیے گا کہ میری طرف سے کوئی ملال نہ رکھیں۔ ہاں رعایا پر ظلم نہ کریں۔

بشال سنگھ۔ جی نہیں۔ میں جلسے کے لیے رعایا کا گلا نہ دباؤں گا۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ جشن منایا ہی نہ جائے۔

بجردھر۔ گدی نشینی کے جلسے کے لیے تو اسامیوں سے کچھ نہ کچھ وصول کرنا ہی پڑے گا۔

یہ کہتے ہوئے کنور صاحب اندر گئے اور سب سے پہلے روہنی کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ پشت کی جانب کھڑکی کھولے ہوئے کھڑی تھی۔ اس تاریکی میں اسے شاید اپنا نوشتہ تقدیر نظر آرہا تھا۔ شوہر کی بے وفائی نے آج اس کے غرور کی اندھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ تسلیم کرتی تھی کہ گھر سے باہر نکلنا اس کے لیے معیوب تھا لیکن کنور صاحب کا وہ ظالمانہ برتاؤ اس کے جگر پر نشتر کا کام کررہا تھا۔ وہ جیوں جیوں اس واقعہ پر غور کرتی تھی۔ اس کا زخمی دل بے قرار ہوجاتا تھا۔

کنور صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا۔ روہنی ! آج ہماری مرادیں پوری ہوگئیں۔ اب خوش ہوجاؤ۔

روہنی۔ اب تو گھر میں رہنا اور بھی مشکل ہوجائے گا۔ جب کچھ نہ تھا تب تو مزاج نہ ملتا تھا۔ اب کوئی کیوں زندہ رہنے پائے گا۔

بشال سنگھ نے آزردہ خاطر ہوکر کہا۔ یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ دیوی ایشور کا شکر کرو کہ اس نے ہماری دعا قبول کی۔

روہنی۔ جب اپنا کوئی رہاہی نہیں۔ تو راج پاٹ لے کر چاٹوں گی۔

بشال سنگھ کو غصہ تو آیا۔ لیکن اس خوف سے کہ بات بڑھ جائے گی۔ کچھ بولے نہیں۔ وہاں سے بسومتی کے پاس پہنچے اور بولے، کیا سوتی ہو؟ اٹھو خوشخبری سنائیں۔

بسومتی۔ جن کو سنانا تھا۔ انھیں تو سنا ہی آئے ہیں سن کر کیاکروں گی۔ اب تک جو بات دل میں تھی وہ آج تم نے کھول دی۔

بشال سنگھ۔ کیا کہتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

بسومتی۔ ہاں۔ ابھی بھولے نادان ہو۔ بچے ہو۔ سمجھ میں کیوں آئے گا۔ گردن پر چھری پھیر رہے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو۔ پیچھے والی آگے آئی۔ آگے والی

کونے میں۔

بشال سنگھ نے معذرت کی۔ یہ بات نہیں ہے بسومتی۔ تم جان بوجھ کر نادان بنتی ہو۔ میں ادھر ہی آرہا تھا۔ اس کا کمرہ اندھیرا دیکھ کر چلا گیا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔

بسومتی۔ مجھ سے باتیں نہ بناؤ۔ سمجھ گئے۔ تمھیں تو ایشور نے ناحق مونچھیں دے دیں۔ عورت ہوتے تو کسی بھلے آدمی کا گھر بستا۔ ران تلے کی عورت سامنے سے نکل گئی۔ اور تم ٹکر ٹکر تاکتے رہے۔ میں کہتی ہوں۔ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ اس نے کہیں کچھ کر کرا تو نہیں دیا ہے۔

کنور صاحب نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور رام پریا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔ بشال سنگھ نے چونک کر پوچھا۔ کیا بات ہے؟ رو کیوں رہی ہو۔ میں تمھیں خوشخبری سنانے آیا ہوں۔

رام پریا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ سن چکی ہوں۔ مگر آپ اسے خوشخبری کیسے کہتے ہیں۔ میری پیاری بہن ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یہ کیا خوشخبری ہے؟ اس دکھیا نے سنسار کا کچھ سکھ نہ دیکھا۔ روتے ہی روتے عمر گذر گئی جس کو پھولوں کی سیج پر بھی نیند نہ آتی تھی۔ وہ پتھر کی چٹانوں پر کیسے سوئے گی۔ شاید ٹھوکریں کھانا ہی اس کی تقدیر میں لکھا تھا۔

یہ کہہ کر وہ پھر سسکنے لگی۔ کنور صاحب کو اس کا رونا برا معلوم ہوا۔ باہر آکر محفل میں بیٹھ گئے۔ مینڈو خاں ستار بجا رہے تھے۔ محفل پر محویت کا عالم طاری تھا۔ جو لوگ فضلو کے گانے سے بیزار ہو کر باہر چلے گئے تھے۔ وہ بھی اس وقت سر دھنتے اور جھومتے نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ستار کے تاروں سے بہشتی تتلیوں کی قطاریں سی نکل نکل کر ساری فضا میں اپنے جھینے پرونے ناچ رہی ہیں۔

مگر اس مسرت اور جشن کے عالم میں بھی ایک شخص خلش باطن سے بے قرار تھا۔ یہ کنور بشال سنگھ تھے ساری بارات ہنستی تھی۔ دولہا رو رہا تھا۔

وہ سوچ رہے تھے۔ جب ابھی سے حسد کے مارے عورتوں کا یہ حال ہے تو آئندہ کیا ہوگا۔ تب تو آئے دن تالیاں بجیں گی۔ ان کی سزا یہی ہے کہ یہیں

چھوڑدوں۔ لڑیں جتنی لڑنے کی طاقت ہو۔ روئیں جتنا رویا جائے۔ اس مسرت کو جو میری زندگی کے ساتھ ختم ہوجائے گی۔ ان کی کج فہمیوں سے کیوں برباد کروں۔

(12)

دوسری برسات بھی آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ لیکن چکردھر نے ماں باپ سے اہلیا کی سرگذشت پوشیدہ رکھی۔ جب منشی جی پوچھتے کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں تو کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرکے ٹال دیتے۔ ادھر جسودانندن بار بار لکھتے۔ تم نے منشی جی سے صلاح کی یا نہیں۔ تو ان سے بھی اسی طرح حیلے کرتے۔

جنم اشٹمی کے جلسے کے بعد منشی جی گھر آئے۔ تو ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب کے ساتھ ہی ان کا ستارہ اقبال بھی روشن ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ فریق ثانی سے دبیں۔ اب وہ من مانا جہیز لے سکتے تھے۔ اور دھوم دھام سے شادی کرسکتے تھے۔ لیکن جسودا نندن کو زبان دے چکے تھے۔ اس لیے ان سے ایک بات پوچھنا لازم تھا۔ آخر ایک دن انھوں نے چکردھر سے کہا۔ جسودا نندن بھی کچھ عجب آدمی ہیں۔ ابھی تک کانوں میں تیل ڈالے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا سمجھتے ہیں۔ میں غرض مندہوں۔ تم آج انھیں لکھ دو کہ یا تو اس جاڑے میں شادی کرلیں یا جواب دیں۔ میں انھیں سمجھتا کیا ہوں۔ تم دیکھو گے بڑے بڑے رئیس اس دروازے پر ناک رگڑیں گے۔ آدمی کو بگڑے دیر لگتی ہے۔ بنتے دیر نہیں لگتی۔

چکردھر نے دیکھا کہ اب موقعہ آگیا ہے۔ بولے۔ انھیں تو کوئی پس وپیش نہیں۔ پس وپیش جو کچھ ہوگا۔ آپ ہی کی طرف سے ہوگا۔ بات یہ ہے کہ وہ لڑکی جسودانندن کی بیٹی نہیں ہے۔

بجردھر۔ بیٹی نہیں ہے ! وہ تو بیٹی ہی بتلاتے تھے۔ تمھارے سامنے کی تو بات ہے خیر بیٹی نہ ہوگی۔ بھتیجی ہوگی۔ بھانجی ہوگی۔ پوتی ہوگی۔ بھین ہوگی۔ مجھے آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے جب تمھیں لڑکی پسند اور وہ معقول جہیز دے سکتے ہیں تو مجھے اَور کسی بات کی فکر نہیں۔

چکردھر نے چند لفظوں میں اہلیا کی سرگذشت کہہ سنائی۔ بجردھر سناٹے میں آکر بولے۔ اچھا قصہ یہ ہے ! تب تو بڑا جھوٹا آدمی ہے۔ بنا ہوامکار۔

نرملا نے کہا جبھی ایسی میٹھی میٹھی باتیں کررہا تھا۔ نہ جانے کس ذات کی لڑکی ہے۔ کیا ٹھکانہ۔ صاف صاف لکھ دو۔ مجھے نہیں کرنا ہے بس!

بجردھر۔ میں تم سے صلاح نہیں پوچھتا ہوں۔ تمھیں نے اتنے دنوں تک شان کے ساتھ تحصیلداری نہیں کی ہے۔ میں خود جانتا ہوں۔ ایسے دھوکے بازوں کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہیے!

چکردھر نے شرم سے ہچکتے ہوئے کہا۔ مگر میں تو زبان دے آیا ہوں۔

بجردھر۔ تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے سب کچھ خود ہی طے کرلیا۔ پھر مجھ سے کیا صلاح پوچھتے ہو۔ کیوں نہ ہو۔ آخر تعلیم یافتہ ہو۔ جوان ہو۔ دانشمند ہو۔ تجربہ کار ہو۔ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں ہوتا ہی کون ہوں؟ لیکن تم نے لاکھ ایم. اے. پاس کرلیا ہو۔ مگر ابھی لونڈے ہی ہو۔ اسی لیے تو وہ دغاباز تمھیں یہاں سے لے گیا تھا۔ تم نے لڑکی حسین دیکھی ریجھ گئے۔ مگر یاد رکھو۔ عورت میں حسن ہی سب سے بڑی صفت نہیں ہے میں تمھیں ہرگز شادی نہ کرنے دوں گا۔

چکردھر۔ اگر سبھی ایسا خیال کرنے لگیں۔ تو اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟

بجردھر۔ تم کوئی شہر کے قاضی ہو۔ تم سے مطلب بہت ہوگا۔ زہر کھائے گی۔ تمھیں کو اس کی سب سے زیادہ فکر کیوں ہو؟

چکردھر۔ اگر دوسروں کو اپنی ذمہ داری کا خیال نہ ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اتنا ہی تنگ خیال بن جاؤں۔

بجردھر۔ کیسی بے تکی باتیں کرتے ہوجی۔ جس لڑکی کے ماں باپ کا پتہ نہیں۔ اس سے شادی کرکے کیا خاندان کا نام ڈباؤ گے؟

چکردھر۔ میرا خیال ہے کہ مرد ہو یا عورت حسن سیرت ہی اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔

بجردھر۔ میں اپنے جیتے جی تمھیں وہاں شادی نہ کرنے دوں گا۔

چکردھر۔ تو میرا بھی یہی فیصلہ ہے کہ میں اور کہیں شادی نہ کروں گا۔

یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔ اور جسودانندن کو ایک خط لکھ کر سارا ماجرا بیان کیا۔ والد صاحب راضی نہیں ہوتے۔ اور اگرچہ اصول کے معاملے میں میں ان سے دبنا نہیں چاہتا۔ لیکن ان کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کرکے میں اس عالم ضعیفی میں انھیں صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ آپ سے میری اتنی التجا ہے کہ اس معاملے میں مجھے معذور سمجھیں۔

اس کے بعد انھوں نے دوسرا خط اہلیا کے نام لکھا۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ تین بجے کہیں جاکر یہ خط تمام ہوا۔ اور اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری آزادروی سے والدین کو روحانی خلش ہوگی۔ تو میں یہ روحانی اذیت نہ برداشت کرتا۔ لیکن میں سب کچھ تمھارے ہی فیصلے پر چھوڑتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمھارا فیصلہ ایک فرض شناس ہندو عورت کے شایان شان ہوگا۔

دونوں خطوں کو ڈاک گھر میں ڈالتے ہوئے وہ منورما کو پڑھانے چلے گئے۔ منورما بولی۔ آج بڑی جلدی آگئے۔ لیکن دیکھیے۔ میں آپ کو تیار ملی۔ میں جانتی تھی کہ آپ آرہے ہوں گے۔

چکردھر نے مسکراکر پوچھا۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آرہا ہوں۔

منورما۔ یہ نہ بتاؤں گی۔ مگر میں جان گئی تھی۔ اچھا کہیے تو آپ کے بارے میں کچھ اور بتلاؤں۔ آج کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ آپ کسی نہ کسی بات پر روئے ہیں۔

چکردھر نے جھیپتے ہوئے کہا۔ بالکل غلط۔ میں کیوں روتا کوئی لڑکا ہوں؟

منورما کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ بابو جی! کبھی کبھی آپ بڑے مزے کی بات کہتے ہیں۔ کیا رونا اور ہنسنا لڑکوں ہی کے لیے مخصوص ہے؟ جوان اور بوڑھے نہیں روتے؟

چکردھر نے ہنسنے کی ناکام کوشش کرکے کہا۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمھاری غیب دانی کی تعریف کروں۔ یہ میں نہ کروں گا۔

منورما۔ ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے (ہنس کر) ابھی آپ نے وہ فن نہیں سیکھا۔

جو ہنسی کو رونے اور رونے کو ہنسی کا روپ دے سکتی ہے۔

چکردھر۔ کیا آج کل تم وہ فن سیکھ رہی ہو؟

منورما۔ سیکھ تو نہیں رہی ہوں۔ لیکن سیکھنا چاہتی ہوں۔

چکردھر نے التجا کے لہجہ میں کہا۔ نہیں منورما تم وہ فن نہ سیکھنا۔ سونے کو ملمع کی ضرورت نہیں۔

منورما۔ ان کے آنکھوں سے آنکھیں ملاکر بولی۔ ہوتی ہے بابو جی! ہوتی ہے۔ اس سے سونے کی قیمت چاہے نہ بڑھے۔ پر چمک بڑھ جاتی ہے۔ آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ مہارانی تیرتھ یاترا کرنے گئیں۔ اچھا بتایئے آپ اس راز کو کیا سمجھتے ہیں؟

چکردھر۔ کیااس میں کبھی کوئی راز ہے؟

منورما۔ اور نہیں کیا۔ میں اس دن رات کو بہت دیر تک وہیں تھی۔ ہرش پور کے راجکمار آئے ہوئے تھے۔ انھیں کے ساتھ گئی ہیں۔

چکردھر۔ خیر ہوگا۔ تم نے آج کیا کام کیا ہے۔ لاؤ دیکھوں۔

منورما۔ ایک چھوٹا سا مضمون لکھا ہے۔ پر آپ کو دکھاتے شرم آتی ہے۔

چکردھر۔ تمھارے مضمون بہت اچھے ہیں۔ شرم کی کیا بات ہے؟

منورما نے جھجکتے ہوئے اپنا مضمون ان کے سامنے رکھ دیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ چکردھر نے مضمون پڑھا تو دنگ رہ گئے۔ عنوان تھا "ثروت کے مزے"۔ وہ کیا ہیں۔ منورما نے اسی سوال کا جواب دیا تھا۔ ثروت کا مدعا ہے زمانہ پر فتح پانا۔ زبان خلق پر فتح پانا۔ اور اپنی ضمیر پر فتح پانا۔ مضمون میں انھیں تینوں دعووں کی تشریح کی گئی تھی۔ چکردھر ان خیالات کی جدت پر متحیر ہوگئے۔ پر اس کے ساتھ ہی انھیں اس کی بے باکی پر افسوس بھی ہوا۔ ایسے خیالات مضحکہ اڑانے میں تو کارآمد ہوسکتے تھے لیکن ایک سنجیدہ تحریر میں زیب نہ دیتے تھے۔ انھوں نے مضمون ختم کرکے رکھا ہی تھا کہ منورما لوٹ آئی اور بولی۔ ہاتھ جوڑتی ہوں بابو جی! اس مضمون کے متعلق مجھ سے کچھ نہ پوچھیے گا۔ میں اس خوف سے چلی گئی تھی۔

چکردھر۔ پوچھنا تو بہت کچھ تھا۔ لیکن تمھاری منشا نہیں ہے۔ اس لیے نہ پوچھوں گا۔

صرف اتنا بتلادو۔ یہ خیالات تمھارے دل میں کیوں کر پیدا ہوئے۔ ثروت کا ماحاصل تن پروری نہیں ہے۔ یہ تو اس کا بے جا استعال ہے۔

منورما۔ آپ جو سمجھیے۔

تم نے کیا سمجھ کر لکھا ہے؟

منورما۔ جو کچھ آنکھوں نے دیکھا وہ لکھا۔

یہ کہہ کر منورما نے وہ مضمون اٹھالیا۔ اسے پھاڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ جب وہ پھر اپنی جگہ پر آبیٹھی۔ تو چکردھر نے کہا۔ تمھارے دل میں ایسے فاسد خیالات کو جاگزین ہوتے دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔

منورما نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ اب میں ایسا مضمون کبھی نہ لکھوں گی۔

چکردھر۔ لکھنے کی بات نہیں ہے تمھارے دل میں ایسے خیالات آنے ہی نہ چاہئیں۔ زمانہ پر ہم فتح پاتے ہیں۔ کار خیر سے۔ رفاہ عام سے یہی بقائے دوام کا راز ہے۔ زمانہ پر فتح پانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصنوعی ذرائع سے نفس پروری کا حظ اٹھائیں۔ زبان خلق پر فتح پانے کا مطلب بے شرمی یا سیہ کاری نہیں۔ بلکہ خواہشات کو زیر کرنا اور نفس کی سرکشیوں کو روکنا۔ یہ میں نہیں کہتا کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ ان کی اصلیت ہی انھیں اس قدر مکروہ بنادیتی ہے اگر ہم واقعات کو ہی نصب العین مان لیں تو زندگی ایک بار ہوجائے۔

منورما۔ اب اس کی تشریح کرکے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔

چکردھر۔ تمھیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں۔ تمھاری تفریح کے لیے اس کی کچھ اور تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ ثروت کے مزوں میں جو بات سب سے دلچسپ تھی۔ وہ تو تم نے چھوڑ ہی دی۔ وہ ہے حافظے کا کمزور ہوجانا۔ ثروت پاتے ہی ہم ایام گذشتہ کو بھول جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے پرانے ہم جولیوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایسا بھول جاتے ہیں۔ گویا انھیں کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ میرے جتنے امیر دوست تھے۔ وہ سب بھول گئے۔ کبھی سلام کرتا ہوں تو ہاتھ تک نہیں اٹھاتے۔ ثروت میں یہ خاص وصف ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے

بعد تمھیں مجھے نہ بھول جاؤ گی۔
منورما۔ میں آپ کو بھول جاؤں گی! غیر ممکن۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورو جنم میں بھی میرا اور آپ کا کسی نہ کسی صورت میں ساتھ تھا۔ میں جب کبھی کوئی بات سوچتی ہوں۔ تو آپ اس میں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ اگر ثروت پاکر آپ کو بھول جانے کا امکان ہو تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھوں۔
چکردھر نے مسکراکر کہا۔ جب دل ایسا ہی رہے تب تو۔
منورما۔ ایسا ہی رہے گا۔ دیکھ لیجیے گا۔ میں مرکر بھی آپ کو نہیں بھول سکتی۔
اتنے میں ہری سیوک سنگھ آکر بیٹھ گئے۔ آج وہ بہت خوش معلوم ہوئے تھے۔ بولے آپ نے کل مہاراجہ صاحبہ کے یہاں جشن کا انتظام جتنی خوبصورتی سے کیا۔ اس پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مہاراجہ صاحب بڑے ہی خلیق اور بامروت آدمی ہیں۔ اب تک تو میں ان سے خواہ مخواہ بدظن تھا۔ آپ سے تو بالکل یارانہ معلوم ہوتا ہے۔
چکردھر۔ جی ہاں! ابھی تک تو مجھ پر عنایت کرتے ہیں۔
ہری سیوک۔ مہاراج کو ایک پرائیویٹ سیکریٹری کی ضرورت ہے۔ آپ چاہیں تو وہ جگہ آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ کے ہوجانے سے مجھے بڑی تقویت ہوجائے گی۔ کہیے تو ذکر کروں؟
چکردھر۔ جی نہیں۔ ایک تو میرا ارادہ ابھی ملازمت کرنے کا نہیں ہے۔ پھر میں اپنے میں قابلیت نہیں پاتا۔
ہری سیوک۔ اس جگہ پر بیٹھتے ہی کام خود بخود آجائے گا۔ اس مہینہ سے آپ کو میرے یہاں سے ۵۰ روپے ماہوار ملیں گے۔ حالانکہ میں اسے آپ کی لیاقت کے اعتبار سے کم سمجھتا ہوں۔
اسی وقت لونگی بھی آن پہنچی۔ کہی بدی بات تھی۔ اس نے دیوان صاحب کی تائید کی۔ بڑا اچھا سجھاؤ ہے۔ کیوں بیٹا! تم یہ نوکری کیوں نہیں کرلیتے؟
چکردھر۔ جتنا آپ دیتی ہیں۔ وہ میرے لیے کافی ہے۔
ہری سیوک۔ ان کے خیالات بڑے اونچے ہیں۔ دنیا کے جھنجھٹوں میں نہیں پھنسنا

چاہتے۔

یوں باتیں کرکے دونوں اندر چلے گئے۔ منورما سر جھکائے یہ باتیں سن رہی تھی اور کسی نامعلوم خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ کسی آدمی کو اپنے جبلی عادات کے خلاف حرکت کرتے دیکھ کر شبہ ہونالازمی امر ہے۔ جس نے آج تک کسی کو پوری تنخواہ نہیں دی وہ آج ترقی کیوں کررہا ہے۔ بیشک ! اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے۔

یکایک گروسیوک سنگھ شکاری کپڑے پہنے کندھے پر بندوق رکھے اندر سے نکل آئے اور بولے۔ دادا تو آج آپ سے بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔

چکردھر۔ یہ ان کی عنایت ہے۔

ہری سیوک۔ عنایت کے فریب میں نہ آیئے گا ان کا مارا پانی بھی نہیں مانگتا۔ اور یہ چڑیل کیسا ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔

چکردھر نے مسکراکر کہا۔ ابھی ان سے آپ کا میل نہیں ہوا۔

گروسیوک۔ میل ! مرجائے تو کندھا تک نہ دوں۔ دادا کو تواس نے بدھو بنا چھوڑا ہے۔ دادا جی وار کرتے ہیں۔ یہ زخم پر مرہم رکھتی ہے۔ آدمی دھوکے میں آکر سمجھتا ہے۔ یہ لطف وکرم کی دیوی ہے۔ وہ کیا جانے کہ وہ آگ لگانے والی ہے۔ اور بجھانے والی بھی۔ اس کی سیرت سمجھنے کے لیے کسی ماہر نفسیات کی ضرورت ہے۔ چکردھر نے آسمان کی طرف دیکھا تو گھٹا گھرآئی تھی۔ اٹھ کر بولے۔ آپ اس فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

جب وہ چلے گئے۔ تو گروسیوک نے منورما سے کہا۔ یہ حضرت بھی مجھے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ زاہدوں سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ جسے خدمت اور قربانی کا راگ الاپتے دیکھو۔ سمجھ جاؤ کہ یا تواس کے لیے انگور کھٹے ہیں۔ یا وہ یہ سوانگ رچ کر دنیا کو دھوکادینا چاہتے ہیں۔

منورما۔ آپ کو ان کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مہاراجہ صاحب انھیں پرائیویٹ سیکریٹری بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ منظور نہیں کرتے۔

گروسیوک۔ سچ؟

منورما۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اس کی دس گنی تنخواہ ملے۔ تو بھی وہ اسے منظور نہ

کریں گے۔
گروسیوک۔ مجھے وہ جگہ مل جائے تو کیا کہنا۔
منورما۔ کیا دیہات کا سدھار نہ کیجیے گا؟
گروسیوک۔ یہ جگہ پاکر مجھے خدمت کے جتنے موقعے مل سکتے ہیں۔ اتنے آزاد رہ کر نہیں مل سکتے۔ کوشش کر کے دیکھوں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں۔ بادلوں کی فوج اڈی چلی آتی تھی۔ منورما کھڑکی کے سامنے کھڑی آسمان کی طرف خائف نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بابو جی ضرور بھیگ جائیں گے۔

(13)

مدت کے بعد جگدیش پور کے بھاگ جاگے۔ برسات ختم ہوتے ہی محلوں کی مرمت ہونے لگی۔ رانیاں جگدیش پور پہنچادیں گئیں۔ کنور صاحب نے شہر میں رہنا ہی مناسب سمجھا۔ انھیں اب رانیوں سے چڑھ سی ہوگئی تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے کبھی وہاں چلے جاتے تو سارا وقت خانگی قضیوں میں ہی صرف ہوجاتا تھا۔ رانیوں میں بم چخ تو پہلے سے مچی رہتی تھی اب اور بھی شمشیر برہنہ ہوگئی تھیں۔

کنور صاحب نے تاکید کردی ہے کہ عایا پر ذرا بھی سختی نہ ہونے پائے۔ ان کے پاس اگر کوئی شکایت پہنچتی۔ تو شاید عملوں کو پھاڑ کھاتے۔ لیکن رعایا فرمانبردار ہوتی ہے اور جب تک پیانہ لبریز نہ ہوجائے۔ حرفِ شکایات زبان پر نہیں لاتی۔ پھر گدی کے جشن کے لیے تھوڑی سی سختی لازی سمجھ کر اور بھی کوئی نہ بولتا تھا۔ اپنا کام تو بارھویں ماس کرتے ہی ہیں۔ مالک کی بھی تو کچھ خدمت کرنی چاہیے۔

تین مہینے تک ساری ریاست کے بڑھئی۔ لوہار۔ درزی۔ چمار۔ کہار۔ کمہار سبھی دل توڑ کر کام کرتے رہے۔ چکردھر کوروز رعایا پر بے جاستم کی شکایتیں ملتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ راجہ صاحب سے کچھ کہہ کر نہیں پریشان نہ کرنا چاہتے تھے۔ محل کی درستی بھی ہوگئی اور گدی کے جشن کے لیے پنڈال بھی تیار ہوگیا تھا۔ سارے قصبے میں صفائی اور سجاوٹ نظر آرہی ہے۔ ملازموں کی وردیاں بنوادی گئی ہیں۔ صوبے کے رؤسا وامرا کے نام دعوتی خطوط بھیج دیے گئے ہیں۔ بسنت کی رت ہے اور چاروں

طرف بسنت کی بہار نظر آتی ہے۔ محل بسنتی رنگ سے پوتا گیا ہے۔ پنڈال بھی بسنتی ہے۔ مہمانوں کے خیمے بھی بسنتی ہیں۔ ملازموں کی وردیاں بھی بسنتی۔ دو میل کے رقبہ میں گویا بسنت کی عملداری تھی۔

لیکن اب تک بہت کچھ کام بیگار سے چل گیا ہے۔ مزدوروں کو صرف کھانا کھلایا گیا ہے اب نقد کی ضرورت آپڑی ہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت اور احکام کی تواضع وتکریم تو بیگار میں نہیں ہوسکتی۔ کلکتہ سے تھیٹر کی کمپنی لائی گئی ہے۔ برندابن سے راس لیلا منڈلی آرہی ہے۔ خرچ کا تخمینہ پانچ لاکھ سے زیادہ ہے۔ سوال ہے روپے کہاں سے آویں۔ آسامیوں سے چھ ماہی لگان پہلے ہی وصول کیا جاچکا ہے۔ تاریخ سر پر آتی جاتی ہے۔ پر روپیہ کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا ہے۔

شام کا وقت ہے۔ کنور صاحب استاد مینڈو خاں کے ساتھ بیٹھے ستار کی مشق کررہے ہیں۔ ثروت پاکر انھوں نے بھی ایک شوق پالا ہے۔ ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں دولت پاکر متوالا ہوگیا۔ چھوٹے بڑے سبھی سے اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ دیوان صاحب اور منشی جی آکر کھڑے ہوگئے۔

کنور صاحب نے پوچھا۔ کوئی ضروری کام ہے۔

دیوان صاحب نے منشی جی کی طرف دیکھا۔ منشی جی نے دیوان صاحب کی طرف۔ کون اس سوال کا جواب دے۔

منشی۔ جو کچھ کہنا ہے کہیے۔ انتظام کے معاملے میں پس وپیش کی کیا ضرورت۔ حضور ابھی تک روپے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ اگر ارشاد ہو۔ تو کسی بنک سے قرض لیا جائے۔

راجہ صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ہرگز نہیں۔ جب میں نے اس وقت قرض نہیں لیا جب کوڑی کوڑی کو محتاج تھا۔ تو اب نہ لوں گا۔

خزانہ میں کچھ بیش قیمت جواہرات تھے۔ راجہ صاحب کی یہ صلاح ہوئی۔ انھیں فروخت کردیا جائے مگر منشی کو یہ صلاح پسند نہ آئی۔ ریاست کی کتنی بڑی بدنامی ہوگی۔

دیوان صاحب نے کہا میری تو رائے یہ ہے کہ اسامیوں سے ہل پیچھے دس روپے وصول کرلیے جائیں۔

راجہ۔ ہرگز نہیں۔ اس سے یہ کہیں اچھا ہے کہ یہ تقریب ہی نہ منائی جائے۔

دیوان صاحب نے منشی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ریاستوں میں یہ پرانا رواج ہے۔ منشی جی نے تائید کی۔ سب کے سب شوق سے دیں گے صاحب!

راجہ۔ گدی پر میں بیٹھ رہاہوں۔ اس کے لیے اسامیوں پر کیوں جبر کیا جائے۔ آخر میں کس منہ سے ان سے روپے مانگوں؟

منشی۔ حضور! اسامیوں کو جتنا غریب سمجھتے ہیں اتنے غریب نہیں ہیں۔ ایک ایک آدمی لڑکے لڑکیوں کی شادی میں ہزاروں اڑا دیتا ہے۔ دس روپے کی رقم اتنی زیادہ نہیں کہ کسی کو اکھڑ سکے۔

راجہ صاحب نے بہت دیر تک غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ یہ تجویز مجھے مطلق پسند نہیں۔ لیکن اگر آپ لوگوں کا خیال ہے کہ اسامیوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تو آپ اپنی ذمہ داری پر یہ کام کر سکتے ہیں۔ مگر میرے کانوں تک کوئی شکایت نہ آئے۔

کھونٹے کی نوک سخت زمین میں دھنس گئی تھی۔ اب محض اس پر چند ضربوں کی اور ضرورت تھی شکایت کیسے نہ آئے گی۔ اسامیوں کو تو شکایت کرنے کا مرض ہے۔ رونا توان کی گھٹی میں پڑ گیا ہے۔ ریاست کا کوئی ملازم علاقہ میں جاپڑتا ہے تو اسے اوپلے تک نہیں ملتے۔ اور کوئی مکار جٹا بڑھا کر پہنچ جاتا ہے تو مہینوں اس کی خاطر ہوتی ہے۔ راجہ اور پرجا کا تعلق ہی ایسا ہے۔

منشی جی بولے۔ جب حضور نے کہہ دیا کہ آپ اپنی ذمہ داری پر وصول کر سکتے ہیں تو اب کیابات رہ گئی۔ ہماری انگریزی سرکار کو ہی دیکھیے۔ حکام عالی مقام کتنی ملائمت سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ماتحت خوب جانتے ہیں کہ کسی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مینڈوخاں! بس یہی سمجھ لو کہ نہال ہوجاؤ گے۔

راجہ۔ بس اتنا خیال رکھیے کہ کسی پر سختی نہ ہونے پائے۔

منشی۔ حضور کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اگر حضور سختی کریں گے تو ان غریبوں کے آنسو کون پونچھے گا۔ سورج جلاتا بھی ہے اور روشنی بھی دیتا ہے۔ جلانے والے ہم ہیں۔ روشنی دینے والے آپ ہیں۔ شکریہ کاحق آپ کا ہے۔ گالیوں کاحق ہمارا

چلیے دیوان صاحب اب آپ کو ستار کا شوق کرنے دیجیے۔

دونوں آدمی باہر نکلے تو دیوان صاحب نے کہا۔ ایسا نہ ہو کہ شور وغل مچے۔ تو ہماری جان آفت میں پھنسے۔

منشی جی بولے۔ جناب! یہ سب بگلا بھگت پن ہے میں تو رُخ پہچانتا ہوں۔ جس سے آپ دس روپے اینٹھ لیں گے۔ کیا وہ خوشی سے دے دے گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ دھڑے روپے وصول کیجیے! کسی راجہ نے آج تک یہ نہ کہاہوگا کہ رعایا کو ستاکر روپے وصول کیجیے! لیکن چندے جب وصول ہونے لگتے ہیں اور شور مچتا ہے تو کوئی ملازموں کو تنبیہ نہیں کرتا۔ یہی ہمیشہ سے ہوتا آتا ہے اور یہی اب بھی ہوگا۔

حکم ملنے کی دیر تھی۔ عملوں کے ہاتھ تو کھجلا ہی رہے تھے۔ وصولی کا حکم صادر ہو گیا۔ تو باغ باغ ہوگئے۔ پھر تو وہ اندھیر مچا کر سارے علاقے میں کہرام پڑ گیا۔ رعایا نے کنور صاحب سے دوسری ہی اُمیدیں باندھ رکھی تھیں۔ اس لیے ان کے غصے میں مایوسی کا جز بھی شامل تھا۔ چکردھر بھی سمجھ گئے کہ کنور صاحب پر ثروت کا جادو چڑھ گیا۔ چاروں طرف نوچ کھسوٹ ہورہی تھی۔ کسی کے بیل کھول لیے جاتے تھے کسی کی گائے چھین لی جاتی تھی۔ کتنوں ہی کی کھیت کٹوا لیے گئے۔ جس نے خوشی سے دے دیے اس کاتواس میں ہی گلا چھوٹ گیا۔ جس نے حیلے حوالے کیے یا سرکشی جتائی اُسے دس کے بدلے بیس تیس چالیس دینے پڑے۔ آخر مجبور ہوکر ایک دن چکردھر کو راجہ صاحب سے شکایت کرنی ہی پڑی۔

راجہ صاحب نے تیوری بدل کرکہا۔ میرے پاس تو آج تک کوئی اسامی فریاد کرنے نہیں آیا۔ پھر آپ کیوں وکالت کررہے ہیں؟

چکردھر۔ اسامیوں کی فطرت سے تو آپ واقف ہیں۔ انھیں آپ سے شکایت کرنے کا کیوں کر حوصلہ ہوسکتا ہے۔

راجہ۔ یہ میں نہیں مانتا کہ اسامی بالکل بے زبان ہوتے ہیں۔ جس کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے وہ ہائے ہائے کرتا ہی ہے۔ اگر وہ نہ روئے تو سمجھ لو اسے تکلیف نہیں ہے۔ یاہے تو بہت کم!

چکردھر نے مایوسانہ انداز سے پوچھا تو آپ سے انصاف کی کوئی امید نہ

رکھوں؟

راجہ نے امارت کی شان سے کہا۔ میں اپنے معتمدوں سے کوئی الگ چیز نہیں ہوئی۔

چکردھر نے اس معاملے میں راجہ صاحب سے اور کچھ کہنا فضول سمجھا۔ منشی جی یا دیوان صاحب سے کچھ کہنا اندھے کے آگے رونا تھا۔ غصہ تو ایسا آیا کہ اسی وقت جگدیش پور جاؤں اور اسامیوں سے کہہ دوں۔ تم لوگ گھر جاؤ۔ دیکھوں یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ پر راجہ صاحب کی بدنامی کا خیال مانع ہوگیا۔

وہ ابھی محل میں ہی تھے کہ منشی جی اپنا پرانا تحصیلداری کے زمانے کا اوور کوٹ ڈالے موٹرکار سے اترے اور انھیں دیکھ کر بولے۔ تم یہاں آکر یوں ہی لوٹ جاتے ہو۔ اپنے لیے کچھ کہا نہیں۔

چکردھر۔ اپنے لیے کہنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ آج کل تو علاقہ میں بڑا اندھیر مچا ہوا ہے۔

منشی جی نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ یہ سب تمھاری سیوا سمتی والوں کی شرارت ہے۔ انھیں لوگوں کی شہ پاکر اسامی بھی شیر ہوگئے ہیں۔ ورنہ کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کرتا۔

چکردھر۔ ہم لوگ تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ رعایا پر سختی نہ کی جائے اور کنور صاحب نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر یہ ماردھاڑ کیوں ہو رہی ہے۔

بجردھر۔ اسی لیے اسامیوں سے کہہ دیا گیا ہے۔ راجہ صاحب کسی پر جبر نہیں کرنا چاہیے جس کی مرضی ہو دے جس کی مرضی ہو نہ دے۔ تم اپنے آدمیوں کو بلالو۔ پھر دیکھو۔ کتنی آسانی سے روپے وصول ہوجاتے ہیں۔ نشے کا جوش طاقت نہیں ہے۔ طاقت وہ ہے جو اپنے جسم میں ہو۔ جب تک رعایا خود نہ سنبھلے گی کوئی اسے جو روستم سے نہیں بچاسکتا۔ تم کہاں کہاں ان پر ہاتھ رکھتے پھروگے۔ چوکیدار سے لے کر بڑے سے بڑے حکام تک سبھی ان کا خون چوستے ہیں۔ سبھی ان کی جان کے گاہک ہیں۔ ہم نے چھوڑ بھی دیا تو کیا۔ ان کی تقدیر میں تو ٹھوکر کھانا لکھا ہے۔ تم آج ہی اپنے والنیٹروں کو بلالو۔ ریاست

کے ملازم ان سے بے طرح بگڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی فساد ہوجائے۔

چکردھر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کچھ فیصلہ ہی نہ کرسکے۔ اسی دُبدھے میں پڑے ہوئے منورما کے یہاں چلے گئے۔

منورما نے انھیں اداس ہوکر پوچھا۔ آج آپ بہت متفکر نظر آتے ہیں۔ گھر میں تو سب خیریت ہے؟

چکردھر ہاں کوئی بات نہیں۔ لاؤ دیکھوں۔ تم نے آج کیا کام کیا ہے؟

منورما۔ آپ مجھ سے چھپارہے ہیں۔ آپ جب تک بتلا نہ دیں گے۔ میں کچھ نہ پڑھوں گی۔ آپ اتنے دلگیر کبھی نہ رہتے تھے۔

چکردھر نے رنجیدہ خاطر ہوکر کہا۔ کیا کروں منورما۔ اپنی حالت دیکھ کر کبھی رونا آجاتا ہے۔ سارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم اپنے بھائیوں کی گردن پر چھری پھیرنے سے باز نہیں آتے۔ جس سے جنگ کرنا چاہیے اس کے تو توے چاٹتے ہیں۔ جن سے ہمدردی کرنی چاہیے۔ ان کی گردن دباتے ہیں۔ اور یہ سارا ظلم ہمارے تعلیم یافتہ بھائی کررہے ہیں۔ جسے تھوڑا سااختیار مل گیا۔ وہ فرعون بن جاتا ہے علم سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ پر مرض جب لاعلاج ہوتا ہے تو تریاق بھی زہر کا کام کرتا ہے۔ راجہ صاحب سے لوگوں کو کتنی اُمیدیں تھیں پر انھوں نے وہی پرانی روش اختیار کی۔ جشن کے لیے ڈنڈے کے زور سے روپے وصول کیے جارہے ہیں۔ اور کوئی فریاد نہیں سنتا۔ سب سے زیادہ رونا تو اس بات کا ہے کہ سارا ظلم دیوان صاحب اور دادا جی کے ہاتھوں ہورہاہے۔

دل پُردرد ظلم وستم کا ذکر سن کر گرم ہوجاتا ہے۔ منورما نے جوش کے ساتھ کہا آپ اسامیوں کو منع کیوں نہیں کردیتے کہ کسی کو ایک کوڑی بھی نہ دیں۔

چکردھر کوہنسی آگئی۔ بولے۔ تم میری جگہ ہوتیں تو اسامیوں کو منع کردیتیں؟

منورما۔ بیشک۔ اعلانیہ کہتی۔ خبردار! راجہ کے آدمیوں کو کوئی ایک پیسہ بھی نہ دے میں تو راجہ کے آدمیوں کو اتنا پٹواتی کہ علاقہ میں پھر جانے کانام بھی نہ لیتے۔

چکردھر نے پھر ہنس کر کہا۔ اور دیوان صاحب سے کیا کہتیں؟

منورما۔ ان سے بھی یہی کہتی کہ آپ سیدھے گھر چلے جائیے۔ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔

آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ لی خدمت کروں گی۔ جوانمرد تو جب جانوں جب زورداروں سے ہاتھ ملایئے۔ ابھی ایک انگریز آجائے تو دم دبا کر بھاگیں گے۔ اس وقت زبان بھی نہ کھلے گی۔ بچارے غریبوں کو ستاتے پھرتے ہیں۔ اسے حکومت نہیں کہتے۔ یہ مردے اور گدھ کا تماشا ہے۔

چکردھر نے روحانی مسرت کا احساس کرکے کہا۔ اگر دیوان صاحب خفا ہوجاتے؟

منورما۔ خفا ہوجاتے کسی کے خفا ہونے کے خوف سے حق پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اگر وہ آج آگئے تو میں آج ہی کہوں گی۔

چکردھر آج پڑھا کر چلے۔ تو ان کے دل میں سوال پیدا ہورہا تھا۔ کیا اب میرا یہاں آنا مناسب ہے؟ ا نھوں نے حقیقت کی روشنی میں اپنے باطن کو دیکھا تو وہاں کتنے ہی ایسے جذبات روپوش تھے۔ جنھیں وہاں نہ رہنا چاہیے تھا۔ مرض جب تک تکلیف دہ نہ ہوجائے ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بچوں کی گالیاں ہنسی میں اڑ جاتی ہیں۔ لیکن بالغوں کی گالیاں کون سہے گا۔ اس انکشاف نے چکردھر کے سامنے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیش کردیا۔

(14)

گدی کے کئی دن قبل ہی سے مہمان آنے شروع ہوگئے۔ کیمپ ہی میں بازار لگوا دیا گیا تھا۔ وہیں رسد پانی کا بھی انتظام تھا۔

بڑے بڑے راجہ آئے تھے۔ کوئی چنے ہوئے اراکین کے ساتھ۔ کوئی لاؤلشکر لیے ہوئے کہیں اددی وردیوں کی بہار تھی۔ تو کہیں کیسر پنے بانے کی کوئی مرصع زیورات سے آراستہ۔ کوئی انگریزی سوٹ سے لیس۔ کوئی اتنا عالم کہ علما میں باعثِ افتخار۔ کوئی اتنا جاہل کہ جہلا میں طرۂ امتیاز۔ کوئی دو بجے رات کو سوکر اٹھتا تھا۔ کوئی دو بجے دن کو۔ کتنے حضرات ایسے بھی تھے جن کا بیشتر وقت انگریزی کیمپ کا چکر لگانے میں صرف ہوتا تھا۔ دوچار حریت پسند بھی تھے۔ چکردھر اور ان کے رفقا ان لوگوں کی خاطر ومدارت میں خاص اہتمام کرتے تھے۔ مگر جاہل یا عالم۔ حریت کے دلدادہ یا

ملوکیت پسند، کبھی اپنے کو برگزیدگان خدا سمجھتے تھے۔ کبھی غرور کے نشے سے متوالے کبھی نفس پروری میں ڈوبے ہوئے ایک بھی صاحب دل نہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں جس میں اخلاقی قوت ہو۔ اصول پروری ہو یا قومی آن ہو۔

ان کی نخوت اور خود پروری قدم قدم پر اتنا جلوہ دکھاتی تھی۔ فلاں نے تقدیم کیوں کی؟ اسے میرے پیچھے چلنا چاہیے۔ ان کے مورث ہمارے بزرگوں کے خراج گذار تھے۔ سلام وکلام میں تواضع وتکریم میں، دعوت اور محفل میں یہی افتراق اور مغایت رونما ہوتی رہتی تھی۔ راجہ بشال سنگھ اور ان کے ملازموں کا بہت سا وقت ان حضرات کی دلجوئی میں صرف ہوجاتا تھا۔ فتنہ وفساد کا خوف ہردم اُن پر غالب رہتا تھا۔ مہمانوں سے تو کانپتے رہتے تھے۔ پر اپنے آدمیوں پر ذرا ذرا سی بات پر جھلا اٹھتے تھے۔ اور جو کچھ منہ میں آتا بک جاتے تھے۔

اگر سکون تھا تو انگریزی کیمپ میں۔ نہ نوکروں کی تکرار تھی۔ نہ بازار والوں سے جوتی پیزار سب کی چائے کا ایک وقت۔ ڈنر کا ایک وقت۔ آرام کا ایک وقت۔ تفریح کا ایک وقت۔ سب ایک ساتھ کھاتے ایک ساتھ سیر کرتے۔ ایک ساتھ تھیٹر دیکھتے۔ نہ باہر گندگی تھی نہ اندر کدورت۔ راجاؤں کے کیمپ میں غلامی تھی۔ انگریزی کمپ میں آزادی۔ آزادی۔ اوصاف حسنہ کی حامل ہے۔ غلامی سفلہ پن کی۔

اُدھر نواس میں بھی خوب جمگھٹ تھا۔ کوئی پارسی پہناوے میں کوئی انگریزی وضع میں۔ کوئی ٹھیٹھ سودیشی ٹھاٹ میں۔ نویلیوں کو نمائش کی دُھن تھی۔ سن رسیدوں کو چشمک وانگشت نمائی کی۔ انگریزی فیشن والیاں اوروں کو گنوار سمجھتی تھیں۔ اور گنوارنیں انھیں بے شرم وبے حیا کہتی تھیں۔ طرہ یہ کہ یہ سرگوشیاں آپس ہی تک محدود نہ تھیں۔ کنیزوں اور خواصوں کو بلاتکلف اس میں شریک کرلیا جاتا تھا۔ منورما کو ان کی خاطر وتعظیم کی خدمت سپرد تھی۔ پر اُسے اُن سے نفرت ہوتی تھی۔ ہاں جب وہ رانی رام پریا کو بیٹھے دیکھتی تو ان کے پاس جا بیٹھتی۔ اتنے سنگریزوں میں اُسے وہی ایک رتن نظر آتا تھا۔

مہمانوں کی تو یہ آؤ بھگت تھی اور وہ مزدور جو چھاتی پھاڑ کر کام کرتے تھے۔ بھوکوں مرتے تھے۔ کوئی ان کی خبر نہ لیتا تھا۔ کام لینے کو سب تھے۔ کھانے کو پوچھنے

والا کوئی نہیں۔ چمار پہر رات سے گھاس کھودنے جاتے۔ مہتر پہر رات سے صفائی کرنے لگتے۔ کہار پہر رات سے پانی کھینچنا شروع کرتے۔ مگر کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ چپراسی انھیں بات بات پر گالیاں سناتے۔ کیوں کہ انھیں خود بات بات پر پھٹکار ملتی تھی۔ چپراسی برداشت کرلیتے تھے۔ کیونکہ انھیں دوسروں پر اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بیگاروں سے نہ سہاجاتا تھا۔ کیونکہ ان کی آنتیں جلتی تھیں۔ دن بھر دھوپ میں جلتے۔ رات بھر بھوک کی آگ میں رانی کے زمانے میں بیگار اس سے بھی زیادہ لی جاتی تھی۔ لیکن رانی انھیں کھلانے پلانے کا خیال رکھتی تھیں۔ بیچارے اُن دنوں کو یاد کرکے روتے تھے۔ کیا سوچتے تھے۔ اور کیا ہوا۔ بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ نہ جانے کب بارود میں آگ لگ جائے؟

شام کا وقت تھا۔ ٹیکے کی مہورت قریب تھی کہ یکایک مزدوروں کے باڑے سے گریہ زاری کی صدائیں آنے لگیں۔ کسی کیمپ میں گھاس نہ تھی اور دیوان صاحب ہنٹر لیے ہوئے چماروں کو پیٹ رہے تھے۔ کتناغضب ہے۔ سارا دن گذر گیا اور ابھی تک کیمپ میں گھاس نہیں پہنچی۔ ایسے بدمعاشوں کوگولی مار دینی چاہیے۔

ایک چمار بولا۔ مالک آپ کو اکھتیار ہے۔ مار ڈالیے۔ مُدا پیٹ باندھ کر کام نہیں ہوتا۔

چماروں کے چودھری نے دست بستہ التماس کی۔ ہجور آدھے آدمی توماندے پڑے ہیں۔ کیا کروں؟

منشی بجردھر نے فرمایا۔ جھوٹ بولتا ہے۔ سُور "ڈیم فول"۔ بلاڈی ریسکل۔ شیطان کا بچہ۔ ابھی پولو ہوگا۔ گھوڑے بلاگھاس کیسے دوڑیں گے؟

ایک نوجوان نے کہا۔ ہم لوگ بلاگھاس آٹھ دن سے گھاس دے رہے ہیں۔ کیا گھوڑے بنا کھائے ایک دن بھی نہ دوڑیں گے۔

چودھری ڈنڈا لے کر اس گستاخ کو مارنے دوڑا۔ پر اس کے پہلے ہی دیوان صاحب نے جھپٹ کر اُسے چار پانچ ہنٹر سڑاپ سڑاپ لگادیے۔ برہنہ جسم۔ جلد کٹ گئی اور خون بہ نکلا۔

چودھری نے دیوان صاحب اور نوجوان کے درمیان کھڑے ہوکر کہا۔ ہجور! کیا

مار ہی ڈالوگے۔ لڑکا ہے۔ کچھ جا بے منہ سے نکل جائے تو ماپھ کرنا چاہیے۔ راجہ کو دیاوان ہونا چاہیے۔

ایک چمار کا یہ حوصلہ کہ ان کے سامنے زبان کھولے۔ وہی ہنٹر تان کر چودھری کو جمادیا۔ بوڑھا آدمی تھا۔ اُس پر کئی دن کا بھوکا۔ ہنٹر پڑتے ہی گر پڑا۔ باڑے میں ہلچل مچ پڑگئی۔ کتنے ہی چماروں نے مارے خوف کے کھرپی اور رسّی اٹھالی تھی اور گھاس چھیلنے جارہے تھے۔ چودھری کو ہنٹر کھاکے گرتے دیکھا۔ تو رسّی کھرپی پھینک دی اور آکر چودھری کو اٹھانے لگے۔

ٹھاکرے صاحب نے تڑپ کر کہا۔ سب کے سب جاکر ایک گھنٹہ کے اندر لاؤ۔ ورنہ ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔

ایک چمار بولا۔ یہاں کام کرنے آئے ہیں۔ جان نہیں دینے آئے ہیں۔ جس سے چاہے۔ کام کرائیے۔ ہم گھر جاتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب ہنٹر پھٹکار کر بولے۔ سرکاری کام کو ہنسی کھیل سمجھ لیا ہے۔ گانوں میں گھسنے بھی نہ پاؤ گے۔

"سرکار اپنا گاؤں لے لو۔ ہم چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہمیں اب اِس راج میں نہیں رہنا ہے"۔

منشی جی نے تحصیلداری کی شان سے کہا۔ جس نے باڑے کے باہر قدم رکھا اس کی شامت آئی۔ توپ پر اڑادوں گا۔

لیکن چماروں کے سر بھوت سوار تھا۔ بوڑھے چودھری کو اٹھاکر سب کے سب باڑے کے دروازہ کی طرف چلے۔ ادھر سپاہیوں نے آکر دروازہ روک لیا۔ کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ سبھی سنگین چڑھائے تیار تھے کہ حکم ملے اور اپنی شجاعت کے جوہر دکھائیں۔ راجہ صاحب نے یہ خبر سنی تو تلملائے۔ اپنی دانست میں وہ بڑے ہی رعایا پرور تھے۔ ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے دیتے تھے۔ جب وہ رعایا پر جان دیتے تھے۔ تو کیا رعایا کا ان کے ساتھ کوئی فرض نہ تھا۔ اور پھر اس موقعہ پر جو لوگ اتنے احسان فراموش ہیں۔ وہ اسی قابل ہیں کہ ان کے ساتھ خوب سختی کی جائے۔ انصاف پروری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک میں سچا درد ہوتا ہے۔ دوسری میں نمائش۔ راجہ صاحب

کی رعایا پروری اسی دوسری قسم کی تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ ان کے عدل وانصاف کی خوب شہرت ہو۔ اور یہاں اس مبارک موقعہ پر اتنے فرماں رواؤں کے روبرو یہ بدمعاش سرکشی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کی دوا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ انھیں قرار واقعی سزادی جائے۔ سچ ہے۔ سیدھے کا منہ کتے چاٹتے ہیں۔

طیش میں آکر وہ اپنی بندوق لیے ہوئے خیمہ سے نکل آئے اور کئی آدمیوں کے باڑے کے دروازے پر آپہنچے۔

چودھری اسی اثنا میں جھاڑ پھونچھ کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ راجہ صاحب کو دیکھتے ہی بولا۔ ''دُہائی ہے مہاراج کی''۔ سرکار بڑا اندھیر ہورہا ہے۔

راجہ صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا۔ چُپ رہ سُور! تم سب لاتوں کے دیوتا ہو۔ باتوں سے نہیں مان سکتے۔ میں نے تمھارے ساتھ شرافت کا برتاؤ کیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ تم نیچ ہو۔ اور نیچ لاتوں کے بغیر سیدھا نہیں ہوتا۔

چودھری کے دل میں جو شک تھا۔ اس کی تصدیق ہوگئی۔ بولا۔ تو بجور اب لات نہ کھائیں گے۔ چاہے جان رہے یا جائے۔

راجہ نے پوچھا۔ کیوں؟ اب کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔

چودھری۔ وہ جمانہ لد گیا دھرماوتار۔ اب ہماری رائے سے ممبر چنے جاتے ہیں۔ حاکم کے دربار میں ہمارے بھائی لوگ پہنچ گئے ہیں۔ کوئی ہماری فریاد نہ سنے گا؟

راجہ۔ اچھا تو اب تجھے ممبروں کا گھمنڈ ہوگیا ہے۔

چودھری۔ ہئی ہے۔ وہ ہماری رچھا کرتے ہیں۔ تو کیوں نہ ان کا گھمنڈ کریں۔ دنیا میں ہمارا جنم اسی لیے نہیں ہوا ہے کہ بھوکوں مریں۔ اور سب کی لاتیں کھائیں۔

باڑے میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مسلح سپاہیوں کی صورت دیکھ کر جن کا خون سرد ہوجاتا تھا۔ وہ اس وقت بندوقوں کے سامنے مرنے کو تیار کھڑے تھے آخر دروازے سے نکلنے کا راستہ بند پاکر کچھ آدمیوں نے باڑ کی لکڑیاں اور رسیاں کاٹ ڈالیں اور ہزاروں آدمی یلغاریں مار مار کر نکل پڑے۔ گویا اُمڈی ہوئی ندی بندھ توڑ کر نکل پڑے۔ اسی وقت ایک طرف سے چکردھر سیوا سمیتی کے کئی نوجوانوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ چکردھر نے اسامیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ تو کرلیا

تھا۔ پر یہاں کی خبریں سُن سُن کر اُن کے کلیجے پر سانپ لوٹتا رہتا تھا۔ ایسے نازک موقعہ پر دور کھڑے ہوکر تماشا دیکھنا انھیں شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ آج کی خبروں نے انھیں یہاں آنے کے لیے مجبور کردیا۔

انھیں دیکھتے ہی ہڑتالیوں میں جان سی پڑ گئی۔ جیسے نادان بچہ اپنی ماں کو دیکھ کر شیر ہوجاتے۔ ہزاروں آدمیوں نے انھیں گھیر لیا۔ چکردھر نے چند الفاظ میں انھیں تشفی دی۔ اور راجہ صاحب کے پاس آکر بولے۔ مہاراج اگر اجازت ہو۔ تو آپ سے کچھ عرض کروں۔

راجہ صاحب نے تیوریاں بدل کر کہا۔ میں اس وقت کچھ نہیں سننا چاہتا۔

چکردھر۔آپ کچھ نہ سنیں گے۔ تو پچھتائیں گے۔

راجہ۔ میں ان سبھوں کو گولی ماردوں گا۔

چکردھر نے پُرجوش لہجہ میں کہا۔ اس کا آپ کو اختیار ہے۔ لیکن اپنے راج کے نونہال کو رعایا کے خون سے سینچ کر آپ اس کی جڑ مضبوط نہ کریں گے۔ رعایا کا آشیرواد ہی اس جڑ کو مضبوط کرسکتا ہے۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ بہی خواہ ہوں۔ نیاز مند ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کے دل میں رعایا کے ساتھ کتنی ہمدردی اور محبت ہے۔ یہ سارا طوفان کم اندیش عمال کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ انھی کی کج فہمیوں کے باعث آج آپ ان لوگوں کے خون کے پیاسے ہورہے ہیں۔ جو آپ کے رحم اور کرم کے پیاسے ہیں۔ گولی چلاکر آپ ان کی جان لے سکتے ہیں۔ مگر رحم سے آپ ان کا دل لے سکتے ہیں۔ جو جان سے کہیں زیادہ قیمتی چیز ہے۔ تاجپوشی کا مبارک دن لطف وعنایت کی بارش کا ہے۔ خونریزی کا نہیں۔ اگر آج ایک خون بھی ہوگیا۔ تو اس کی چھینٹیں چنگاڑیوں کی طرح اُڑاُڑ کر ریاست کو ایسا مشتعل کردیں گی کہ پھر کوئی طاقت اس شعلہ کو فرونہ کرسکے گی۔

راجہ صاحب اپنی ٹیک پر اڑنا جانتے تھے۔ پر اس وقت ان کا دل کانپ اُٹھا۔ وہی انسان جو دن بھر گالیاں بکتا ہے۔ صبح کے وقت کوئی ناشائستہ لفظ منہ سے نکلنے نہیں دیتا وہی دکاندار جو دن بھرٹنی مارتا ہے۔ بُہنی کے وقت موں تول کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ مبارک اوقات جن سے زندگی کے کسی نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ہمارے

جذبات میں خلوص اور اعتقاد پیدا کردیتے ہیں۔ راجہ صاحب کچھ نرم ہوکر بولے میں خود نہیں چاہتا کہ میری جانب سے کسی فرد پر بھی ظلم کیا جائے۔ ان احمقوں کو اگر کوئی شکایت ہے تو انھیں آکر مجھ سے کرنی چاہیے تھی۔ اگر میں سماعت نہ کرتا تو انھیں اپنے فعل کا اختیار تھا۔ مگر ان لوگوں نے مجھ سے تو کہا نہیں۔ فساد کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ کسی کیمپ میں گھاس کا ایک تنکا نہیں ہے اور یہ سب بھاگے جارہے ہیں۔ میں یہ توہین نہیں برداشت کرسکتا۔

چکردھر۔آپ نے ان لوگوں کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ہی کب دیا؟ دربان انھیں دروازے سے دھتکار دیتے تھے۔ ان غریبوں کو ایک ہفتہ کوئی خوراک نہیں ملی۔

راجہ۔ ایک ہفتہ سے خوراک نہیں ملی۔ یہ آپ کہتے کیا ہیں۔ میں نے سخت تاکید کر دی تھی کہ ہر ایک مزدور کو پوری خوراک اور دونوں وقت دی جائے۔ کیوں دیوان صاحب یہ کیامعاملہ ہے؟

دیوان صاحب۔ حضور ان حضرات کے مغالطے میں نہ آئیں۔ یہ سارا کرشمہ انھیں حضرات کا ہے۔ یہاں سے ہر ایک آدمی کو دونوں وقت کھانا دیا جاتا ہے۔ منشی بجردھر نے بھی اپنے مربی کی تائید کی۔ مگر اس خوب صورتی سے کہ دیوان صاحب خوش بھی ہوجائیں اور چکردھر پر شاہی عتاب بھی نہ آئے۔ بولے۔ دین بندھو اس لڑکے میں ایک بری عادت ہے کہ دوسروں نے جو کچھ کہہ دیا۔ اسے سچ سمجھ لیتا ہے۔ چھکا پنجا تو جانتا ہی نہیں۔ تم سے کس نے کہہ دیا بیٹا! کہ آدمیوں کو کھانا نہیں ملتا تھا۔ بھنڈاری میں ہوں۔ میرے سامنے روزانہ جنس تولی جاتی تھی اور میں ہر ایک سے پوچھ پوچھ کر دیتا تھا۔ اتنی خاطر تو باراتیوں کی بھی نہیں ہوتی۔ اتنے دن تحصیلداری کی اور اتنی بات بھی نہیں جانتا کہ آدمی بغیر کھائے کام نہیں کرسکتا۔

دیوان صاحب۔ حضور! یہ لوگ رعایا سے کہتے پھرتے ہیں۔ سب آدمی برابر ہیں کسی کو تمھارے اوپر حکومت کرنے کا حق نہیں کسی کو تم سے بیگار لینے کا حق نہیں اسی لیے رعایا سرکش ہوگئی ہے۔

راجہ۔ اِن باتوں میں مجھے کوئی برائی نہیں نظر آتی۔ یہی تعلیم ہر ایک مذہبی کتاب میں دی گئی ہے۔

دیوان۔ حضور یہ لوگ کہتے ہیں۔ زمین کے مالک تم ہو۔ راجہ تمھارا غلام ہے۔

راجہ۔ بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ اِس میں تو مجھے شکایت کی کوئی بات نظر نہیں آتی ہیں۔ فی الواقع رعایا کا غلام ہوں۔ بلکہ اس کے غلام کا غلام ہوں۔

دیوان۔ حضور! ان کے ہر زہ سرائیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ کہتے پھرتے ہیں۔ راجہ کو اتنے بڑے محل میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ غاصب ہے۔

بہت صحیح کہتے ہیں۔ آخر میں پڑے پڑے کھانے کے سوائے اور کیا کرتا ہوں۔

چکردھر نے جھنجلا کر کہا۔ دیوان صاحب آپ میرے آقا ہیں اور میں آپ کا ادب کرتا ہوں۔ لیکن ان غلط بیانیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میں نے رعایا کو ان کے حق سے ضرور آگاہ کیا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ راجہ غاصب ہے اور اسے دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

راجہ۔ میں تو مطلق برا نہیں مانتا۔ آپ نے کہا ہے۔ تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ جو اور لوگ نہ کہتے ہوں۔ جو راجہ اپنی رعایا کا فرض نہ ادا کرتا ہو۔ وہ یقیناً غاصب ہے اور اُسے ہرگز دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

چکردھر کو معلوم ہوا کہ راجہ صاحب مجھے بنارہے ہیں۔ یہ مذاق کا موقعہ نہ تھا۔ ہزاروں آدمی سانس بند کیے ہوئے ان لوگوں کا فیصلہ سننے کے منتظر ہیں اور یہاں مذاق ہورہا ہے۔ چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔ اگر آپ کے یہ جذبات سچے ہوتے تو رعایا کو یہ مظالم نہ سہنے پڑتے۔ وہ راجہ جس کے کانوں تک غربا کی فریاد نہ پہنچے......

راجہ صاحب نے بات چھین کر کہا۔ اُسے گولی ماردینی چاہیے۔ زندہ چنوادینا چاہیے۔ رعایا کا غلام ہے کہ مذاق ہے!

چکردھر اس طنز کے متحمل نہ ہوسکے۔ ان کی خلقی رواداری نے ساتھ چھوڑ دیا۔ فدائیانہ جوش سے بولے۔ جس اصول کے سامنے آپ کو سر جھکانا چاہیے۔ اس کا مضحکہ اڑانا آپ کو زیبا نہیں۔ تمدن کا یہ نظام بہت تھوڑے دنوں کا مہمان ہے۔ اور وہ زمانہ آرہا ہے۔ جب یا تو راجہ اپنی رعایا کا خادم ہوگا۔ یا ہوگا ہی نہیں۔ مجھے کبھی یہ

گمان نہ تھا کہ آپ کے قول اور فعل میں اتنا بڑا اختلاف ہوگا۔

راجہ صاحب ابھی تک تو طنز اور تضحیک سے چکردھر کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب چکردھر کے وار ہونے لگے۔ تو انھیں بھی تلوار نیام سے باہر کرنی پڑی۔ ڈپٹ کر بولے۔ اچھا اب زبان بند کیجیے۔ میں جتنی ہی طرح دیتا ہوں۔ اتنے ہی آپ شیر ہوتے جاتے ہیں۔ دوستی کے رشتہ سے جتنا برداشت کرسکتا تھا کرچکا۔ میں رعایا کا غلام نہیں ہوں۔ رعایا میرے قدموں کی خاک ہے۔ مجھے اختیار ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھوں کروں۔ کسی غیر کو میرے اور میری رعایا کے بیچ میں بولنے کا حق نہیں ہے۔ آپ مہربانی کرکے یہاں سے تشریف لے جایئے۔ اور پھر میری ریاست میں قدم نہ رکھیے گا۔ ورنہ شاید آپ کو پچھتانا پڑے۔ جایئے!

منشی بجردھر کا سینہ دھک دھک کررہا تھا۔ چکردھر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔ حضور کی عنایتوں نے اسے گستاخ کردیا ہے۔ ابھی تہذیب یافتہ صحبت میں بیٹھے کا اتفاق تو ہوا نہیں۔ تمیز کہاں سے آئے؟

لیکن چکردھر جو ان آدمی تھے۔ اس پر اصولوں کے پکے نصب العین پر مرمٹنے والے۔ اختیار اور اقتدار کے جانی دشمن۔ وہ راجہ صاحب کے غیظ وغضب سے مطلق مرعوب نہ ہوئے۔ یہ اس شیر کی گرج تھی جس کے دانت اور پنجے ٹوٹ گئے ہوں۔ اسی رسی کی اینٹھ تھی۔ جو جل گئی ہو۔ ہاتھ چھڑا کر سامنے آگئے۔ اور بولے۔ آپ کو اپنے منہ سے ایسے الفاظ نکالتے شرم آنی چاہیے۔ آپ کے خیالات کتنے پاکیزہ تھے اور کتنے رفیع کہ سن کر روح تازہ ہوجاتی تھی۔ آپ اپنے کو رعایا پر قربان کردینا چاہتے تھے۔ آپ کہتے تھے۔ رعایا کے لیے میرے دروازے آٹھوں پہر کھلے رہیں گے۔ میرے کارکن اُن کی طرف ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ بھی نہ سکیں گے۔ وہ ساری باتیں آپ بھول گئے اور اتنی جلد۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ رعایا میرے قدموں کی خاک ہے ایشور آپ کو عقل صحیح عطا کرے۔

راجہ صاحب کہاں تو غصہ سے پاگل ہورہے تھے۔ کہاں اس بے رحمانہ چوٹ سے رو پڑے۔ ندامت تھی یا عبرت۔ اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ یا مجبوری کا۔ یا یہ صدمہ تھا کہ یہ شیطان میری اتنی توہین کرتا ہے اور میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کا

فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

دیوان صاحب نے چکردھر کو پھٹکار بتائی۔ تمھیں کچھ خیال ہے کس سے ایسی گستاخی کررہے ہو؟۔

بجردھر۔ بیٹا! کیوں میرے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔

راجہ صاحب بھی سنبھل کر بولے۔ میں کہتا ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔

چکردھر۔ جب تک ان ستم زدوں کو آپ جانے نہ دیں گے۔ میں یہاں سے نہ جاؤں گا!

راجہ۔ میرے آدمیوں سے تمھیں کوئی سروکار نہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی ہلا۔ تو اس کی لاش زمین پر ہوگی۔

چکردھر۔ تو میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ انھیں اس قید سے آزاد کراؤں۔

یہ کہہ کر چکردھر مزدوروں کی طرف بڑھے۔ راجہ صاحب کو معلو تھا کہ ان کا اشارہ پاتے ہی مزدور ہوا ہوجائیں گے۔ پھر مسلح فوج بھی انھیں نہ روک سکے گی۔ طیش کے عالم میں بندوق لیے ہوئے چکردھر کے پیچھے دوڑے اور ایسے زور سے ان پر کندا چلایا کہ سر پر پڑتا تو شاید وہیں ٹھنڈے ہوجاتے۔ مگر خیریت ہوئی کہ پیٹھ میں لگا اور وہ گر پڑے۔ ان کا گرنا تھا کہ مزدوروں کا وہ ٹڈی دل باڑے کو توڑ کر مسلح سپاہیوں کی دیوار کو چیرتے پھاڑتے باہر نکل آیا اور راجاؤں کے کیمپ کی طرف چلا۔ راستہ میں راجہ کا جو ملازم ہاتھ آگیا اس کی مرمت کردی۔ خبراڑی بلوہ ہوگیا۔ دکاندار دوکانیں سمیٹنے لگے۔ تماشائیوں نے راہ فرار اختیار کی۔ چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔

ہمارے رؤسائے عالی مقام اپنے نفس کے سوا اور کسی کے غلام نہیں۔ وقت کی غلامی بھی انھیں گوارہ نہیں۔ وہ کسی قسم کی پابندی کو اپنی آزادی میں مخل نہیں ہونے دیتے۔ پھر انھیں اس کی کیا پرواہ کہ صبح ہے یا شام۔ کوئی میٹھی نیند کے مزے لیتا تھا۔ کوئی گانا سنتا تھا۔ اور کچھ لوگ منڈپ میں جانے کی تیاریوں میں سرگرم تھے کہیں بھنگ گھٹتی تھی۔ کہیں شاعری کا چرچا تھا۔ اور کہیں پہلوانوں کے جوڑ چھوٹ رہے تھے۔ کوئی جسم میں تیل کی مالش کرارہا تھا۔ اور کوئی لیٹا ہوا ایک درجن خدمت گاروں

سے مکیاں لگواتا تھا۔ اگر فتنہ انگیزوں کی جماعت اس کیمپ میں پہنچ جاتی تو غضب ہی ہو جاتا۔ مگر اہل ثروت کی حفاظت ان کا اقبال کرتا ہے۔ انگریزی کیمپ میں دس بارہ فوجی افسر ابھی شکار کھیل کر لوٹے تھے۔ نشانہ آزمائی کا یہ سنہرا موقعہ دیکھا تو بندوقیں لے کر نکل آئے، اور نشانہ بازی کے جوہر دکھانے لگے۔

ایک آدمی نے اپنے رفیقوں سے کہا۔ ہاں بہادرو! بس ایک ہلے کی اور کسر ہے گھس پڑو۔ اب کہاں جاتے ہیں۔ مار لیا ہے۔

دوسرا۔ پھانسی پر تو چڑھنا ہی ہے۔ پھر انھیں کیوں چھوڑیں۔

دفعتاً دونوں گولی کھاکر گر پڑے۔

مگر بلوائیوں کی جماعت منتشر نہ ہوئی۔ ایک موٹے تازے آدمی نے للکار کر کہا۔ دیکھو بھائیو! گھبرانا نہیں جو گرتا ہے اسے گرنے دو۔ جے ہنومان کی۔

دوسرا جوان بولا۔ آج جو مرے گا۔ بیکنٹھ جائے گا۔ بولو دیوی جی کی جے!

تیسرے نے کہا۔ گورے گولیاں چلارہے ہیں۔

"توچلو انھیں کی کھبر لیں"۔

کئی باڑھیں چلیں اور کئی آدمی گرے۔ مگر جماعت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ آخر ایک دست انگریزی کیمپ کی طرف بھی مڑا۔ نشانہ بازوں نے دیکھا کہ بلوائی ہمارے قریب پہنچ گئے۔ تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بندوقیں ہاتھوں سے گر پڑیں۔ ادھر راجاؤں کے کیمپ میں بھی تہلکہ پڑگیا۔ قریب تھا کہ جنون کا یہ خونیں سیلاب اپنی تباہ کن اندھی روانی کی یادگار ثروت کی نیم جاں سسکتی ہوئی لاشوں اور اقتدار کے مٹے ہوئے نشانات کی صورت میں چھوڑ جائے کہ چکردھر پچھلی صفوں کو چیرتے۔ بے تحاشا دوڑتے ہوتے آکر بولے۔ بھائیو! تم لوگ کہاں جارہے ہو۔ کیا غضب کرتے ہو؟

چکردھر کندے کی چوٹ کھاکر کچھ دیر تک تو بے ہوش پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو دیکھا۔ دائیں طرف بلوائیں کی ایک جماعت انگریزی کیمپ کے دروازے تک پہنچ گئی ہے۔ بائیں طرف بازار لٹ رہا ہے۔ اور مسلح پولیس کے جوان بلوائیوں کے ساتھ مایہ شروفساد سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ اور اس شاندار پنڈال سے شعلے بلند ہورہے ہیں۔ جس کے سایہ میں تلک کی رسم ادا ہونے والی تھی کہ وہ فوراً اٹھ کر

انگریزی کیمپ کی طرف بھاگے۔ وہی خطرہ کا مرکز تھا۔

سینکڑوں آدمی دیوانہ وار ان کی طرف دوڑے۔ جے جے کے نعرے لگاتے ہوئے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مگر جن کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ کب ماننے لگے تھے ایک آدمی نے کہا۔ یارو ہمیں اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا ہے ایک سو بھائیوں کے خون کا۔

چکردھر نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر کہا۔ خبردار! کوئی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔ مخالف آوازیں آنے لگیں۔

"ہمارے ایک سو نوجوان بھون ڈالے گئے۔ تب آپ کہاں تھے؟ یارو! کیوں کھڑے ہو! بابو جی کا کیا بگڑا ہے۔ مارے تو ہم گئے ہیں۔ مارو بڑھ کے"۔

"بھیا چکردھر! تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔ اس بکھت دل کی آگ بجھا لینے دو۔ مرنا تو ہے ہی"۔

چکردھر نے کہا۔ اگر وہ آگ خون سے بجھے گی تو پہلا خون میرا ہوگا۔

ایک مزدور نے کہا۔ ہماری پھانسی تو ہو ہی جائے گی تم ماپھی نہ دلادوگے۔

چکردھر۔ ابھی تک تم نے کسی کے خون سے اپنا ہاتھ نہیں رنگا۔ کسی کی پھانسی کیوں ہوگی اور پھانسی ہی ہوجائے تو اس کا کیا غم۔ ایشور کی نظروں میں تم بے قصور ہو۔ اس کے دربار میں تو دھاندلی نہیں ہوتی۔

بلوائیوں نے دیکھا۔ آگے بڑھنا غیر ممکن ہے۔ پہلا قدم چکردھر کے سینے پر ہوگا۔ کچھ کڑھتے دل میں جھنجھلاتے اور آئندہ کسی موقعہ پر دل کا ارمان نکالنے کے منصوبے باندھتے واپس ہوگئے۔ ایک لمحہ میں میدان صاف ہوگیا۔ اتنے آدمی کدھر غائب ہوگئے۔ کچھ پتہ نہ چلا۔

جس طرح پانی آجانے سے کوئی میلہ اٹھ جاتا ہے۔ خریدار۔ دکاندار اور ان کی دکانیں سب خدا جانے کہاں غائب ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح اس سیلاب کے آجانے سے کیمپ میں سناٹا چھا گیا۔ صرف شاندار پنڈال سے ابھی تک شعلے اُٹھ رہے تھے۔ راجہ صاحب اور ان کے مشیر کھڑے حسرت ناک نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ گویا شمشان میں کھڑے کسی لاش کا جلنا دیکھ رہے ہوں۔ بازار لٹا۔ گولیاں چلیں۔

آدمی مکھیوں کی طرح مرے۔ پر راجہ صاحب پنڈال کے سامنے سے نہ ہٹے! ایسا معلوم ہوتا تھا ان کی ساری تمنائیں، سارے منصوبے اسی شعلہ میں فنا ہوگئے۔ آگ بجھانے کی کوشش کون کرتا۔ تباہی اتنی ہوش ربا تھی۔ نقصان اتنا دل شکن کہ تحفظ کا حِس بھی باقی نہ رہا۔ تباہی کی تکمیل ہی اطمینان قلب کا باعث ہورہی تھی۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ چکردھر اوران کے رفقا انھیں احتیاط سے اٹھا کر شفاخانے پہنچانے کا انتظام کرنے لگے۔ جو اُٹھانے کے قابل نہ تھے۔ اُن کی مرہم پٹی وہیں ہونے لگی۔ لاشیں ایک درخت کے نیچے جمع کی جانے لگیں۔ اس وقت ندی لے جانے کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ کئی والنٹیر لاشوں کی نگرانی کے لیے مقرر کردیے گئے۔

یکایک کئی سپاہیوں نے آکر چکردھر کو گرفتار کرلیا۔

(15)

ساری رات گزر گئی۔ راجہ صاحب کی پلکیں تک نہ جھپکیں آدھی رات تو ان کی تلوار ہری سیوک پر کھنچی رہی۔ اسی بڈھے کھوسٹ کی بدانتظامی سے یہ سارا طوفان اٹھا اس کے بعد تلوار کے وار اپنے اوپر ہونے لگے۔ مجھے یہ تقریب منانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ریاست مجھے مل ہی چکی تھی۔ گدی اور تلک کی حماقت میں کیوں پڑا؟ پچھلے پہر غصہ نے پھر پہلو بدلا اور تلوار کی چوٹیں چکردھر پر پڑنے لگیں۔ یہ ساری شرارت انھیں کی ہے۔ حق اور انصاف اور خدمت سب اچھی باتیں ہیں۔ مگر ہر ایک کام کے لیے یہ موقعہ ہوتا ہے۔ اسی نے بیگاروں کو برانگیختہ کیا۔ دوچار دن آدھے ماہی پیٹ کھا کر کیا مزدوروں سے نہ رہا جاسکتا تھا۔ اپنے گھر پر ہی کون انھیں دونوں وقت کھانے کو پکوان حاصل ہوجاتے ہیں۔ باپ تو تلوے سہلاتا پھرتا ہے اور آپ قوم کے خادم بنے ہیں۔

محل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ روہنی نے جنم اشٹی کے دن ہی سے راجہ صاحب سے بولنا چالنا چھوڑدیا۔ بسومتی کو اپنی پوجا پاٹھ سے فرصت نہ تھی۔ اب رام اور کرشن دونوں ہی اس کے گلے پڑ گئے تھے۔ صرف رام پریا گھبرائی ہوئی ادھر ادھر دوڑ رہی

تھی کبھی چپکے چپکے عتاب گاہ کے دروازے تک جاتی کبھی کھڑکی سے جھانکتی۔ پر راجہ صاحب کی تیوریاں دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹ آتی۔

اِتنے میں منورما آکر سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی دونوں آنکھیں بیر بہوٹی ہورہی تھیں۔ بھویں چڑھی ہوئی۔ گویا کسی شہدے نے عفیفہ کو چھیڑ دیا ہو۔

رام پریا نے پوچھا۔ کہاں تھی منورما۔

منورما۔ اوپر ہی تو تھی۔ راجہ صاحب کہاں ہیں؟

رام پریا نے منورما کے چہرے کی طرف چبھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ دل آنکھوں میں رورہا تھا۔ بولی کیا کروں گی پوچھ کر؟

''اُن سے کچھ کہنا چاہتی ہوں''۔

''کہیں اُن کے سامنے جانا مت۔ کوپ بھون میں ہیں''۔

''آپ بتلاتو دیں''۔

''نہیں نہیں نہ بتلاؤں گی۔ اس وقت ان کے دل پر نہ معلوم کیابیت رہی ہے۔ خون کا گھونٹ پی رہے ہوں گے۔ سنتی ہوں یہ ساری کرامات چکردھر کی ہے''۔

منورما تیر کی طرح کمرے سے نکل کربسومتی کے پاس جاپہنچی اور وہی سوال اس سے کیا۔

بسومتی نے ترش ہوکر کہا۔ میں کیا جانوں کہاں ہیں۔ میں تو پوچھنے بھی نہ گئی۔ جیسے رام رادھا سے۔ ویسے ہی رادھا رام سے۔

''آپ کو معلوم نہیں''؟

میں ہوتی کون ہوں۔ بیگانوں کی طرح گھر میں پڑی دن کاٹ رہی ہوں۔

منورما روہنی کے کمرے میں آئی۔ وہ گاؤ تکیہ لگائے ٹھسے سے مسند پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے آئینہ تھا۔ نائن بال گونتھ رہی تھی۔ مسکراکر منورما سے پوچھا کیسے چلیں؟

منورما نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

''کہیں بیٹھے اپنے نصیبوں کو رورہے ہوں گے کیسی میری آہ پڑی ہے کہ یاد ہی کرتے ہوں گے۔ ایشور بڑا کارساز ہے۔ گھر میں آگ لگے یا بجلی گرے۔ میری بلا سے۔''

منورما مایوس ہو کر یہاں سے نکلی۔ وہ اس محل میں پہلے ہی پہل آئی تھی۔ انداز سے دیوان خانہ کی طرف چلی۔ جب رانیوں کے پاس نہیں ہیں تو ضرور دیوان خانہ میں ہوں گے۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ذرا ٹھٹھک گئی۔ جھانک کر اندر دیکھا۔ راجہ صاحب اضطراب کی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ اندر چلی گئی۔

راجہ صاحب اُسے دیکھ کر چونک پڑے۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو شاید وہ اس پر جھلا پڑتے۔ پر منورما کے تمکنت حسن نے انھیں مغلوب کردیا۔ کھولتے ہوئے پانی نے دہکتے ہوئے شعلوں کو فرو کردیا۔ انھوں نے دو تین دن پہلے اُسے ایک بار دیکھا تھا۔ تب وہ دوشیزہ تھی۔ آج وہی دوشیزہ نازنین ہوگئی تھی۔ یہ ایک رات کی روحانی خلش اور سوز پنہاں کا کرشمہ تھا۔ راجہ صاحب کے رُوبرو آکر بھی اُسے ذرا بھی خوف یا جھجک نہ ہوئی۔ حقارت آمیز آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی۔ مہاراج! میں آپ سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ ثروت اور حیوانیت ایک ہی چیز ہے یا اس میں کچھ فرق ہے؟

راجہ صاحب نے حیرت میں آکر کہا۔ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔ منورما تمھاری تیوریاں کیوں چڑھی ہوئی ہیں؟

منورما۔ میں آپ سے فریاد کرنے آئی ہوں۔ آپ نے اس مبارک موقع پر ایک ایسے آدمی کی آبروریزی کی ہے۔ جسے میں دیوتا سمجھتی ہوں۔ جس کا دل کنول کی طرح پاک اور نازک ہے۔ جس میں زاہدوں کا ساترک اور عارفوں کا ساحق ہے۔ آپ کی انصاف پروری کی داستانیں انھیں سے سنا کرتی تھی۔ لیکن یہی اس کی اصل صورت ہے تو مجھے خوف ہے کہ اس شان وشوکت کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ اور آپ کی ساری نیک نامی خواب کی طرح ہٹ جائے گی۔

راجہ صاحب منورما کے منہ سے یہ پرغضب الفاظ سن کر دنگ رہ گئے۔ اس طیش میں بھری ہوئی سادہ لوح نازنین نے انھیں شیفتہ کردیا۔ ملائمت سے بولے چکردھر کو تم کیسے جانتی ہو؟

"وہ مجھے انگریزی پڑھانے آیا کرتے ہیں"۔

راجہ نے معذرت کے انداز سے کہا۔ منورما! میرے دل میں بابو چکردھر کی جتنی عزت تھی اور ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ جب ان پر انھیں

بے درد ہاتھوں سے میں نے حملہ کیا۔ تو اب ایسی باتیں سن کر تمھیں یقین نہ آئے گا۔ تم نے بہت صحیح کہا ہے کہ ثروت اور حیوانیت ایک ہی چیز ہیں۔ ایک چیز چاہے نہ ہو۔ پر ان میں پھوس اور چنگاری کا تعلق ضرور ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں آتا کہ کبھی مجھے اتنا غصہ آیا ہو۔ اب میں سمجھ رہا ہوں کہ اگر وہ بلوائیوں کے سامنے جاکر نہ کھڑے ہو جاتے۔ تو شاید اس وقت جگدیش پور پر گولیوں کی بارش ہورہی ہوتی۔ ان کے ساتھ میں نے جو وحشیانہ برتاؤ کیا ہے۔ اس پہ مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔

منورما کا غصہ غائب ہوگیا۔ بولی۔ محض افسوس کرنے سے تو وہ زخم نہ بھرے گا۔

راجہ۔ کیا کروں منورما! اگر میرے بس کی بات ہوتی تو میں اسی وقت جاتا اور انھیں کندھوں پر بٹھا کر لاتا۔ پر اب میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔ اگر وہ یہ عہد کریں کہ اب وہ سیاسیات میں حصہ نہ لیں گے تو شاید وہ چھوڑ دیئے جائیں۔

منورما نے سر ہلا کر کہا۔ مجھے تو امید نہیں کہ وہ ایسا معاہدہ کریں۔

راجہ۔ تمھارے کہنے سے مان جائیں گے۔

منورما۔ دادا میں کیوں کہنے لگی۔ میں یہ کب چاہوں گی کہ وہ ان حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ جو انھیں ایشور نے دیے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ سچے آدمی کے ساتھ سچا برتاؤ ہونا چاہیے۔ اور اسے اس کی سچائی اور شرافت کی سزا نہ ملنی چاہیے۔ تو آپ کو مجسٹریٹ سے اس کی سفارش کرنی چاہیے۔

راجہ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ میں بڑا بدنصیب ہوں۔ منورما! میرے دل میں بڑے بڑے حوصلے تھے۔ پر اتفاقات سے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ میرے ہاتھوں وہ سب کچھ ہورہا ہے۔ جس سے مجھے نفرت تھی۔ نہ جانے وہ کون سی طاقت ہے جو مجھے اپنی ضمیر کے خلاف لیے جارہی ہے۔ میرے پاس کوئی ایسا مشیر نہیں ہے جو مجھے سچی صلاحیں دے۔ اتنے آدمیوں کے بیچ میں میں تنہا۔ بیزار اور بے کس آدمی ہوں۔ میں اسی وقت مجسٹریٹ کے پاس جاؤں گا۔

راجہ صاحب کے اس انکسار اور دلجوئی نے منورما کو بھی متاثر کردیا۔ بولی: مگر جب آپ کو اس سے کوئی امید نہیں ہے تو بے فائدہ کیوں تکلیف اٹھایئے گا۔ میں نے

آپ کا وقت ضائع کیا۔ اس لیے معاف کیجیے گا۔
یہ کہتی ہوئی منورما کمرے سے چلی گئی۔ بشال سنگھ دروازہ پر کھڑے اس کی طرف تشنہ کام نظروں سے تاکتے رہے۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ تب ایک ٹھنڈی سانس لے کر کرسی پر لیٹ گئے۔
ان کے دل میں آج ایک نئی تمنا زونما ہورہی تھی۔

(16)

شام ہوگئی ہے۔ ایسی اُمس ہے کہ سانس لینا مشکل ہے اور جیل کی کوٹھریوں میں وہ اور بھی ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ ایک بھی کھڑکی نہیں۔ ایک بھی روزن نہیں۔ اس پر مچھروں کا نغمہ شیریں اور بھی ستم ڈھارہا ہے۔ سب کے سب دعوت کھانے کے پہلے مست ہوکر گارہے ہیں۔ ایک آدھ مر بھوکے بے صبر ہوکر کبھی کبھی خون کا مزا لے لیتے ہیں۔ لیکن بیشتر اس وقت کا انتظار کررہے ہیں۔ جب نیند کی دیوی ان کے سامنے خوان بچھا کر کہے گی۔ پیارو کھاؤ جتنا کھاسکو۔ اور پیؤ جتنا پی سکو۔ رات تمھاری اور بھنڈار بھرلو۔
"یہیں ایک کوٹھری میں چکردھر بیٹھا ہواہے۔ آزادی کی دیوی اپنے سچے پرستاروں کو یہی منصب عطا کرتی ہے۔
وہ سوچ رہا ہے۔ یہ خونریز ہنگامہ کیوں ہوا۔ میں نے تو کبھی بھول کر بھی کسی سے یہ تحریک نہیں کی۔ اس سوال کا اُسے بھی جواب مل رہا ہے کہ یہ ہماری نیت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پیغام صلح کی تہ میں نفس پروری چھپی ہوئی ہے اگر ہماری نیت صاف ہوئی تو مخلوق کے دلوں میں راجاؤں پر [illegible] دوڑنے کا یہ جوش ہی نہ پیدا ہوتا۔ لیکن زیادتی تو پولیس کی تھی۔ جو چھیڑ چھیڑ کر لڑنا چاہتے۔ اس سے کوئی کیوں کر بچے؟ پھر اگر ظلم کی مخالفت نہ کی جائے تو تنظیم سے فائدہ ہی کیا۔ مشکل مسئلہ ہے۔
یکایک منشی بجردھر کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے جسم پر ایک پرانی اچکن تھی جس کا میل اس کے رنگ کو چھپائے ہوا تھا۔ نیچے ایک پتلون تھا۔ جو کمربند نہ ہونے کے باعث کھسک کر اتنا نیچا ہوگیا تھا کہ گھٹنوں کے نیچے ایک جھول سا پڑ گیا

تھا۔ دنیا میں کپڑے سے زیادہ بے وفا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارا گھر بچپن سے بڑھاپے تک ہر ایک حالت میں ہمارا ہے کپڑا ہمارا ہوتے ہوئے بھی ہمارا نہیں رہتا۔ آج جو لباس ہمارا ہے۔ وہ کل ہمارا نہ رہے گا۔ اسے ہمارے رنج وراحت کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ فوراً طوطا چشمی کرجاتا ہے۔ ہم ذرا بیمار ہوجائیں کسی مقام کی آب وہوا سے فوراً موافق ہوجائے۔ بس ہمارے پیارے کپڑے جن کے لیے ہم نے درزی کی دکان کی خاک چھان ڈالی تھی۔ ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ انھیں لاکھ اپناؤ اپنے نہیں ہوتے۔ اگر زبردستی گلے لگاؤ۔ تو پکار کر کہتے ہیں۔ ہم تمھارے نہیں۔ وہ صرف ہمارے ایام گذشتہ کی یادگار ہوتے ہیں۔ منشی بجردھر کی اچکن بھی جو اُن کی عارضی تحصیلداری کی یادگار تھی۔ پکار پکار کر کہتی تھی۔ میں اب ان کی نہیں۔ لیکن تحصیلدار صاحب حکومت کے زور سے اس پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ تم کتنی ہی بے وفائی کرو۔ مجھے کتنا ہی بدنام کرو۔ چھوڑنے کا نہیں۔ اچھے دنوں میں تو تم نے ہمارے ساتھ چین کیے۔ ان برے دنوں میں تمھیں کیوں چھوڑوں۔ یوں ماضی وحال کے کشمکش کی تصویر بنے ہوئے تحصیلدار صاحب چکردھر کے پاس آکر بولے۔ کیا کرتے ہو بٹیا؟ یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔ چلو باہر یکہ کھڑا ہے۔ بیٹھ لو۔ ادھر ہی سے صاحب کے بنگلے پر ہوتے ہوئے چلیں گے۔ جو کچھ وہ کہے لکھ دینا۔ بات ہی کون سی ہے۔ کل ہی سے دوا دوش کررہا ہوں۔ پر آج دوپہر کو جاکر سیدھا ہوا۔ پہلے بہت یوں دوں کرتا رہا۔ لیکن میں نے گلا چھوڑا۔ میم صاحب کے پاس پہنچ کر رونے لگا۔ اس فن میں تم جانتے ہو۔ استاد ہوں۔ سرکاری ملازمت اور وہ بھی تحصیلداری۔ سب کچھ سکھادیتی ہے۔ انگریزوں کو تم جانتے ہی ہو۔ میموں کے غلام ہوتے ہیں۔ میم نے جاکر حضرت کو ڈانٹا۔ کیوں تحصیلدار صاحب کو دق کررہے ہو۔ ابھی اس کے لڑکے کو چھوڑدو۔ نہیں تو گھر سے نکل جاؤ۔ یہ ڈانٹ پڑی۔ تو حضرت کی سٹی پٹی گم ہوگئی۔ ہم ابھی جیلر کو لکھتا ہے کہ اس سے پوچھو، راضی ہے۔ میں نے کہا۔ حضور! میں خود جاتا ہوں۔ اور اُسے حضور کی خدمت میں لاکر حاضر کرتا ہوں۔ یاوہاں نہ چلنا ہو۔ تو یہیں ایک حلف نامہ لکھ دو۔ دیر کرنے سے کیا فائدہ؟ تمھاری اماں رو روکر جان دے رہی ہیں۔

چکردھر نے سرنیچا کرکے کہا۔ ابھی تو میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ سوچ

کر جواب دوں گا۔

بجردھر۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا! یہاں ناک کٹی جارہی ہے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہورہا ہے اور تم کہتے ہو۔ سوچ کر جواب دوں گا۔ اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے۔ اس تحصیلداری کی لاج تو رکھنی ہی ہے۔ کی تو تھوڑے ہی دن۔ لیکن آج تک لوگ یاد کرتے ہیں اور ہمیشہ یاد کریں گے۔ چلو حلف نامہ لکھ دو۔ گھر میں کل سے آگ نہیں جلی۔

چکردھر۔ میرا دل کسی طرح اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے پر راضی نہیں ہوتا۔

بجردھر۔ موقع دیکھ کر سب کچھ کیا جاتا ہے بھائی! وہی راجہ صاحب پہلے تم سے کس محبت سے پیش آتے تھے۔ اب اپنے سر پڑی تو ساری بلا تمہارے سر ٹھیل کر نکل گئے۔ وہی گرسیوک جو کل قوم کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا تھا۔ آج بلوائیوں کے خلاف جلسہ کرنے جارہا ہے۔ سنا ہے ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہوگیا۔ جب ساری دنیا اپنا مطلب نکالنے کی دھن میں مست ہے تو تمھیں کیوں پرائی آگ میں کودو۔

چکردھر۔ اگر لوگ اپنے مطلب کے بندے ہوجائیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ میں بھی انھیں کی نقل کروں۔

بجردھر۔ بس تمھاری اسی ضد پر مجھے غصہ آتا ہے۔ میں نے بھی جوانی میں اس طرح کے کھلواڑ کیے ہیں اور ان لوگوں کو کچھ کچھ جانتا ہوں۔ جو اپنے کو قوم کا خادم کہتے ہیں۔ بس منہ نہ کھلواؤ۔ یہ سارا سوانگ دنیا کو لوٹنے کے لیے سوچ رکھا ہے۔ میں تو سیدھی سی بات جانتا ہوں۔ جو اپنے خاندان کی خدمت نہ کر سکا۔ وہ قوم کی خدمت کیا کرے گا۔ گھر خدمت کی سیڑھی کا پہلا زینہ ہے۔ اسے چھوڑ کر تم اوپر نہیں جاسکتے۔

چکردھر اب بھی حلف نامہ پر دستخط کرنے کو راضی نہ ہوئے تو منشی جی مایوس ہوکر بولے۔ میں تو جانتا تھا کہ تم میری ایک نہ سنوگے۔ اس لیے آتا نہ تھا۔ لیکن تمھاری ماں نے کرید کرید کر بھیجا۔ کہہ دوں گا۔ صبر کرکے بیٹھو۔ اسے اپنی ٹیک اور اپنی شان ماں باپ سے پیاری ہے۔ جتنا رونا ہو رولو۔

سخت سے سخت دل میں بھی ماں کی محبت کی پاکیزہ یادگاریں محفوظ ہوتی ہیں۔

چکردھر نے پس وپیش کر کے کہا۔ آپ اماں کو سمجھا دیجیے گا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میرے لیے رنج نہ کریں۔

بجردھر نے دھوپ میں بال سفید نہ کیے تھے تاڑ گئے کہ نشانہ ٹھیک پڑا۔ بے پروائی سے بولے۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ بیکار کے لیے جھوٹ بولوں بغیر کسی غرض کے جھوٹ بولنا میری عادت نہیں ہے۔ جو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہی کہوں گا۔ روئے گی روئیں۔ میرا کیا اختیار ہے۔ رونا ان کی تقدیر ہی میں لکھا ہے۔ جب سے تم آئے ہو ایک گھونٹ پانی بھی منھ میں نہیں گیا۔ اسی طرح دوچار دن اور رہیں۔ تو جان نکل جائے گی تمھارے سر کا بوجھ ٹل جائے گا۔ بولو۔ وارڈر، مجھے بلانے آرہا ہے۔ وقت پورا ہوگیا۔

چکردھر نے التجا کر کے کہا۔ اماں کو ایک بار یہاں نہ لایئے گا؟

بجردھر۔ تمھیں اس حالت میں دیکھ کر جو انھیں دوچار دن جینا ہے۔ وہ بھی نہ جئیں گی۔

چکردھر کا دردمند دل بے قرار ہوگیا۔ منشی جی کے ساتھ دفتر کی طرف چلے۔ منشی جی کے چہرے کی جھریاں ایک لمحہ کے لیے مٹ گئیں۔ چکردھر کو گلے لگا کر بولے۔ جیتے رہو بیٹا! تم نے میری آبرو رکھ لی۔

دونوں آدمی دفتر میں آئے تو جیلر نے کہا۔ کہیے تحصیلدار صاحب! آپ کی شکست ہوئی نہ؟ میں کہتا نہ تھا۔ آج کل کے نوجوان اپنی ضد کے آگے کسی کی نہیں سنتے۔

بجردھر نے بے تکلفی سے کہا۔ ذرا قلم دوات منگوایئے۔ پھر باتیں ہوں گی۔

داروغہ۔ اچھا تو کیا اقرار نامہ لکھ رہے ہیں؟

چکردھر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنی کمزوری پر بہت شرمندہ ہوئے۔ قوم کے خادموں کو دنیا اصولوں پر قربان ہونے دیکھنا چاہتی ہے۔ قومیت کے دائرے میں آتے ہی اس کے اوصاف کی جانچ بڑی سختی اور عیبوں کی بڑی فراخ دلی سے ہونے لگتی ہے۔ انتہا درجہ کا بے اصول آدمی بھی درویشوں سے اونچے معیار پر چلنے کی اُمید رکھتا ہے اور انھیں معیار سے گرتے دیکھ کر ان کی مذمت کرنے میں مطلق پس وپیش نہیں

کرتا۔ جیلر کے پُر معنی سوال نے چکردھر کو بیدار کردیا۔ بولے۔ میں ذرا وہ حلف نامہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

تحصیلدار صاحب نے جیلر کے میز پر سے وہ کاغذ اٹھالیا اور چکردھر کو دکھاتے ہوئے بولے۔ اس میں کچھ نہیں ہے۔ جو باتیں تم سے کہہ چکا ہوں۔ وہی ذرا قانونی پیرائے میں لکھ دی گئی ہیں۔

چکردھر نے کاغذ کو سرسری طور سے دیکھ کر کہا۔ اس میں تو میرے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ گھر پر قیدی بنا بیٹھا رہوں گا۔ اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہ ڈالوں گا۔ جب قید ہی ہونا ہے۔ تو جیل خانہ ہی کیا بُرا ہے۔ اب یا تو عدالت سے بری ہوکر آؤں گا۔ یا سزا کے دن کاٹ کر۔

ایک ہفتہ کے بعد مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ چلنے لگا تحصیلدار صاحب نے نہ کوئی وکیل کھڑا کیا۔ نہ عدالت میں آئے۔ سارے دن مجسٹریٹ کے بنگلے پر رہتے تھے۔ صاحب بنگلے سے نکلتے تو دروازے پر منشی جی کھڑے نظر آتے۔ کچہری سے لوٹتے تو بھی انھیں وہاں کھڑا پاتے۔ صاحب بگڑتے تھے۔ دھمکاتے تھے۔ دو ایک بار گھونسہ بھی تانا۔ لیکن منشی جی کو سر نیچا کیے دیکھ کر رحم آگیا۔

آخر ایک دن صاحب نے پوچھا۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

بجردھر نے اپنی پگڑی اتار کر صاحب کے پیروں میں رکھ دی اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ حضور جانتے ہیں میں کیا عرض کروں۔ سرکار کی خدمت میں ساری عمر گذر گئی۔ میرے دیوتا تو، خدا تو، جو کچھ ہیں آپ ہیں۔ آپ کے سوا میں کس کے دروازے پر جاؤں۔ ان پکے بالوں پر ترس کھائیے۔ مرجاؤں گا حضور! اتنا بڑا صدمہ اٹھانے کی اب طاقت نہیں رہی۔

صاحب نے کہا۔ ہم چھوڑ نہیں سکتا۔ کسی طرح نہیں۔

بجردھر۔ حضور جو چاہیں سوکریں۔ میرا تو آپ سے کہنے ہی بھر کا اختیار ہے۔

صاحب۔ تم اپنے لڑکے کو کیوں نہیں سمجھاتا۔

بجردھر۔ حضور ناخلف ہے۔ اور کیا کہوں۔ خدا ساتویں دشمن کو بھی ایسی اولاد نہ دے جی تو یہی چاہتا ہے حضور! کمبخت کا منہ نہ دیکھوں۔ لیکن کلیجہ نہیں مانتا۔

عدالت میں روز خاصی بھیڑ ہوجاتی تھی۔ وہ سب مزدور جنھوں نے ہڑتال کی تھی۔ ایک بار چکردھر کے درشنوں کو آجاتے۔ شہر سے بھی ہزاروں آدمی آ پہنچتے تھے۔ کبھی کبھی راجہ بشال سنگھ بھی آجاتے۔ لیکن اور کوئی آئے یا نہ آئے۔ جلد آئے یا دیر میں آئے۔ منورما دس بجے بلاناغہ کچہری مین آجاتی تھی۔ اور عدالت کے برخاست ہونے تک اپنی جگہ پر بیٹھی رہتی۔ اس کے چہرے پر اب وہ پہلے کی سرخی۔ وہ رونق، وہ شگفتگی نہیں ہے۔ وہ نہ کسی سے بولتی ہے نہ ملتی ہے۔ اسے دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی خوش طبع نازنین ہے جس کی ہنسی دلوں کو تازہ کردیتی تھی۔

وہاں بیٹھی ہوئی منورما ایک خیالی دنیا کی سیر کرتی رہتی ہے۔ اس دنیا میں محبت ہی محبت ہے۔ مسرت ہی مسرت ہے۔ اسے کہیں سے بے اندازہ دولت ہاتھ آگئی ہے۔ شاید کوئی دیوی اُس سے خوش ہوگئی ہے۔ اس دولت کو وہ چکر دھر کے قدموں پر نثار کردیتی ہے۔ پھر وہی دیوی اُسے کسی ملک کی رانی بنادیتی ہے۔ اس ملک میں سختی اور ظلم کا نام بھی نہیں۔ چکردھر وہاں انصاف کے مسند پر بیٹھتے ہیں۔ اور رعایا ان کی پرستش کرتی ہے۔ اس کے سبھی منصوبوں میں چکردھر ضرور آجاتے ہیں۔ چکردھر وہ انسان نہیں فرشتہ سمجھتی ہے۔

شام کا وقت تھا۔ پندرہ پیشیوں کے بعد آج مجسٹریٹ نے چکردھر کو دو سال قید سخت کی سزا دی تھی۔ چکردھر ہنس ہنس کر دوستوں سے رخصت ہورہے تھے۔ مزدوروں کا ہجوم عدالت کے دروازے پر جے جے کا شور مچارہا تھا۔ کئی عورتیں کھڑی رو رہی تھیں۔ یکایک منورما آکر چکردھر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک ہار تھا۔ وہ اس نے ان کے گلے میں ڈال دیا۔ اور بولی۔ بابو جی! عدالت نے آپ کو سزا دے دی ہے۔ پر اتنے آدمیوں میں یہاں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس کے دل میں آپ کی عزت سوگنی نہ ہوگئی ہو۔ آپ نے ہمیں سچی جرأت، سچی اصول پروری اور سچے فرض کا راستہ دکھادیا۔ جایئے! جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اُسے پورا کیجیے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اس نے اس موقعہ کے لیے کئی دن سے یہ جملے یاد کررکھے تھے۔ اپنے جذبات کو اس طرح مقید نہ کردیتی تو وہ جوش میں نہ جانے کیا کیا کہہ جاتی۔

چکردھر نے صرف دبی ہوئی آنکھوں سے منورما کو دیکھا۔ کچھ بول نہ سکے۔ انھیں شرم آرہی تھی کہ لوگ دل میں خیال کررہے ہوں گے۔ راجہ صاحب دیوان صاحب گروسیوک اور منشی بجردھر سبھی کھڑے تھے۔ برآمدے میں ہزاروں آدمی کی بھیڑ تھی۔ شکریے کے الفاظ چکردھر کی زبان پر آکر رُک گئے۔ وہ دکھانا چاہتے تھے کہ منورما کی یہ عقیدت محض طفلانہ حرکت ہے۔

رفتہ رفتہ کمرہ خالی ہوگیا۔ جب مجسٹریٹ کرسی سے اُٹھ کر نیچے اُترا۔ تو منشی بجردھر آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے پاس آئے اور بولے مسٹرجم۔ میں تمھیں انسان سمجھتا تھا پر تم پتھر نکلے۔ میں نے تمھاری جتنی خوشامد کی۔ اتنی اگر خدا کی کرتا تو نجات مل جاتی۔ مگر تم نہ پسیجے نہ لسیجے۔ رعایا کا دل یوں مٹھی میں نہیں آتا۔ یہ دھاندلی اسی وقت تک چلے گی۔ جب تک لوگوں کی آنکھیں بند ہیں۔ یہ مزہ بہت دن نہ اٹھاسکو گے۔

چکردھر جیل پہنچے تو شام ہوگئی تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے منورما اب بھی کھڑی تھی۔

رات کو جب وہ لیٹے تو اس کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اور ہر بات میں کوئی نہ کوئی کنایہ چھپا ہوا معلوم ہونے لگا۔ لیکن اس کا انجام کیا۔ منورما ! تم کیوں میرے جھونپڑے میں آگ لگاتی ہو۔ تمھیں کچھ خیال ہے کہ مجھے کدھر کھینچے لیے جاتی ہو یہ باتیں کل تمھیں بھول جائیں گی۔ ثروت میری صورت کو بھی تمھارے دل سے محو کردے گی۔ دیکھنے میں شاید پہچان بھی نہ سکو۔ میرے دل میں کیوں اپنے کھیل کے گھروندے بنا رہی ہو۔ تمھارے لیے جو کھیل ہے وہ میرے لیے موت ہے۔ تمھارا قلب کتنا پاکیزہ ہے اور کتنا پردرد۔ خوش نصیب ہوگا وہ انسان جس کے دل کی تم رانی بنوگی۔ مگر تم اس ابھاگے کو کبھی اپنی ہمدردی اور حسن ظن سے محروم مت کرنا میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔

(17)

راجہ بشال سنگھ کا شباب قصہ ماضی ہوچکا تھا۔ مگر محبت سے ابھی تک اُن کا دل

محروم تھا۔ اپنی تینوں رانیوں میں صرف بسومتی کی محبت کی بھولی ہوئی یاد انھیں کچھ آتی تھی۔ لیکن پریم وہ پیالہ نہیں ہے جسے آدمی چھک جائے۔ اس کی ہوس ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ یوں اپنے اپنے ڈھنگ پر تینوں ان سے محبت کرتی تھیں۔ مگر بسومتی کی محبت میں حسد تھی۔ روہنی کی محبت میں بے نیازی اور رام پریا کی محبت تو ہمدردی کے حدود کے اندر ہی رہ جاتی تھی۔ کوئی بھی راجہ کے ذوق محبت کو شاد کام نہ کرسکتی تھی۔ ان تالابوں کے بیچ میں وہ پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ پانی بہت تھا۔ پر پینے کے لائق نہیں۔ اسی حالت میں منورما میٹھے ناز سے پانی کا کلسالیے ہوئے سامنے آنکلی۔

راجہ صاحب کے دل میں نئی نئی تمنائیں نئے نئے ولولے موجزن ہونے لگے اس کی ایک ایک ادا انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کتنا دل فریب حسن تھا۔ کتنی شیریں آواز۔ وہ اکیلی آئی تھی۔ پر یہ وسیع دیوان خانہ بھرا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ دل کتنا فراخ کتنا نازک ہے۔ جونازنین ایک معمولی آدمی سے اتنی مانوس ہوسکتی ہے۔ اس کی شوہر پرستی کا خیال کرتے ہی ان کا دل شگفتہ ہوجاتا تھا۔ اور اگر کہیں خدا کے فضل وکرم سے کوئی اولاد نرینہ پیدا ہوگئی۔ تو اس کے رعب اور اقبال کے سامنے بڑے بڑے راجے کانپیں گے۔ خاندان کا نام روشن کردے گا۔ راجہ صاحب کو اس کی ذرا بھی فکرنہ تھی کہ وہ ان کو قبول کرے گی یا نہیں۔ ان کے خیال میں ثروت اور سبھی خامیوں کو پورا کرسکتی تھی۔

دیوان صاحب سے پہلے وہ کھینچے رہتے تھے۔ اب ان کی قدرومنزلت کرانے لگے۔ اور تین بار ان کے مکان پر بھی گئے۔ اور اپنی شرافت کا سکہ جما آئے۔ ٹھاکرصاحب کی بھی کئی بار دعوت کی۔ ارتباط بڑھنے لگا۔ ان موقعوں پر منورما ان سے کچھ اس طرح دل کھول کر ملی کہ راجہ صاحب کی امیدیں اور بھی روشن ہوگئیں۔ اُس کا ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا بار بار آکر ان کے پاس بیٹھ جانا اور معنی خیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنا بے معنی نہ تھا۔ رہے دیوان صاحب وہ دنیا دار آدمی تھے اور حصول مُدعا کے ایسے اچھے موقع کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ اگر کچھ شبہ تھا تو وہ لونگی کی طرف سے تھا۔ وہ راجہ صاحب کا آنا پسند نہ کرتی تھی۔ منورما کو بار بار آنکھوں سے اشارکرتی کہ اندر جا۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے راجہ صاحب اس سے للو چپو کی

باتیں کرتے اور ایک بار ایک قیمتی ساڑھی بھی اس کے نذر کی۔ پر اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اسے لوٹادیا۔ راجہ صاحب کے راستے میں ایک ہی کانٹا تھا اور اسے ہٹائے بغیر وہ منزل مقصود پر نہ پہنچ سکتے تھے۔ آخر انھوں نے منشی جی کو اپنا راز دار بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن انھیں تخلیہ میں بلاکر یوں گفتگو شروع کی۔ علاقہ کا کیا حال ہے۔ فصل تو اب کے بہت اچھی ہے۔

منشی۔ حضور! میں نے اپنی عمر میں ایسی اچھی فصل نہیں دیکھی۔ اگر پورب کے علاقہ میں دو سو کنوئیں بن جاتے۔ تو دو چند فصلیں ہوجاتیں۔

راجہ۔ میں خوذ اسی فکر میں ہوں۔ کنوئیں کیا میں تو ایک نہر بنوانی چاہتا ہوں۔ ارمان تو دل میں بڑے بڑے ہیں۔ مگر سامنے اندھیرا دیکھ کر دل نہیں بڑھتا۔ سوچتا ہوں۔ کس کے لیے یہ دردسر مول لوں۔

اس تمہید کے بعد شادی کا ذکر لازمی تھا۔

راجہ۔ میں اب کیا شادی کروں گا۔ جب اب تک مراد نہ پوری ہوئی تو اب کیا ہوگی۔

منشی۔ غریب پرور! ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ میں نے تو اسّی برس کی عمر میں آدمیوں کے بھاگ جاگتے دیکھے ہیں۔

راجہ۔ پھر مجھ سے اپنی لڑکی کی شادی کون کرے گا۔ مجھے تو ایسی عورت چاہیے۔ جو تعلیم یافتہ ہو۔ بیدار مغز ہو۔ ریاست کے معاملات سمجھتی ہو۔ اور انگریزی طور طریق سے واقف ہو۔ انگریز حکام کی میموں کی خاطر تعظیم کرسکے۔ اور ایک لڑکی میری نگاہ میں ہے بھی۔ لیکن وہاں میری رسائی نہیں۔

منشی۔ کیا اسی شہر میں ہے؟

راجہ۔ شہر میں ہی نہیں گھر میں ہی سمجھیے۔

منشی۔ اچھا سمجھ گیا۔ حضور کے زبان سے نکلنے ہی کی دیر ہے سن کر نہال ہوجائیں گے۔ لڑکی سچ مچ دیوی ہے۔ خدا نے اُسے رانی بننے ہی کے لیے بنایا ہے۔

راجہ۔ آپ ذرا لونگی کی تھاہ تو لیجیے۔ بس لونگی کو راضی کرنا ہے۔ بڑی مغرور عورت ہے۔

منشی۔ حضور! اس کی کنجی میرے پاس ہے۔ خوشامد سے تو اس کا مزاج اور بھی آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ آخر ہے تو نیچ ذات۔

دوسرے دن علی الصبح منشی جی دیوان صاحب کے مکان پر پہنچے۔ دیوان صاحب منورما کے ساتھ گنگا اشنان کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ لونگی اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ منشی جی پھولے نہ سمائے ایسا ہی موقع چاہتے تھے۔ جاتے ہی جاتے شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

لونگی نے کہا۔ تحصیلدار صاحب! کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہمیں اپنی رانی کو دھن کے ہاتھ نہیں بیچنا ہے۔ لڑکی کنگال کو دے دے بوڑھے کو نہ دے۔ غریب رہے گی تو کیا عمر بھر کا رونا جھیکنا تو نہ رہے گا۔

منشی۔ تو راجہ بوڑھے ہیں؟

لونگی۔ اور نہیں تو کیا جوان ہیں؟

منشی۔ اگر شادی نہ ہوئی۔ تو سمجھ لو کہ ٹھاکر صاحب کہیں کے نہ رہیں گے۔ تم نیچ ذات راجاؤں کے رنگ ڈھنگ کیا جانو انھیں جہاں کوئی دُھن سوار ہوگئی تو اُسے پوری کرکے ہی چھوڑیں گے۔ راجاؤں کی بات کو دلکنا ہنسی نہیں ہے۔

لونگی۔ یہ تو انوکھی بات ہے یا تو اپنی بیٹی دے۔ یا میرا گاؤں چھوڑ۔ ایسے دھمکی سے تھوڑا ہی بیاہ ہوتا ہے۔

منشی۔ راجہ مہاراجوں کا کام اسی طرح ہوتا ہے۔ ابھی تم راجہ صاحب کو جانتی نہیں ہو۔ سیکڑوں آدمیوں کو بھنوا کے رکھ دیا۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ جسے چاہیں لٹوالیں۔ مروادیں۔ افسروں سے دوستی ہے۔ کوئی ان کا کیا کرسکتا ہے۔

منشی۔ ڈاکو کہو۔ لٹیرا کہو۔ سبھی کچھ ہیں۔ بات جو تھی میں نے صاف صاف کہہ دی۔ یہ چار پائی پر بیٹھ کر پان چبانا بھول جائے گی۔

لونگی۔ تحصیلدار صاحب! تم تو ایسا دھمکاتے ہو۔ جیسے ہم راجہ صاحب کے ہاتھوں بک گئے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ اپنی نوکری ہی نہ لیں گے۔ لے جائیں۔ بھگوان کا دیا کھانے بھر کو بہت ہے۔

منشی۔ اچھی بات ہے مگر یاد رکھنا کہ خالی نوکری ہی سے ہاتھ دھوکر گلا نہ چھوٹے گا۔

راجہ لوگ جسے نکالتے ہیں کوئی نہ کوئی داغ ضرور ہی لگادیتے ہیں۔ سمجھ سے کام لو۔ بڑوں سے بیر مول لینے میں اپنا نباہ نہیں ہے۔ تم اپنا منہ بند رکھو۔ ہم دیوان صاحب کو راضی کرلیں گے۔ اگر تم نے بھانجی ماری تو ساری بلا تمھارے سر آئے گی۔ ٹھاکر صاحب اس وقت تمھارا کہنا مان جائیں۔ لیکن جب شکنجے میں پھنسیں گے تو سارا بخار تمھارے اوپر اُترے گا۔ سوچو ذرا۔

لونگی بڑے تشویش میں پڑی۔ وہ اور سب کچھ کہہ سکتی تھی۔ دیوان صاحب کا غصہ نہ سہہ سکتی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کے دل میں اس طرح کا خیال آنا بعید از قیاس نہیں۔ منورما کے رنگ ڈھنگ بھی دیکھ چکی تھی۔ جب سبھی راضی ہیں تو میں ہی کیوں اپنے بال نچواؤں۔

ابھی اس نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ دیوان صاحب اشنان کرکے لوٹ آئے۔ لونگی نے انھیں اشارہ سے بلایا اور اپنے کمرے میں لے جاکر بولی۔ راجہ صاحب نے منورما سے بیاہ کے لیے سندیسہ بھیجا ہے۔

ٹھاکر صاحب کے دل میں مسرت سے گدگدی ہونے لگی۔ پوچھا۔ تمھاری کیا صلاح ہے؟

لونگی۔ جو تمھاری مرضی ہو کرو۔ میری صلاح کیا پوچھتے ہو۔

ٹھاکر۔ یہی میری بات کا جواب ہے؟

لونگی۔ میری بات مانوگے تو ہے نہیں۔ پوچھنے سے فائدہ ؟

ٹھاکر۔ کوئی بات بتادو جو میں نے تمھاری مرضی کے خلاف کی ہو۔

لونگی۔ میری مرضی سے کوئی بات بھی نہیں ہوتی۔ تمھیں کوئی بات بتادو۔ جو میری مرضی سے ہوئی ہے۔ تم کرتے ہو اپنے من کی ہاں میں اپنا دھرم سمجھ کے بھونک لیتی ہوں۔

ٹھاکر۔ تمھاری انھی باتوں پر میرا جی جلتا ہے۔ تو کیا چاہتی ہے کہ میں اپنی زبان کٹوالوں۔

لونگی۔ اس کا امتحان تو ابھی ہوا جاتا ہے۔ تب پوچھوں گی کہ کس کی مرضی سے ہورہا ہے۔ میں کہتی ہوں۔ مجھے یہ بیاہ ایک آنکھ نہیں بھاتا، مانتے ہو؟

ٹھاکر۔ ہاں مانتا ہوں۔ جاکر منشی جی سے کہے دیتا ہوں۔

''اگر راجہ صاحب برا مان جائیں تو''؟

''کچھ پرواہ نہیں''۔

''نوکری جاتی رہے''

کچھ پرواہ نہیں''۔

''میرے سر کے بال تو نہ نوچنے لگوگے؟ اگر ایسا کرنا ہو تو میں صاف کہتی ہوں منظور کرلو''

''کیا تم مجھے بالکل ہی گیا گذرا سمجھتی ہو؟ میں ذرا جھگڑے سے بچتا ہوں۔ تو تم نے سمجھ لیا کہ ان میں کچھ دم ہی نہیں ہے۔ پُرزے پُرزے اڑجائیں۔ لیکن بشال سنگھ سے لڑکی کی شادی نہ کروں گا۔ تم نے سمجھا کیا ہے؟

دیوان صاحب اسی جوش میں اٹھے اور جاکر منشی جی سے بولے۔ آپ جاکر راجہ صاحب سے کہہ دیجیے کہ ہمیں شادی منظور نہیں۔

لونگی بھی ٹھاکر صاحب کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ بولی۔ شادی بیاہ میں دولت ہی نہیں دیکھی جاتی اور بھی دیکھنے کی بہت سی باتیں ہیں۔

منشی۔ تو کیا دولت کوئی چیز ہی نہیں؟

لونگی۔ جس کے پاس سنتوش ہے۔ وہی دھنی ہے۔ میں تو یہی جانتی ہوں۔

اسی وقت منورما آکر کھڑی ہوگئی۔ یہ الفاظ اس کے کان میں بھی پڑے۔ سمجھی دولت کی مذمت ہورہی ہے۔ بولی۔ اسے سنتوش نہیں جہالت کہتے ہیں۔

ٹھاکر۔ تب تو دنیا میں جتنی اخلاق اور مذہب کی کتابیں ہیں سب جہالت کا دفتر ہوجائیں گی۔

منورما۔ یہ ساری کتابیں ان لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ جو روپیوں کے محتاج تھے انھوں نے انگور کھٹے سمجھ کر دولت کی مذمت کی۔ تو کوئی تعجب نہیں۔

منشی جی نے دیکھا۔ منورما کے دل کی تھاہ لینے کا اچھا موقعہ ہے، ٹھاکر صاحب کی طرف آنکھیں مار کر بولے۔ منورما۔ میرا خیال تمھارے خیال سے بالکل ملتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسے موقع آجاتے ہیں۔ جب دولت کے مقابلے میں اور بھی کتنی ہی

باتوں کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ میری لڑکی کی شادی درپیش ہے۔ میرے سامنے اس وقت دو بَر ہیں۔ ایک مالدار گھر مگر ادھیڑ۔ دوسرا غریب مگر جوان۔ بتاؤ۔ کس سے لڑکی کی شادی کروں؟۔

منورما نے شرماتے ہوئے کہا۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔

منشی۔ نہیں۔ اس معاملے میں تمھاری رائے مقدم سمجھتا ہوں۔

منورما۔ اس کا فیصلہ ماں باپ ہی خوب کرسکتے ہیں۔ ہاں میں اتنا ضرور کہوں گی۔ دولت اتنی حقیر چیز نہیں۔

یہ کہہ کر منورما چلی گئی۔ دیوان صاحب تو منورما کی باتیں سن کر کچھ مائل ہوئے مگر لونگی اپنی ضد پر قائم رہی۔ منشی جی مایوس ہوکر رخصت ہوئے۔ راستے میں سوچا اگر راجہ صاحب سے کہے دیتا ہوں کہ دیوان صاحب نے صاف انکار کردیا ہے تو میری کرکری ہوتی ہے۔ اس لیے کچھ ایسی گول مول باتیں کروں کہ اپنا وقار بھی قائم رہے اور راجہ صاحب بھی خوش ہوں۔ جاکر بولے۔ حضور! بُڑھیا بلا کی چڑیل ہے۔ اِدھر بھی جھکتی ہے اُدھر بھی۔ اور دیوان صاحب تو نرے مٹی کے ڈھیلے ہیں۔

راجہ صاحب نے بے صبر ہوکر پوچھا آخر آپ طے کیا کر آئے؟

منشی۔ حضور کے اقبال سے فتح ہوئی۔ میں نے موقع پاکر منورما رانی سے تذکرہ کیا وہ سن کر بہت خوش ہوئی۔

راجہ۔ اچھا منورما خوش ہوئی۔ آپ نے کیسے جانا کہ خوش ہے؟

منشی۔ حضور! سب کچھ صاف صاف کہہ ڈالا۔ عمر کا فرق کوئی چیز نہیں۔ آپس میں محبت ہونی چاہیے اور کتنی ہی باتیں اس قسم کی ہوئیں۔

راجہ۔ تو میں آج ہی بات چیت شروع کردوں؟ میں آج ٹھاکر صاحب کی دعوت کروں گا اور منورما کو بھی بلاؤں گا۔ آپ بھی آجایئے گا۔

راجہ صاحب نے باقی دن دعوت کی تیاریوں میں صرف کیا۔ حجامت بنوائی۔ پکے بال نکلوائے۔ اُبٹن ملوایا۔ اپنی بہترین اچکن نکالی۔ زعفرانی رنگ کا ریشمی صافہ باندھا گلے میں موتیوں کی مالا ڈالی۔ ماتھے پر کیسر کا تلک لگایا۔ کمر میں ریشمی کمر بند لپیٹا۔ کندھے پر شاہ رومال رکھا۔ مخملی غلاف میں رکھی ہوئی تلوار کمر میں لٹکائی۔ اور سج

سجا کر جب وہ کھڑے ہوئے۔ تو عمر کا عیب ایک حد تک رفع ہوگیا تھا۔ ان کے مردانہ حسن اور سڈول جسم پر لباس اور زیور خوب کھل رہے تھے۔

آٹھ بجتے بجتے دیوان صاحب اور منورما آ پہنچے۔ راجہ صاحب اُن کا خیر مقدم کرنے دوڑے۔ منورما نے ان کی صورت دیکھی تو مسکرائی۔ گویا کہہ رہی تھی۔ اوہو! آج تو کچھ اور ہی ٹھاٹ ہیں۔ اس نے بھی آج ایک نرالی وضع اختیار کی تھی۔ جسم پر ایک بھی زیور نہ تھا۔ صرف ایک سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس سادگی نے اس کے حسن لطیف کو اور بھی چمکادیا تھا۔ صنعت پر وہ ہے معنی کے افلاس کا۔ حسن معنی کو صنعت کی ضرورت نہیں۔ نزاکت زیوروں کا بوجھ نہیں سہہ سکتی۔

دیوان صاحب اس وقت بہت متفکر معلوم ہوتے تھے۔ ان کی حمایت کرنے کے لیے یہاں لونگی نہ تھی۔ اور بہت جلد ان کے سامنے ایک مشکل مسئلہ پیش ہونے والا تھا۔ دعوت کا منشا وہ خوب سمجھ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کہوں گا۔ لونگی نے چلتے چلتے انھیں سمجھا کر کہہ دیا تھا۔ "ہاں" نہ کرنا مگر ٹھاکر صاحب ان بہادروں میں نہ تھے۔ جن کی پیٹھ پر میدان میں بھی ہاتھ پھیرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے چارے بل سا ڈھونڈ رہے تھے کہ کہاں چھپ جاؤں۔ دفعتاً منشی بجردھر آگئے۔ دیوان صاحب کو آنکھیں سی مل گئیں۔ انھیں الگ کمرے میں لے جاکر مشورہ کرنے لگے۔ منورما پہلے ہی جھولے گھر میں آکر ٹہل رہی تھی۔ اب نہ وہ شگفتگی تھی نہ وہ رونق نہ وہ صفائی۔ راجہ صاحب ہر ایک چیز اسے دکھا رہے تھے۔

منورما نے کہا۔ رانی صاحب کے سامنے اس جھولے گھر میں کتنی رونق تھی۔ اب جدھر دیکھتی ہوں۔ سونا سونا نظر آتا ہے۔

راجہ نے بانکپن انداز سے کہا۔ اب تمھارے ہی ہاتھوں اس کے دن پھریں گے۔ منورما! یہ بھی میرے دل کی طرح تمھاری طرف آنکھیں لگائے بیٹھا ہے۔

محبت کے یہ الفاظ پہلی بار منورما کے کانوں میں پڑے۔ اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہوگیا۔ وہ سہمی سہمی کھڑی رہی کچھ بول نہ سکی۔

راجہ صاحب بولے۔ تم میری باتیں سن کر دل میں ہنس رہی ہوگی۔ مگر میں ہنسی کے قابل نہیں۔ رحم کے قابل ہوں۔ تم نے میرے دل میں ان جذبات کو بیدار

کردیا۔ جو بہت عرصہ ہوا مردہ ہو چکے تھے۔ ان کی قدر کرو یا ٹھکرادو۔ میں نے اپنے کو تمھارے نگاہِ کرم پر چھوڑ دیا۔

منورما کا حجاب رخصت ہوگیا۔ ذمہ داری کی شان سے بولی۔ بہتر ہوتا کہ آپ نے دادا جی سے یہ ذکر کیا ہوتا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ مجھے اپنی توجہ کے قابل سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ میں آپ کو خوش نہ رکھ سکوں گی۔ میری دلی خواہش ہمیشہ رہی ہے کہ آزاد رہوں۔

راجہ نے مسکراکر کہا۔ منورما! محبت تو کوئی قید نہیں ہے۔

منورما۔ محبت قید نہ ہو۔ پر فرض تو قید ہے۔ میں محبت کی قید سے نہیں گھبراتی۔ دھرم کی قید سے گھبراتی ہوں۔ آپ کو مجھ پر بڑی سختی سے حکومت کرنی پڑے گی۔ میں آپ کو اپنی کنجی پہلے ہی بتائے دیتی ہوں۔ میں آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔ مجھے آپ سے پریم نہیں ہے۔ شاید ہو نہ سکے گا۔ (مسکراکر) میں رانی بننا چاہتی ہوں، پر کسی راجہ کی نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پریم کرنے کے لیے بنائی نہیں گئی۔

راجہ۔ تم اپنے اوپر ظلم کر رہی ہو۔ منورما! تمھارے انداز تمھاری مخالفت کررہے ہیں۔ تمھارے دل میں وہ نور ہے جس کی ایک کرن میری زندگی کی ساری تاریکیوں کو روشن کرے گی۔

منورما نے شوخی سے کہا۔ میں دونوں ہاتھوں سے دولت اڑا دوں گی آپ کو بُرا تو نہ لگے گا۔

راجہ۔ منورما یہ راج تمھارے قدموں پر نثار ہے۔ میں خود تمھارا غلام ہوں۔

منورما۔ مجھے باتیں کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ لونگی اماں کہتی ہے کہ تو باتیں کرتی ہے تو لاٹھی سی مارتی ہے۔

راجہ نے مست ہوکر کہا۔ منورما! تمھاری ساری ادائیں البیلی ہیں۔ میں تو ایک ایک ادا پر مِٹا جارہا ہوں۔

قدموں کی آہٹ پاکر دونوں ٹھٹھک گئے۔ منشی جی اور دیوان صاحب آرہے تھے۔

منشی جی نے راجہ صاحب کو دیکھتے ہی اُچھل کر کہا۔ حضور کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آج جشن ہونا چاہیے۔ (منورما سے) مہارانی! آپ کا سہاگ سدا سلامت رہے۔

دیوان صاحب سٹپٹا کر بولے۔ ذرا گھر میں ....

منشی جی نے بات چھین کر کہا۔ جناب ! کار خیر میں پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ دعا دیجیے جوڑی سلامت رہے۔

منشی جی نے سارا پروگرام پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ بینڈ تو دعوت کا لازمہ ہے ہی۔ ہوا خواہوں کو بھی جمع کرر کھا تھا۔ اشارہ ملتے ہی چاروں طرف سے مبارک، سلامت کی دھوم مچ گئی۔ باغ میں بینڈ بجنے لگا۔ دیوان صاحب کی آنکھوں کے سامنے اُن کا گھر لُٹا جاتا تھا۔ پر زبان کھولنے کا موقعہ نہ تھا۔ سر جھکائے حواس باختہ کھڑے تھے۔ نہ کچھ کہتے بنتا تھا نہ سنتے۔ دل میں منشی جی کو ہزاروں گالیاں دے رہے تھے۔ ایسی جگہ ماروں جہاں پانی نہ ملے۔ میرے ہی ساتھ یہ ہتھکنڈے! لونگی کے سامنے کون منہ لے کر جاؤں گا۔

ڈراما ختم ہوچکا تھا۔ مہمان رخصت ہوچلے تھے۔ دربان اور چوبدار بھی سرمت خواب تھے۔ مگر راجہ صاحب باغیچہ میں ہری ہری گھاس پر ٹہل رہے تھے۔ نسیم کے ان لطیف دلکش ، دھیمے، فرحت بخش جھونکوں میں چاند کی اس لطیف دلکش مدھم ، فرحت بخش ضیا میں اور باغ کی لطیف دلکش بھینی۔ فرحت بخش۔ فضا میں منورما ہی ادا تھی۔ منورما ہی کا جلوہ تھا۔ منورما ہی کا سرور تھا۔

(18)

چکردھر کو جیل میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ ایک نئی دنیا میں آگئے۔ جس کا خالق انسان ہے لیکن انسان کے رچے ہوئے سنسار میں انسانیت کا اتناخون ہوسکتا ہے اس کا انھیں قیاس بھی نہ تھا۔ کھانا اتنا خراب کہ شاید کتے بھی سونگھ کر چھوڑ دیں۔ کپڑے ایسے خراب کہ بھکاری بھی نہ پوچھے اور محنت اتنی زیادہ کہ بیل بھی نہ کرسکے۔ جس محنت سے ایک کنبہ کی پرورش ہوسکتی تھی۔ وہ ایک پیٹ کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ یہی انسانی انصاف کا نمونہ ہے۔ ایک خطا وار انسان کو سزا دے کر آپ ایک بے

خطا کنبہ کا کتنی بیدردی سے خون کرتے ہیں۔ انسان جرم کرتے وقت اکثر اپنے گھر والوں سے مشورہ نہیں لیتا۔ وہ جرم میں اس کے معاون نہیں ہوتے۔ زیادہ تر جرم تو ایسے ہوتے ہیں جن کی گھر والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ پھر بالغوں کی کیا خطا؟ ان پر کیوں ظلم کرتے ہو۔ شروع سے آخر تک سارا طرز عمل شرمناک نفرت انگیز اوروحشیانہ ہے۔

چکردھر کو چکی پیسنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ صبح سے شام تک چکی میں جُٹے رہنا پڑتا۔ صرف دوپہر کو کھانے کی چھٹی ملتی تھی۔ وہ اس کی ہمیشہ احتیاط رکھتے کہ عملوں کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔ لیکن گالیوں میں باتیں کرنا ہی جن کا شعار ہوگیا ہو۔ ان سے بچنا محال تھا۔

لیکن یہیں تک مصیبت کا خاتمہ نہ تھا۔ ان کے کمرے میں پانچ اور قیدی تھے۔ وہ سب اُن پر گندے۔ حیا سوز آوازے کستے۔ غصہ اور نفرت سے ان کا خون جوش کھانے لگتا۔ پر لہو کا گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ اور اپنے تحفظ کا اپنی ہمت اور قوت کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہوتا تھا۔ ان پانچوں میں دھناسنگھ نام کاایک ٹھاکر بھی تھا۔ نہایت شہ زور غضب کا خونخوار وہی ان کا سرغنہ تھا۔ وہ سب اتنی بدزبانیاں کرتے۔ ایسے فحش کلمات منہ سے نکالتے کہ چکردھر کو کانوں میں اُنگلیاں ڈالنی پڑتی تھیں۔ انھیں ہر لحہ یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ یہ سب میرے درپے آزار نہ ہوجائیں۔ رات کو جب تک وہ نہ سوجائیں وہ خود نہ سوتے تھے۔ حکم تو یہ تھا کہ کوئی قیدی تمباکو بھی نہ پینے پائے مگر وہاں گانجہ بھنگ، شراب، افیون یہاں تک کہ کوکین بھی نہ جانے کس تکڑم سے پہنچ جاتی تھی۔ نشے میں وہ سب اتنے بے خود ہوجاتے۔ گویا انسان کی صورت میں شیطان ہوں۔

لیکن رفتہ رفتہ چکردھر کوان آدمیوں سے ہمدردی ہونے لگی۔ سوچے۔ اس فضامیں آکر ایسا کون انسان ہے جو انسانیت کے درجہ سے نہ گذر جائے۔ انھیں سبھی درجوں کے آدمیوں سے ملنے کا سابقہ پڑچکا تھا۔ پر ایسے بے شرم، گالیاں کھاکر ہنسنے والے بے حیاآدمی اب تک انھوں نے نہ دیکھے تھے۔ پہلے وہ ان سے احتراز کرتے تھے۔ ان سے کنارہ کش رہتے تھے۔ لیکن اب ان کی حالت پر انھیں رحم آتا تھا۔ کوئی

قیدی انھیں گالی دے دیتا تو چپکے ہوجاتے اور اس تاک میں رہتے کہ کب اس کے ساتھ شرافت کے اظہار کا موقعہ ملے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ بُرے بُرے انسان میں بھی نازک جذبات بالکل فنا نہیں ہوجاتے۔ وہ انھیں نازک تاروں پر انگلی رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ قیدیوں پر اس برتاؤ کا اثر ہونے لگا۔ جہاں چکردھر کا مذاق اڑاتے تھے، ان پر آوازے کستے تھے۔ وہاں اب کچھ ان کا لحاظ کرنے لگے۔ روحوں کو روح ہی کی آواز جگاسکتی ہے۔ چکردھر کی زندگی میں روحانیت کو کبھی اتنا دخل نہ تھا۔ ان کے اطوار کبھی اتنے پاکیزہ نہ تھے۔ جب موقع ملتا تو قیدیوں کو مذہبی روایتیں سناتے۔ خدا کے رحم اور عفو کے تذکرے کرتے۔ خدا اپنے بندوں سے کتنی محبت رکھتا ہے۔ ان کے گناہوں کو اپنے فضل وکرم سے معاف کردیتا ہے بشرطیکہ ہم اپنے دل سے اپنے افعال پر نادم ہوں۔ یہی ان روایتوں کا موضوع تھا۔ قیدیوں کو ان تمثیلوں میں اتنا لطف آتا تھا۔ گویا ان کا ایک ایک لفظ ان کے دل پر مرتسم ہوتا جاتا تھا۔

اس طرح کئی مہینے گزرگئے۔ ایک دن شام کے وقت چکردھردن بھر کی محنت شاقہ کے بعد بیٹھے ہوئے تھے کہ کئی قیدی آپس میں باتیں کرتے ہوئے نکلے۔ آج اس داروغہ کی خبر لینی چاہیے۔ جب دیکھو گالیاں دیا کرتا ہے۔ سیدھے منہ تو بات بھی نہیں کرتا۔ آخر ہم تو آدمی ہیں۔ کہاں تک سہیں۔ ایسا مارو کہ عمر بھر کے لیے یاد ہوجائے۔ یہی نہ ہوگا۔ سال دوسال کی میعاد اور بڑھ جائے گی۔

چکردھر اس طرح کے چرچے اکثر سنتے رہتے تھے۔ اس لیے اس پر کچھ دھیان نہ دیا۔ مگر کھانے کے وقت جوں ہی داروغہ آکر کھڑے ہوئے اور ایک قیدی کو دیر میں آنے کے باعث مارنے دوڑے کہ کئی قیدی چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ داروغہ صاحب بدحواس ہوگئے کہیں بھاگنے کا راستہ نہیں۔ چاروں طرف بیکسانہ نظروں سے تاکنے لگے۔ جیسے کوئی بکرا بھیڑیوں کے بیچ میں آپھنسا ہو۔ دفعتاً دھنا سنگھ نے آگے بڑھ کر گردن پکڑی اور اتنی زور سے دبائی کہ ان کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ چکردھر نے دیکھا کہ غضب ہوا جاتا ہے تو تیر کی طرح جھپٹے۔ قیدیوں کے بیچ میں گھس کر دھنا سنگھ کو پکڑ لیا اور بولے۔ ہٹ جاؤ کیا کرتے ہو؟

دھنا سنگھ کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ لیکن اس نے گردن نہ چھوڑی۔
چکردھر۔ چھوڑو۔ ایشور کے لیے۔
دھنا سنگھ۔ جاؤ بھی۔ بڑی ایشور کی پوچھ بنے ہو۔ جب روز گالیاں دیتا ہے، بات بات پر ہنٹر جماتا ہے تب ایشور کہاں سویا رہتا ہے، جو اس وقت جاگ اٹھا۔ ہٹ جاؤ سامنے سے پہلے اس سے پوچھو۔ اب تو کسی کو گالیاں نہ دے گا؟
داروغہ نے قسم کھائی کہ اب وہ کسی کو کبھی نہ گالی دے گا۔
دھنا سنگھ۔ کان پکڑو!
داروغہ نے کان پکڑے۔
دھنا سنگھ۔ جاؤ بچہ۔ بھلے کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ نہیں تو آج جان نہ بچتی۔ یہاں کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔
چکردھر۔ داروغہ جی! خدا کے لیے اب اس ... کو طول نہ دیجیے گا۔
داروغہ۔لاحول ولاقوۃ! اتنا کمینہ نہیں ہوں۔
داروغہ صاحب وہاں سے چلے تو دھنا سنگھ نے کہا۔ جاتے تو ہو داروغہ جی! لیکن گارد سارد بلایا تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا سمجھائے دیتا ہوں۔ ہم کو کیا نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا رنج۔ لیکن تمھارے نام کو رونے والا کوئی نہ رہے گا۔
داروغہ جی یہاں سے تو جان بچا کر بھاگے۔ لیکن دفتر میں جاتے ہی گارد کے سپاہیوں کو للکارا۔ حاکم ضلع کو ٹیلیفون کیا اور خود بندوق لے کر جنگ کے لیے تیار ہوگئے۔ دم کے دم میں سپاہیوں کی جماعت سنگینیں چڑھائے آپہنچی۔ پیچھے پیچھے داروغہ جی بھی دوڑے۔
چکردھر پر چاروں طرف سے بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔
دھنا سنگھ۔اب کہو بھگت جی جاکر داروغہ کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ گولی چلی تو؟
چکردھر۔ تم لوگ خاموش رہوگے تو گولی نہ چلے گی۔ میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور داروغہ سے پوچھا۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ ان غریبوں کو کیوں گھیر رکھا ہے؟
داروغہ نے سپاہیوں کو آڑ سے کہا۔ یہی ان سب بدمعاشوں کا سرغنہ ہے۔ اسے

گرفتار کرلو۔ اور سبھوں کو خوب مارو!

قیدیوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کچھ تو جان لے کر بھاگے کچھ اِدھر ادھر سے پھاوڑے کدالیں، پتھر لالا کر لڑنے کو تیار ہوگئے۔ موقع نازک تھا چکردھر نے بڑی عاجزی کے ساتھ داروغہ سے کہا۔ میں آپ کو پھر سمجھاتا ہوں۔

داروغہ۔ چپ رہ سُور کا بچہ !

اتنا سنتا تھا کہ چکردھر باز کی طرح داروغہ جی پر جھپٹے۔ لیکن فوراً ہی انھیں خیال آیا۔ حالت اور بھی نازک ہوجائے گی۔ بندوقیں چلنے لگیں گی اور لاشوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ وہ قیدیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن قیدیوں پر جنون سوار تھا۔ ایک ایک سپاہی پر دس دس قیدی ٹوٹ پڑے۔ اور آناً فاناً ان کی بندوقیں چھین لیں۔ سپاہیوں کے ایسے ہاتھ پاؤں پھولے کہ بندوقوں پر قبضہ بھی نہ رکھ سکے۔ قیدیوں کی تعداد اور ان کے سرفروشانہ جوش نے انھیں مغلوب کردیا۔ قیدیوں نے فوراً ان کی مشکیں کس دیں اور بندوقیں لے لے کر ان کے سر پر کھڑے ہوگئے۔ سب کچھ پانچ منٹ کے اندر ہی ہوگیا۔ دھنا سنگھ لپکا ہوا داروغہ کے پاس آیا اور زور سے ایک دھکا دے کر بولا۔ کیوں خاں صاحب! اُکھاڑوں داڑھی کا ایک ایک بال۔

چکردھر۔ دھنا سنگھ ہٹ جاؤ!

دھنا۔ مرنا تو ہے ہی اب اسے کیوں چھوڑیں۔

چکردھر۔ ہم کہتے ہیں۔ ہٹ جاؤ۔ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔

دھنا۔ اچھا ہو یا برا۔ اب تو اسے نہ چھوڑیں گے۔

ایک قیدی نے کہا۔ ایک ایک کی ہڈیاں توڑدیں۔ دو دو چار چار سال اور سہی۔ آخر گھوم گھوم کے یہیں پھر تو آنا ہے۔

چکردھر۔ میرے دیکھتے تو ان پر آنچ نہ آنے پائے گی۔ ہاں مرجاؤں تو جو چاہے کرنا۔

دھنا۔ اگر ایسے ہی بڑے دھرماتما ہو تو انھیں کیوں نہیں سمجھاتے۔

اتنے میں صدر پھاٹک پرشور وغل سنائی دیا۔ حاکم ضلع مسٹر جم مسلح پولیس افسروں اور جوانوں کے ساتھ آپہنچے تھے۔ داروغہ جی نے اندر آتے وقت صدر کے قفل کی کنجی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ سوال تھا۔ دروازہ کون کھولے۔ قیدیوں نے

دیکھا کہ اب جان بچنے کی کوئی امید باقی نہیں تو انھیں یہی سوجھی کہ داروغہ اور گارڈ کے سپاہیوں کو ختم کردیں۔ مرنا ہی ہے تو دس پانچ کو مار کر مریں۔ دھناسنگھ سنگین چڑھائے داروغہ پر جھپٹا۔ قریب تھا کہ سنگین کی نوک ان کے سینے کے خون سے اپنی زبان تر کرے کہ چکردھر ہاں! ہاں! کرتے ہوئے داروغہ کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ دھناسنگھ وار کرچکا تھا۔ چکردھر کے کندھے پر سنگین کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ خون کا فوارہ نکل پڑا۔ چکردھر کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ داہنے ہاتھ سے کندھے کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر قیدیوں کے خون خشک ہوگئے۔ اپنی خطرناک حالت کا خیال نہ رہا۔ آ آکر چکردھر کے چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔ بھگت جی! اب نہ بچیں گے۔ یہ خیال ان کے شیطانی جنون پر غالب آگیا۔ حواس مفلوج ہوگئے۔ دھناسنگھ نے بندوق پھینک دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جو بھگت جی ان کی خاطر ہمیشہ افسروں سے لڑنے کو تیار رہتے تھے جو ہمیشہ انھیں اچھے راستہ پر لے جانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جو ان کی شرارتوں کو ہنسی میں اُڑا دیتے تھے وہی بھگت جی اس وقت دھنا کے ہاتھوں زخمی پڑے ہیں۔ شاید کوئی دم کی مہمان ہوں۔ دھناسنگھ کو کئی قیدیوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر وہی سنگین اپنے سینے میں چبھا لے۔ لیکن قیدیوں نے اتنے زور سے پکڑ رکھا تھا کہ اس کا بس نہ چلتا تھا۔

داروغہ نے موقع پایا تو صدردروازے کی طرف دوڑے۔ دھناسنگھ نے دیکھا کہ وہی ذاتِ شریف جو سارے فساد کے بانی ہیں بے داغ بچے جاتے ہیں۔ تو اس کے جوش انتقام نے اتنا زور مارا کہ ایک ہی جھٹکے میں وہ قیدیوں کے ہاتھوں سے آزاد ہوگیا اور بندوق اٹھاکر ان کے پیچھے دوڑا۔ چکردھر کے خون کا بدلہ لینا ضروری تھا۔ چکردھر سیلان خون سے اتنے کمزور ہورہے تھے کہ جگہ سے ہلنا بھی مشکل تھا۔ لیکن دھناسنگھ کو داروغہ کے پیچھے دوڑتے دیکھا تو پھر سنبھل کر اُٹھے اور ایک ہاتھ سے اپنا کندھا پکڑے لڑکھڑاتے ہوئے چلے۔ دھناسنگھ نے انھیں آتے دیکھا تو اس کے قدم رُک گئے۔ بھگت ابھی زندہ ہے۔ اِس کی اس کو اتنی خوشی ہوئی کہ وہ بندوق پھینک کر پیچھے کی طرف چلا۔ اور ان کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ایسی سچی خوشی اُسے اپنی زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔

چکردھر نے کہا۔ گارد والوں کو چھوڑ دو!

دھنا۔ بہت اچھا بھیا! تمھارا جی کیسا ہے؟

چکردھر۔ دیکھنا چاہیے۔ بچتا ہوں یا نہیں۔

دھنا۔ خان صاحب کے بچ جانے کا افسوس رہ گیا۔

ادھر داروغہ نے دروازہ کھول دیا اور مسٹر جم مسلح پولیس کے ساتھ جیل میں داخل ہوئے۔ انھیں دیکھتے ہی سارے قیدی جان لے کر بھاگے۔ صرف دو آدمی چکردھر کے ساتھ کھڑے رہے۔ دھنا سنگھ ان میں ایک تھا۔ گاروالوں نے بھی چھوٹتے ہی اپنی اپنی بندوقیں سنبھالیں اور ایک قطار میں کھڑے ہوگئے۔

مسٹر جم نے پوچھا۔ ویل داروغہ کیا حال ہے؟

داروغہ۔ حضور کے اقبال سے فتح ہوگئی۔

جم۔ یہ کون آدمی پڑا ہے؟

داروغہ۔ اسی نے تو ہم لوگوں کی مدد کی ہے حضور! چکردھر نام ہے۔

جم۔ اچھا یہ وہی چکردھر ہے جس نے راجہ صاحب کے آدمیوں کو بھڑکایا تھا؟

داروغہ۔ جی ہاں حضور! آج تو اسی کی بدولت ہم لوگوں کی جانیں بچیں۔ جو زخم اس کے کندھے میں ہے وہ اس وقت میرے سینے میں ہوتا۔

جم۔ اس نے قیدیوں کو بہکایا ہوگا؟

داروغہ۔ نہیں حضور! اس نے قیدیوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

جم۔ او! آپ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ قیدیوں سے مذہب کی بات چیت تو نہیں کرتا؟

داروغہ۔مذہبی باتیں تو کرتا ہے حضور! یہاں بھگت مشہور ہے!

جم۔ او! تب تو یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ مذہب والے آدمیوں سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ جب کوئی پڑھا لکھا آدمی مذہب کی بات چیت کرے۔ تو فوراً سمجھ لو کہ وہ کچھ گول مال کرنا چاہتا ہے۔ وہ قیدیوں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوگا۔

داروغہ۔ جی ہاں۔ ہمیشہ۔

جم۔ سرکاری احکام کو خوب مانتا ہوگا۔

داروغہ۔ جی ہاں! ہمیشہ۔

جم۔ کبھی کسی بات کی شکایت نہ کرتا ہوگا۔

داروغہ۔ جی نہیں۔ کبھی شکایت نہیں کرتا۔ ایسا بے زبان آدمی تو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔

جم۔ ایسا آدمی نہایت خوفناک ہوتا ہے۔ اس پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ سپاہیوں کو دفتر میں بلاؤ۔ ہم ان کے بیان لکھیں گے۔

داروغہ۔ حضور! پہلے اسے ڈاکٹر صاحب کو دکھادوں۔ ایسا نہ ہو مرجائے۔

جم۔ وہ مرے گا نہیں۔ ایسا خوفناک آدمی کبھی نہیں مرتا اور مر بھی جائے گا تو ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

یہ کہہ کر مسٹر جم دفتر کی طرف چلے۔ دھناسنگھ اب تک اس انتظار میں کھڑا تھا کہ ڈاکٹر صاحب آتے ہوں گے۔ جب دیکھا کہ جم صاحب ادھر مخاطب بھی نہ ہوئے تو اس نے چکردھر کو گود میں اٹھالیا اور ہسپتال لے چلا۔

(19)

ٹھاکرہری سیوک سنگھ دعوت کھاکر گھر آئے تو ڈر رہے تھے کہ لونگی پوچھے گی تو کیا جواب دوں گا۔ اگر کہوں کہ منشی جی نے میرے ساتھ دغا کیا تو زندہ نہ چھوڑے گی۔ طعنوں سے کلیجہ چھلنی کردے گی۔چڑیل وکیلوں کی طرح تو بحث کرتی ہے۔ بس اُسے راضی کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے۔ کسی جوتشی کو پھانسنا چاہیے۔ جو اس کے سامنے تصدیق کرے کہ اس نسبت میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں۔

وہ ابھی کپڑے ہی اتار رہے تھے کہ لونگی نے آکر پوچھا۔ وہاں کیا بات چیت ہوئی!

دیوان صاحب نے کہا۔ شادی ٹھیک ہوگئی اور کیا؟

"اور میں نے اتنا سمجھا جو دیا تھا"۔

"تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے"۔

"تقدیر پر بھروسہ وہ کرتا ہے جو خود کچھ نہیں کرسکتا"۔

تم مجھے جتنا احمق سمجھتی ہو۔ اتنا احمق نہیں ہوں۔ میں نے راجہ صاحب کا

زائچہ جوتشی کو دکھاکر تب نسبت قبول کی۔

راجہ نے کسی پنڈت کو سکھاپڑھا کر کھڑا کردیا ہوگا۔

ایسا نادان نہیں ہوں۔ وہ اس شہر کے نامی جوتشی ہیں۔ میری ان سے پرانی ملاقات ہے۔

تم کل اُن پنڈت جی کو یہاں بلالے آنا۔ جب تک میں ان سے خود نہ پوچھوں گی مجھے یقین نہ آئے گا۔

دوسرے دن علی الصبح لونگی نے پنڈت کی رٹ لگائی اور دیوان صاحب کو لاچار ہوکر منشی بجردھر کے پاس جانا پڑا۔

منشی جی ساری داستان سن کر بولے۔ آپ نے یہ بُرا مرض پال رکھا ہے۔ ڈانٹ کر کہہ کیوں نہیں دیتے۔ تجھے ان باتوں سے کیا مطلب؟

دیوان صاحب نے کہا۔ بھئی اتنی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ میں تو اس سے پوچھے بغیر کھانا بھی نہیں کھاسکتا۔ کبھی ذرا روٹھ جاتی ہے۔ تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ آپ کی کسی جوتشی سے ملاقات تو نہیں ہے؟

منشی جی بولے۔ ملاقات تو کتنوں ہی سے ہے۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ کام کس سے نکلتا ہے۔ کوئی جوتشی بنانا پڑے گا۔

یہ کہہ کر منشی جی نے جھنکو کو بلایا۔ وہ ایک ہی چھٹا ہوا فوراً تیار ہوگیا۔ گھر جاکر ماتھے پر تلک لگایا گلے میں رام نامی چادر ڈالی۔ سر پر ایک گول ٹوپی رکھی اور ایک بستہ بغل میں دبائے آن پہنچا۔

منشی جی اسے دیکھ کر بولے۔ یار ذرا سی کسر رہ گئی۔ توند کے بغیر پنڈت کچھ جچتا نہیں۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کو ترمال نہیں ملتے۔ جبھی تانت ہورہا ہے۔ توندیل آدمی کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ چاہے پنڈت بنے چاہے سیٹھ۔ چاہے تحصیلدار ہی نہ بن جائے۔ میں تو توندیل ہوتا تو اب تک نہ جانے کس عہدہ پر ہوتا۔ بہت گھی دودھ کھایا۔ تقدیر میں بڑا آدمی ہونا نہ لکھا تھا۔ توند نہ نکلی نہ نکلی۔ توند بنالو نہیں نہیں تو اُلو بناکر نکال دیئے جاؤگے۔

جھنکو۔ سرکار توند ہوتی تو آج مارا مارا کیوں پھرتا۔ مجھے بھی نہ لوگ جھنکو استاد کہتے۔

مگر توند نہ ہونے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہاں پنڈت بنا توند کے ہیں۔

منشی۔ کوئی بڑا پنڈت بھی ہے بے توند کا؟

جھنکو۔ نہیں سرکار! کوئی بڑا پنڈت تو نہیں ہے۔ کہیے پیٹ پر کچھ کپڑے لپیٹ لوں؟

منشی۔ تم تو کپڑے لپیٹ کر تاپ تلی کے مریض سے معلوم ہوگئے۔ تقدیر پیٹ پر سب سے زیادہ چمکتی ہے۔ لیکن اور اعضاء پر بھی کچھ نہ کچھ اثر تو ہوتا ہی ہے۔ یہ راگ نہ چلے گا بھئی۔ کسی اور کو پھانسو۔

مگر منشی جی کا شبہ غلط نکلا۔ جھنکو توند بناکر پورا جوتشی ہوگیا اور تینوں آدمی دیوان صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ منشی جی نے اندر جاکر کہا۔ کوئی نیا آسن بچھائے گا۔ جوتشی جی کرسی پر نہیں بیٹھتے۔ آج نہ جانے کیا سمجھ کر اس وقت آگئے۔ نہیں تو دوپہر کے پہلے کوئی لاکھ روپے دے تو نہیں جاتے۔

پنڈت جی بڑی شان کے ساتھ موٹر سے اُترے اور جاکر آسن پر بیٹھے۔ لونگی نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور ترش ہوکر بولی۔ آپ جوتشی ہیں؟ ایسی ہی صورت ہوتی ہے جوتشیوں کی؟ مجھے تو کوئی بھانڈ سے معلوم ہوتے ہو۔

منشی جی نے دانتوں تلے انگلی دبائی۔ دیوان صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھا اور جھنکو کے چہرے پر تو مردنی چھا گئی۔ آخر منشی جی بولے۔ یہ کیا غضب کرتی ہو ٹھکرائن صاحب! اپنے گھر بلا کر مہاتماؤں کی یہی عزت کی جاتی ہے۔

لونگی۔ لالہ! تم نے بہت دنوں تحصیلداری کی ہے۔ تو میں نے بھی دھوپ میں بال نہیں پکائے ہیں۔ ایک بہروپیے کو لاکر کھڑا کردیا۔ اُوپر سے کہتے ہو جوتشی ہے۔

جھنکو۔ ماتا! تم نے میرا بڑا اپمان کیا۔ اب میں یہاں چھن بھر بھی نہ بیٹھوں گا۔ سنسار میں ایسا کون ہے جو مجھے نہیں جانتا۔

لونگی۔ لے بس چلے جاؤ میرے گھر سے دغا باز جالیا کہیں کا۔ بڑا جوتشی ہے تو بتا میری عمر کتنی ہے۔ تم سب لوگ کیوں میری کنیا کو کنوئیں میں دھکیل رہے ہو کیوں اس کے دشمن بنے ہوئے ہو؟ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ بوڑھے آدمی کے ساتھ کوئی لڑکی کیسے سکھی رہ سکتی ہے۔ دھن پاکر بوڑھے جوان تو نہیں

ہو جاتے۔

جھنکو۔ ماتا جی راجہ صاحب کی عمر جوتش بدیا کے حساب سے......

لونگی۔ تو پھر بولا۔ چپکا بیٹھا کیوں نہیں رہتا؟

جھنکو۔ دیوان صاحب! اب میں نہیں ٹھہر سکتا۔

وہ جانے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ لونگی لپک کر کوٹھری میں گئی۔ کجروٹے سے کاجل نکالا اور فوراً باہر آکر جھنکو کے منہ میں پوت دیا۔ بہت اُچھلے کودے پر لونگی نے جو بھر بھی نہ ہلنے دیا۔ دیوان صاحب اب اپنی ہنسی کو نہ روک سکے۔ مارے ہنسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور لونگی جھنکو کو دبوچے ہوئے چلارہی تھی۔ تھوڑا ساچونہ لاؤ تو پوری دکشنا دے دوں۔

آخر منشی جی کو غصہ آگیا۔ لونگی کا ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ جھنکو کا گلا چھڑادیں۔ لونگی نے جھنکو کو تونہ چھوڑا۔ ایک ہاتھ سے تو وہ اس کی گردن پکڑے ہوئے تھی۔ دوسرے ہاتھ سے منشی جی کی گردن پکڑلی۔ اور بولی۔ مجھ سے زور دکھاتے ہو۔ لالہ۔ بڑے مرد ہو تو چھڑا لو گردن۔ بہت دودھ گھی بیکار میں کھایا ہوگا۔

دیوان صاحب نے ہنس کر کہا۔ منشی جی! آپ کھڑے کیا ہیں؟ چھڑالیجیے گردن۔

منشی۔ میری تو یہ سانست ہورہی ہے اور آپ کھڑے ہنس رہے ہیں۔

دیوان۔ تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ آپ تو بھی دیوئی سے زور آزمانے چلے۔ آج آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں اس سے کیوں دبتا ہوں۔

لونگی۔ جوتشی جی اپنی بدیا کا زور کیوں نہیں دکھاتے؟ کیوں رے اب تو کبھی جوتشی نہ بنے گا؟

جھنکو۔ نہیں ماتا جی! بڑا قصور ہوا۔ معاف کیجیے۔

لونگی نے دیوان صاحب کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ مجھ سے یہ چال چلی جاتی ہے۔ کیوں؟لڑکی کو راجہ سے بیاہ کرتو جاؤگے؟ لگا دو آگ گھر میں گھونٹ دو لڑکی کا گلا۔ ابھی مرجائے گی مگر جنم بھر کے دکھ سے تو چھوٹ جائے گی۔ دولت اور رُتبہ اپنی مردمی سے ملتا ہے۔ لڑکی کو بیچ کر نہیں کمایا جاتا۔ میں تمھیں اتنا خود غرض نہ سمجھتی تھی اور منشی جی تم کیوں پاپ کی گٹھڑی سر پر لادتے ہو۔ مرنے

کے دن آگئے۔ اب تو چیتو اور تم بھی سن لو جوتشی جی! اب کبھی بھول کر بھی سوانگ نہ بھرنا۔ اس طرح پیٹ پالنے سے مرجانا بہتر ہے۔

یہ کہہ کر لونگی نے دونوں آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ جھنکو تو چھوٹتے ہی بگٹٹ بھاگا۔ لیکن منشی جی وہیں سر جھکائے کھڑے رہے۔ ذرا دیر کے بعد بولے۔ دیوان صاحب! اگر آپ کی مرضی ہو تو میں جاکر راجہ صاحب سے کہہ دوں کہ دیوان صاحب کو منظور نہیں ہے۔

دیوان۔ اب بھی آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کیا ابھی کچھ اور سانست کرانا چاہتے ہیں؟

منشی۔ سانست تو میری یہ کیا کرتیں۔ میں نے عورت سمجھ کر چھوڑ دیا۔

دیوان۔ آپ آج جاکر صاف صاف کہہ دیجیے گا۔

لونگی۔ کیا صاف صاف کہہ دیجیے گا؟ کسی کو کھانے کا نیوتا دے کر اپنے دوار سے بھگا دو۔ تو اس سے لڑنے کو بھی تیار رہو۔ اب صاف کہنے کا موقع نکل گیا۔ اب جو کچھ ہوچکا۔ ہوچکا۔ رام کا نام لے کر بیاہ کرو۔

منشی جی کو اپنی خفت کا انعام مل گیا۔

(20)

ادھر تو شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ ادھر ایک دن شام کو خبر ملی کہ جیل خانہ میں ہنگامہ ہوگیا ہے اور چکردھر کے کندھے پر بہت گہرا زخم لگا ہے۔ بچنا مشکل ہے۔

منورما یوں دیکھنے میں خوش نظر آتی تھی، پر اس کا دل ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ ایک موہوم دہشت، ایک ناکام آرزو، ایک ناقابل بیان حسرت ہمیشہ اس کے دل کو متھا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد دل میں قرار دے رکھا تھا۔ اور اسی پر قناعت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی وہ زندگی تاریک، اتنی ویران معلوم ہوتی تھی کہ گھنٹوں ایک بیخودی کی حالت میں بیٹھی رہتی۔ گویا کہیں کچھ نہیں ہے اس میں صرف اکیلی وہی ہے۔

یہ وحشت ناک خبر پاتے ہی وہ گھبرائی ہوئی جاکر لونگی سے بولی۔ اماں! میں کیا کروں۔ بابو جی کو دیکھے بغیر تو اب نہیں رہاجاتا۔ کیوں اماں زخم تو اچھا ہوجائے گا نا؟

لونگی نے دردناک آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ اچھا کیوں نہ ہوگا۔ بیٹی! بھگوان چاہیں گے تو بہت جلد اچھا ہوجائے گا۔

لونگی سے منورما کا راز دل پوشیدہ نہ تھا۔ اس نے سوچا۔ اس غریب کو کتنا صدمہ ہے۔ دل میں مسوس کر رہ گئی۔ ہائے! دانے پر گرنے والی چڑیا کو موتی چگانے کی کوشش کی جاچکی ہے۔ تڑپ تڑپ کر پنجرے میں مرجانے کے سوا اور وہ کیاکرے گی۔ موتی چمکدار ہے۔ انمول ہے۔ لیکن اسے کوئی کھاتو نہیں سکتا۔

منورما نے پھر پوچھا۔ بھگوان اچھے آدمیوں کو کیوں اتنی تکلیف دیتے ہیں۔ اماں! بابو جی کا سا نیک آدمی دوسرا کون ہوگا؟ اُن سے بھگوان کیوں اس قدر ناراض ہیں۔ مجھے کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی سر بھی نہیں دُکھتا۔ مجھے کیوں کچھ نہیں ہوتا اماں!

یہ کہتے کہتے اس کے دل میں ایک بات آگئی۔ اس نے باہر آکر موٹر تیار کرایا اور راجہ صاحب سے ملنے چلی۔ راجہ صاحب اسی طرف آرہے تھے۔ بولے۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔ میں تو آہی رہا تھا۔

منورما۔ آپ کو خبر ہے۔ جیل میں فساد ہوگیا ہے اور بابو جی زخمی ہوگئے ہیں۔

راجہ۔ ہاں سنا تو ہے۔

منورما۔ یہ سن کر بھی آپ نے انھیں جیل سے باہر کسی ہسپتال میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ زخم بہت گہرا ہے۔ اگر معقول علاج نہ ہو تو ان کا بچنا مشکل ہے۔ آپ مسٹر جم کو ایک خط لکھیے کہ انھیں شہر کے ہسپتال میں رکھا جائے۔

راجہ نے تشویش کے ساتھ کہا۔ مجھے تو امید نہیں کہ صاحب مانیں۔ نہ جانے دل میں کیا سوچیں۔

منورما نے تلخی کے ساتھ کہا۔ آپ کو اگر تامل ہورہا ہو تو رہنے دیجیے میں خود صاحب سے مل لوں گی۔

راجہ صاحب خفیف ہوکر بولے۔ مجھے کوئی تامل نہیں ہے۔ ابھی جاتا ہوں۔

"لوٹئے گا کب؟"

"کہہ نہیں سکتا"۔

راجہ چلے تو منورما کی سرد مہری پر بہت آزردہ خاطر تھے طرح طرح کے شبہے دل میں پیدا ہورہے تھے۔ لیکن ان کا ازالہ بھی اپنی ہی دلیلوں سے کرتے جاتے تھے۔ اگر عیارہ ہوتی تو مجھ سے اپنے رازدل کیوں کہتی۔ مجھ پر اتنا اعتبار کیوں کرتی۔ ایسے بے لوث دل میں کدورت نہیں ہوسکتی۔

وہ جم صاحب کے بنگلے پر پہنچے تو صاحب بہادر سیر کرنے جارہے تھے۔ ان کے بنگلے میں وہ تازگی اور صفائی تھی کہ راجہ صاحب کا دل شگفتہ ہوگیا۔ ان کے یہاں درجنوں مالی تھے۔ پر باغ اتنا ہرا بھرا نہ تھا۔ یہاں کی ہوا میں مسرت بھری ہوئی تھی۔ اقبال ہاتھ باندھے کھڑا معلوم ہوتا تھا۔ نوکر چاکر کتنے سلیقہ دار تھے۔ گھوڑے کتنے ذی فہم، یہاں تک کہ کتوں کے چہرں پر بھی نور اقبال چمک رہا تھا۔

راجہ صاحب نے ہاتھ ملاکر جیل کے ہنگامہ کی کیفیت دریافت کی۔

مسٹر جم نے بیدردانہ انداز سے ہنس کر کہا۔ سب اسی چکر دھر کی شرارت تھی۔ بہت خطرناک آدمی ہے۔

راجہ۔ میں نے سنا ہے کہ اس کے کندھے پر گہرا زخم ہے اور آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسے شہر کے بڑے شفاخانہ میں رکھا جائے۔ آپ کی اتنی مہربانی سے اس غریب کی جان بچ جائے گی اور سارے ضلعے میں آپ کا نام ہوجائے گا۔

جم۔ نہیں۔ ہم اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرسکتا۔ وہ ہم سے دشمنی رکھتا ہے۔

راجہ۔ حضور! دشمن کے ساتھ رعایت کرنا اس کو سب سے بڑی سزا دینا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگا۔ اور ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام ہوجائے گا۔ میں اس کی ضمانت کرسکتا ہوں۔

جم نے ہنس کر کہا۔ آپ اس کی زبان کی ضمانت تو نہیں کرسکتے۔ ہزاروں آدمی اسے روز دیکھنے آئیں گے۔ آپ انھیں کیسے روکیں گے۔

راجہ۔ آپ یہ حکم تو دے سکتے ہیں کہ اس کے قریبی رشتہ داروں کے سوائے اور وہاں کوئی نہ جانے پائے۔

جم۔ میرے حکم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہسپتال کو جیل بنادے۔

یہ کہتے ہوئے مسٹر جم سیر کو چل دیئے۔ راجہ صاحب کو ایک لمحہ کے لیے منورما پر غصہ آگیا۔ اسی کی باعث ان کی اتنی بے عزتی ہورہی ہے ورنہ انھیں کیا غرض پڑی تھی کہ جم کی اتنی خوشامد کرتے۔ جی میں آیا۔ چل کر منورما سے کہہ دیں۔ صاحب کسی طرح نہیں مانتا۔ مگر اس کے آنسوؤں کے خوف نے انھیں دوبارہ کوشش کرنے کی تحریک کی۔

تھوڑی دیر تک تو وہ باغ میں ٹہلتے رہے۔ پھر دو گھنٹے تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ آٹھ بجے لوٹ کر آئے تو معلوم ہوا کہ ابھی تک صاحب نہیں آئے۔ پھر لوٹے۔ اسی طرح گھنٹے گھنٹے بھر کے بعد دو تین بار آئے مگر صاحب بہادر کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔

سوچنے لگے۔ اتنی رات گئے اگر ملاقات بھی ہوگئی تو بات چیت کرنے کا موقع کہاں۔ شراب کے نشے میں چور ہوگا۔ آتے ہی آتے سونے چلاجائے گا۔ مگر مجھے دیکھ کر کم سے کم اتنا تو سمجھ جائے گا کہ یہ بے چارے ابھی تک کھڑے ہیں شاید رحم آجائے۔

ایک بجے کے قریب صاحب لوٹے۔ نشے سے آنکھیں سرخ تھیں۔ راجہ کو دیکھتے ہی بولے۔ او۔ تم یہاں کیوں کھڑا ہے؟ ابی باگو۔ ابی باگو!

جم۔ او۔ ڈیم راجہ! ابھی نکل جاؤ۔ تم باگی کی سفارش کرتا ہے۔ باگی کو پناہ دیتا ہے۔ تم بھی باگی ہے۔

یہ کہتا ہوا وہ راجہ کی طرف جھپٹا۔ راجہ صاحب بہت ہی طاقتور آدمی تھے۔ لیکن نتیجہ کے خوف نے انھیں پست ہمت بنادیا۔ سوچے۔ ایک گھونسہ بھی لگایا اور کروڑوں کی جائداد ہاتھ سے نکلی ان دامنوں گھونسہ بہت مہنگا تھا۔ حالات بھی ان کے ناموافق تھے۔ اتنی رات گئے اس کے بنگلے پر آنا اس بات کا ثبوت سمجھا جائے گا کہ ان کی نیت صاف نہ تھی۔ التجا کے ساتھ بولے۔ صاحب! اتنا ظلم نہ کیجیے۔ اس کا ذرا بھی خیال نہ کیجیے گا کہ میں شام سے آپ کے دروازے پر کھڑا ہوں۔

جم۔ کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا۔ تم ابی باگ جاؤ!

راجہ۔ اتنا تو آپ کرسکتے ہیں کہ میں ان کا علاج کرنے کے لیے اپناڈاکٹر جیل بھیج دیا

کروں۔

مگر جم تو نشے میں پاگل ہو رہا تھا۔ سخت سست بکنے لگا اور ٹھوکر مارنے دوڑا۔ اب راجہ صاحب سے ضبط نہ ہوسکا۔ غصہ نے ساری تشویشوں کو، ساری کمزوریوں کو نکل لیا۔ اس کی کمر پکڑ کر اتنے زور سے پٹکا کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔ ایک ہی پٹخنی میں سارا نشہ، سارا غصہ، سارا رعب اور سارا غرور رخصت ہوگیا۔

راجہ نے گلا دباکر کہا۔ گلا گھونٹ دوں گا۔ چپراسی یا اہلکار نہیں ہوں۔ تمھاری ٹھوکریں سہہ لوں گا۔

جم صاحب اب خوشامدیں کرنے لگے۔ خدا جانتا ہے میں آپ سے دل لگی کرتا تھا۔ آپ ناراض ہوگئے۔

راجہ۔ بالکل نہیں۔ میں بھی دل لگی کر رہا ہوں۔

"آپ کسی سے یہ بات مت کہنا۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ میں کردوں گا"۔

"اگر دغا کی تو اسی طرح پھر پٹکوں گا۔ یاد رکھنا"۔

دونوں ہاتھ ملاکر رخصت ہوئے۔ سائیسوں کے سوا کسی نے بھی یہ کشتی نہ دیکھی۔ اور سائیسوں کے مداخلت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ راجہ صاحب یہاں سے چلے تو دل میں سوچتے جاتے تھے۔ دیکھیں وہ پورا کرتا ہے یا مکر جاتا ہے۔ کہیں کل کوئی شرارت نہ کرے خیر دیکھی جائے گی۔ اس وقت تو ایسی پٹخنی دی ہے کہ بچہ یاد کرتے ہوں گے۔ شرافت سے یہ لوگ قابو میں نہیں آتے۔ ان کا علاج یہی ہے۔

راجہ صاحب گھر پہنچے تو ڈیڑھ بج گئے تھے۔ پر ابھی تک سوتا نہ پڑا تھا۔ نوکر چاکر ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ راجہ صاحب موٹر سے اتر کر جوں ہی برآمدہ میں پہنچے تو دیکھا منورما کھڑی ہے تعجب سے پوچھا کیا تم ابھی گھر نہیں گئیں۔ لوگ گھبرا رہے ہوں گے۔

منورما نے کہا۔ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ وقت کا خیال ہی نہ رہا۔ گھر سے آدمی آیا تھا۔ میں نے کہلا بھیجا۔ آج مجھے آنے میں دیر ہے۔ جم سے کیا بات چیت ہوئی؟

راجہ صاحب نے ساری داستان اوّل سے آخر تک بڑے فخر کے ساتھ خوب نمک مرچ لگا کر کہہ سنائی۔ منورما ہمہ تن گوش کھڑی سن رہی تھی۔ ہر ایک جملہ اس

کے بے نیاز دل کی تالیف کررہا تھا۔ میرے لیے انھوں نے اتنی تکلیف، اتنی ذلت، اتنی جانفشانی برداشت کی۔ جب داستان ختم ہوئی۔ تو وہ فرطِ عقیدت سے بیخود ہوکر بولی۔ میں آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔

آج پہلی بار راجہ صاحب کی طرف سے منورما کے دل میں حسن ظن پیدا ہوا۔ وہ اب اس نئے دیوتا کی پوجا کرے گی۔ اس پر اچھے اچھے پھول چڑھائے گی۔ دھوپ دیپ جلائے گی۔ اس لیے کہ جسے وہ دنیا کی عزیز ترین شے سمجھتی ہے وہ ہر ایک گزند سے محفوظ رہے۔ راجہ صاحب کی تشفی اس پرستش سے ہوگی یا نہیں، کون کہہ سکتا ہے؟

(21)

مسٹر جم نے دوسرے ہی دن حکم دیا کہ چکردھر کو شہر کے بڑے ہسپتال میں رکھا جائے۔ سویرے پروانہ پہنچا۔ راجہ صاحب بھی تڑکے ہی اُٹھ کر جیل پہنچے۔ منورما وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن چکردھر نے صاف کہہ دیا میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔

داروغہ نے کہا۔ آپ کچھ سڑی تو نہیں ہوگئے ہیں؟ کتنی کوشش سے تو راجہ صاحب نے یہ حکم دلوایا اور اب آپ کہتے ہیں مجھے جانا منظور نہیں۔

چکردھر بولے۔ جب کئی آدمیوں کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب ہے تو میں کیسے چلا جاؤں۔ میرا مرنا جینا انھیں کے ساتھ ہوگا۔ اگر ان کے لیے خدا ہے تو میرے لیے بھی خدا ہے۔

باری باری سے ہر ایک نے سمجھایا۔ منورما نے تو رورو کر منتیں کیں۔ لیکن چکردھر راضی نہ ہوئے۔ دوپہر تک سرمغزن کرنے کے بعد لوگ مایوس ہوکر لوٹے۔

منشی جی نے کہا۔ دل نہیں مانتا۔ پر جی چاہتا ہے کہ لونڈے کا منہ نہ دیکھوں۔

راجہ صاحب بولے۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔ میری ساری دوڑ دھوپ خاک میں مل گئی۔

منورما کچھ نہ بولی۔ چکردھر جو کچھ کہتے یا کرتے تھے۔ اسے وہی انسب معلوم

ہوتا تھا۔ اعتقاد میں تنقید کی گنجائش نہیں۔

مسٹر جم کو یہ خبر ملی تو مزاج گرم ہوگیا۔ گویا کسی رئیس کے دیئے ہوئے پیسے کو فقیر نے زمین پر پھینک کر اپنی راہ لی ہو۔

چکردھر دو مہینے جیل کے ہسپتال میں پڑے رہے۔ معالجہ کا تو کیا اثر ہوتا ہاں غریبوں کی دعاؤں کا اثر ضرور ہوا۔ شاید منورما کا پوجا پاٹھ کا بھی کچھ اثر ہوا ہو۔ جن باتوں کو پہلے وہ ڈھکوسلہ سمجھتی تھی۔ انھیں باتوں سے اب اس کی روحانی تشفی ہوتی تھی۔ کمزوری ہی میں ہم لکڑی کا سہارا لیتے ہیں۔

چکردھر تو ہسپتال میں پڑے تھے۔ ادھر ان پر مقدمہ چلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جیوں ہی وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ استغاثہ دائر ہوگیا...... گروسیوک سنگھ کے اجلاس میں پیش ہوا۔

گروسیوک سنگھ بڑے جوشیلے آدمی تھے۔ پہلے جتنے جوش سے کسانوں کی تنظیم کرتے تھے۔ اب اتنے ہی جوش سے ملزموں کو سزائیں دیتے ہیں۔ چکردھر کی حالت دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں تھیں۔ زندگی کا منشا یہی تو نہیں ہے کہ ایک پاؤں جیل میں رہے۔ یہ تو نہ دین ہے نہ دنیا محض آگ میں کودنا ہے۔ تنظیم اور خدمت کو دور سے سلام کیا اور سرکار کے خادم بن بیٹھے۔ طرز معاشرت بھی بدل ڈالی۔ اس طبقہ میں گھل مل گئے۔ جن کی زبان پر، وضع قطع پر، رفتار وکردار پر غلامی کا چوکھا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ انھیں لوگ اب صاحب کہتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب کسی معاملے میں رُو رعایت نہ کرتے تھے۔ پر اس مقدمہ نے انھیں شش وپنج میں ڈال دیا۔ دھناسنگھ اور دوسرے ملزموں کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ پر چکردھر کو کیا کریں۔ اگر سزا دیتے ہیں تو رسوائی ہوتی ہے۔ چھوڑتے ہیں تو اپنی برادری میں بدنام ہوتے ہیں کسی نے کانوں میں یہ بات بھی ڈال دی تھی کہ اس مقدمہ میں تمھاری قسمت کا فیصلہ ہے۔

مقدمہ کو پیش ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ گروسیوک برآمدے میں بیٹھے ساون کی رم جھم برکھا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ آسمان کے بادلوں میں ہنگامہ آرائی ہورہی تھی۔ ایک دل آگے آگے تیزی سے بھاگا چلا جاتا تھا اور اس کے پیچھے فاتحوں کا کالا دل

توپیں داغتا، بھالے چمکاتا۔ متین انداز سے بڑھ رہا تھا۔ گویا بھاگنے والوں کا پیچھا کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔

اتنے میں منورما موٹر سے اتر کر ان کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

گروسیوک نے تاڑ لیا کہ منورما کا آنا علت سے خالی نہیں ہے۔ پوچھا۔ کہاں سے آرہی ہو؟

گھر ہی سے تو آرہی ہوں جیل والے مقدمے میں کیا ہورہا ہے؟

"ابھی تو گواہوں کے بیان ہورہے ہیں"۔

"بابو جی پرجُرم ثابت ہوگیا؟

گروسیوک نے افسرانہ ذمہ داری کی شان سے کہا۔ میرے لیے جرم کا ثابت ہونا یا نہ ہونا دونوں ایک برابر ہیں۔ میں چھوڑدوں۔ تو سرکار اپیل کردے گی اور میں مفت کا بدنام ہوجاؤں گا۔

منورما نے پوچھا۔ تمھارا ضمیر کیا کہتا ہے؟

گروسیوک بولے۔ میرا ضمیر خاموش ہے۔

منورما۔ میں تو نہ مانوں گی۔ آپ کا ضمیر کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہے۔ خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ بابو جی کے لیے سزا دو ایک سال بڑھ جانا کوئی بات نہیں وہ بے قصور ہیں۔ اور یہ یقین انھیں تسکین دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن تم کہیں کے نہ رہوگے۔

گروسیوک، چکردھر بالکل بے قصور تو نہیں ہیں۔ جیل کے داروغہ پر پہلے وہی دوڑے تھے۔

منورما۔ آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ گالیاں کھاکر چپ رہتے ؟

گروسیوک۔ جب انھیں معلوم تھا کہ میرے اشتعال سے بلوہ ہوجانے کا اندیشہ ہے تو میرے خیال میں انھیں خاموش رہنا چاہیے تھا۔

منورما۔ اور میں کہتی ہوں کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہی ان کا فرض تھا۔ ضمیر کا خون کرکے اگر جنت بھی ملے تو وہ حقیر ہے۔ آپ کو اپنے فیصلے میں صاف لکھنا چاہیے کہ اگر اس موقعہ پر بابوجی نے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر جیل کے

ملازموں کی جان نہ بچائی ہوتی تو نتیجہ کہیں زیادہ خطرناک ہوتا۔

گروسیوک۔ تمھاری منشا ہے کہ آگ میں کود پڑوں۔ نوکری کی مجھے پرواہ نہیں لیکن جان بوجھ کر زہر نہیں نگلا جاتا۔

منورما۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کے افسر آپ سے ناراض ہوجائیں گے تو میں آپ کو اطمینان دلاتی ہوں کہ آپ کا کسی طرح کا نقصان نہ ہونے پائے گا۔ میں آپ سے فیصلہ لکھوا کر جاؤں گی۔ لاؤں قلم دوات۔

اتنے میں دوسری موٹر آپہنچی اور راجہ صاحب اُتر پڑے۔گروسیوک نے بڑے تپاک سے ان کا مصافحہ کیا۔ راجہ صاحب نے منورما کے پاس آکر کہا۔ تم اپنا وعدہ بھول گئیں؟ چلو، نہیں شاید زور سے پانی آجائے۔

منورما۔ میں تو آج نہ جاؤں گی۔

"واہ! وہ لوگ ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے"۔

"میرا تو جانے کا جی نہیں چاہتا"۔

"مجھے کتنی شرمندگی ہوگی یہ تو سوچو"!

یہ کہہ کر راجہ صاحب نے منورما کا ہاتھ آہستہ سے پکڑلیا اور اس کو موٹر کی طرف کھینچا۔ منورا نے ایک ہی جھٹکے میں ہاتھ چھڑالیا اور چین بجبیں ہوکر بولی۔ ایک بار کہہ دیا۔ میں نہ جاؤں گی۔

"آخر کیوں"؟

"اپنی خوشی"!

گروسیوک نے رسوخ جتانے کے لیے کہا۔ یہ مجھ سے اس وقت جیل والے مقدمہ کا فیصلہ لکھانے کو بیٹھی ہوئی ہیں۔ کہتی ہیں بغیر لکھائے نہ جاؤں گی۔

منورما کا چہرہ سُرخ ہوگیا سمجھی کہ یہ مجھے راجہ صاحب کی نظروں میں گرانا چاہتے ہیں۔ تن کر بولی۔ ہاں اس لیے بیٹھی ہوں۔ تو پھر آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیئے تھی۔ اگر میں یہ سمجھتی کہ آپ انصاف سے جو بھر بھی نہ ہٹیں گے تو میرے بیٹھنے کی کیوں ضرورت ہوتی۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ اس لیے آپ کے دروازے پر دھرنا دے رہی ہوں۔ چکر دھر کی میرے دل میں جتنی عزت ہے اس کا

آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

گروسیوک کا منہ ذرا سا نکل آیا اور راجہ صاحب تو جیسے رو دیے۔ آخر چپ چاپ اپنی موٹر کی طرف چلے۔ جب موٹر پر بیٹھ گئے تو منورما بھی آہستہ سے ان کے پاس آئی اور زخم پر مرہم رکھتی ہوئی بولی۔ میں کل آپ کے ساتھ ضرور چلوں گی۔

راجہ نے سڑک کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ جیسی تمھاری خوشی۔

"اگر اس معاملے میں سچی تجویز پر لکھنے کے لیے بھائی صاحب پر افسروں کا عتاب ہو تو آپ کو ان کے لیے فکر کرنی پڑے گی۔"

"دیکھی جائے گی"۔

منورما تیز ہو کر بولی "کیا کہا؟"

"کچھ نہیں"۔

"بھائی صاحب کو ریاست میں کوئی جگہ دینی ہوگی"۔

"میں انکار کب کرتا ہوں"۔

"کل چار بجے آجایئے گا۔ مجھے آپ کے ساتھ نہ چلنے کا افسوس ہے لیکن مجبور ہوں۔ میں چلی جاؤں گی تو بھائی صاحب کچھ کا کچھ کر بیٹھیں گے۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں"؟

منورما کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ راجہ نے تشفی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ تم اس کی ذرا بھی ذکر نہ کرو۔ تمھارا اشارہ کافی ہے اور وہاں سے چلے گئے۔

(22)

حکام کے اشاروں پر ناچنے والے گروسیوک نے جب چکردھر کو بری کردیا تو حکام کے طبقے میں سنسنی سی پھیل گئی۔ گروسیوک سے ایسے فیصلے کی کسی کو امید نہ تھی۔ فیصلہ کیا تھا۔ ایک سپاسنامہ تھا۔ جس کا ایک ایک لفظ حسن اعتقاد میں ڈوبا ہوا تھا۔ شہر میں اس فیصلے کی دھوم مچ گئی۔ کتنے ہی آدمی ان کے درشنوں کو آئے چکردھر اس الزام سے بری ہی نہ ہوئے۔ ان کی پہلی سزا میں بھی ایک سال کی

تخفیف ہوگئی۔ مسٹر جم تو ایسا جامے سے باہر ہوئے کہ بس چلتا تو گروسیوک کو گولی مار دیتے اور تو کچھ نہ کرسکے۔ تیسرے ہی دن چکردھر کو آگرے بھیج دیا۔

چکردھر کی میعاد تو گھٹا دی گئی۔ لیکن جیل کے ملازموں سے سخت تاکید کردی گئی کہ کوئی قیدی ان سے بولنے نہ پائے۔ یہاں تک کہ کوئی ملازم بھی ان سے نہ بولے۔ وہ آٹھوں پہر اسی چار ہاتھ لمبی تین ہاتھ چوڑی کال کوٹھری میں پڑے رہتے۔ جیل کے کارکنوں میں اور چاہے جتنے ہی عیب ہوں پر انسانی جذبات کے وہ ماہر ہوتے ہیں۔ کس طرز عمل سے زیادہ سے زیادہ روحانی تکلیف ہوگئی ہے۔ اسے وہ خوب جانتے ہیں۔ چکردھر کے کمرے کا دروازہ دن میں صرف دو بار کھلتا تھا۔ آہ کال کوٹھڑی تو انسانی بہیمیت کی برہنہ تصویر اور زندہ معجزہ ہے۔ تو وہ جادو ہے۔ جو انسان کو آنکھیں رہتے اندھا، کان رہتے بہرہ۔ زبان رہتے گونگا بنادیتی ہے۔ کہاں ہیں سورج کی کرنیں جنھیں دیکھ کر آنکھوں کو اپنے وجود کا یقین ہو۔ کہاں ہے وہ آواز جو کانوں کو جگائے۔ بو ہے لیکن جہاں بو کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہاں بو کا حس کیسے ہو۔ وہاں عناصر خمسہ کا وجود ہی نہیں۔ انسان کی قوت ایجاد کتنی حیرت انگیز ہے۔

چکردھر کی کیفیات قلب اتنی جلد جلد تبدیل ہوتی رہتی تھیں کہ کبھی کبھی انھیں اپنے حواس کے صحیح ہونے پر شبہ ہونے لگتا تھا۔ کبھی سوچتے خدا نے ایسی دنیا بنائی ہی کیوں۔ کیا ایسی دنیا نہ بن سکتی تھی۔ جہاں سبھی انسان سبھی قومیں خلوص اور ارتباط کے ساتھ دنیا میں رہتیں۔ نہیں۔ انصاف کے خون سے بھری ہوئی دنیا یہ خدا کی ایجاد نہیں ہوسکتی۔ دوچار دن یہی شکوک پیدا ہوتے رہتے۔ پھر یکایک تاریکی میں نورانی شعاعیں پھیل جاتیں۔ یہ بے دست وپائی ایک فطری نظام کی صورت اختیار کرلیتی۔ جس میں حیات اور بیداری روپوش ہے۔ وہ تعلیم گاہ ہے جہاں ہماری مندی ہوئی آنکھیں کھلتی ہیں۔

چکردھر کے پاس کبھی کبھی ایک بوڑھا وارڈ کھانا لایا کرتا تھا۔ بہت ہی زندہ دل آدمی تھا۔ اس سے باتیں کرنے کے لیے چکردھر کتنے مشتاق رہتے تھے۔ اس سے انھیں برادرانہ خلوص ہوگیا تھا۔ وہ کئی بار پوچھ چکا تھا کہ بابو جی! چرس تمباکو کی خواہش ہو تو ہم سے کہنا۔ چکردھر کو خیال آیا کہ اس سے ایک پنسل اور تھوڑا سا کاغذ

مانگوں اپنے جذبات کو قلمبند کرنے کے لیے ان کا دل بیتاب رہتا تھا۔ وہ کئی دن اس پس وپیش میں رہے۔ اس سے کہوں یا نہ کہوں۔ آخر ایک دن ان سے نہ رہا گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے۔

بوڑھا وارڈ اُن کے حالات سن چکا تھا۔ کچھ لحاظ نہ کرتا تھا۔ معلوم نہیں کس دیوتا کی ربط سے اس میں اتنی انسانیت باقی رہ گئی تھی۔

بولا۔ ملنے کو تو مل جائے گا پر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

اس جواب نے چکردھر کو سنبھال لیا۔ ان کا نفس نیک جو ذرا دیر کے لیے ذرا ترغیب میں پڑ گیا تھا۔ بیدار ہوگیا۔ بولے نہیں میں یوں ہی کہتا تھا ایسی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اس وارڈ نے پھر کئی بار پوچھا۔ کہو۔ تو کاغذ پنسل لادوں۔ لیکن چکردھر نے ہر بار یہی کہا۔ کوئی ضرورت نہیں۔

جشوواندن کو جوں ہی معلوم ہوا تھا کہ چکردھر آگئے ہیں۔ وہ ان سے ملنے کی کئی بار کوشش کر چکے تھے۔ پر اجازت نہ ملتی تھی۔ انھیں خود ملنے کی تو زیادہ خواہش نہ تھی۔ ہاں۔ اہلیا کا ملنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ جس دن سے چکردھر نے جیل میں قدم رکھا۔ اسی دن سے وہ وفا کی دیوی قیدیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگی۔ چکردھر جیل میں آزاد تھے۔ وہ حالات کو اپنے موافق بناسکتے تھے۔ اہلیا گھر میں بھی قید تھی۔ وہ حالات پر فتح نہ پاسکتی تھی۔ جن چیزوں پر جان دیتی تھی۔ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ سارا گھر سمجھاتا۔ کیوں اس طرح جان دیتی ہو۔ وہ جواب دیتی۔ مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں۔

جس دن اہلیا کو معلوم ہوا کہ چکردھر سے ملنے کی اجازت مل گئی اسے مسرت کی جگہ ایک عجیب بے چینی ہوئی۔ وہ نہ جانے کتنے دُبلے ہوگئے ہوں گے۔ کون جانے طبیعت بھی بدل گئی ہو۔ یہ خوف بھی تھا۔ کہیں مجھے ان کے سامنے جاتے ہی غش نہ آجائے۔ کہیں میں چلاچلا کر رونے نہ لگوں۔ بار بار دل کو مضبوط کررہی تھی۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اِتنا گھنا کُہرا پڑ رہا تھا کہ سامنے کی چیز نہ سوجھتی تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھایاہوا تھا۔ جسے دیکھئے سردی سے

سکڑا ہوا جیب میں ہاتھ ڈالے، کمر خم کیے لپکا جارہا تھا۔ اسی وقت اہلیا جسووانندن کے ساتھ جیل چلی۔ خوف سے دل کانپ رہا تھا۔ جیسے کئی آدمی اپنے جاں بلب دوست سے ملنے جارہا ہو۔

جیل میں پہنچتے ہی ایک عورت نے اس کی تلاشی لی اور اُسے قریب کے ایک کمرے میں لے گئی۔ جہاں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اہلیا کو اس پر بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔ اور خود ایک کرسی پر بیٹھ کر چکردھر کو لائے جانے کا حکم دیا۔

اہلیا کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ اس عورت کو اپنے سامنے دیکھ کر اُسے کچھ ڈھارس ہورہا تھا۔ نہیں تو شاید وہ چکردھر کو دیکھتے ہی ان کے پیروں سے لپٹ جاتی۔ سرجھکائے بیٹھی تھی کہ چکردھر نے کمرے میں قدم رکھا۔ اہلیا انھیں دیکھ کر چونک پڑی۔ شاید کہیں اور دیکھتی تو انھیں پہچان نہ سکتی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ ایک عالم اضطراب میں اٹھ کھڑی ہوگئی۔

چکردھر نے پوچھا۔ اہلیا تم اتنی دُبلی کیوں ہو۔ کیا بیمار ہو؟۔

اہلیا نے سسکیوں کو دباکر کہا۔ نہیں میں تو بالکل اچھی ہوں۔ آپ البتہ اتنے دُبلے ہوگئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔

چکردھر۔ خیر میرے دُبلے ہونے کا تو خاص سبب ہے۔ لیکن تم کیوں ایسی گھلی جارہی ہو کم سے کم اتنا تو بنائے رکھو کہ جب میں چھوٹ کر آؤں تو میری کچھ مدد کرسکو۔ وعدہ کرو کہ آج سے تم اپنی صحت کا خیال رکھوگی۔

اہلیا۔ آپ کی یہ حالت کیسی ہوگئی؟

چکردھر۔ میری طرف سے تم بالکل بے فکر رہو۔

اہلیا۔ آپ کا دل یہاں گھبراتا ہوگا۔

چکردھر۔ بالکل نہیں۔ بڑے اطمینان سے دن کٹ رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہورہا ہے کہ میرے تہذیب نفس کے لیے اس تپسیا کی ضرورت تھی۔ بابو جی وغیرہ گھر میں تو سب لوگ خیریت سے ہیں؟

اہلیا۔ اماں آپ کو برابر یاد کرتی ہیں اور بابو جی تو میرے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ کئی مہینوں سے دونوں آدمیوں میں کچھ کھٹ پٹ ہے۔ وہ کہتی ہیں بہت دن تو

لوگوں کی خدمت کی اب آرام سے گھر بیٹھو۔ بابو جی کہتے ہیں۔ یہ کام تو اسی دن چھوڑوں گا۔ جس دن روح تن کو چھوڑ دے گی۔ آج کل طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی۔ پر آرام کرنے کی تو انھوں نے قسم کھالی ہے۔ خواجہ محمود سے نہ جانے کس بات پر پھر اَن بن ہوگئی ہے۔

اہلیا نے یہ ذکر محض اس لیے کیا تھا کہ چکردھر کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ جائے۔ اور اس میں اسے کامیابی ہوئی۔

چکردھر رنجیدہ ہوکر بولے۔ پھر وہی مذہبی جنون سر پر سوار ہوگیا ہوگا مذہب کا صحیح مطلب جب تک لوگ نہ سمجھیں گے برابر یہی حالت رہے گی۔ مشکل یہ ہے کہ جن بزرگوں سے سچی مذہب پروری کی امید کی جاتی ہے وہ عوام سے بھی زیادہ تنگ خیال ہوجاتے ہیں۔ میرے گھر کی تو کوئی خبر نہ ملی ہوگی؟

اہلیا۔ ہاں ملی ہے۔ بابوجی حال ہی میں کاشی گئے تھے۔ سنا ہے چھوٹی رانی صاحب آپ کے گھر پر اکثر آیا کرتی ہیں۔

چکردھر نے تعجب سے پوچھا۔ چھوٹی رانی صاحبہ کون؟

اہلیا۔رانی منورما۔

چکردھر۔ تو منورما کی شادی راجہ صاحب سے ہوگئی؟

اہلیا۔ بابوجی تو کہتے تھے۔

چکردھر۔ یہ تو عجیب مذاق ہے۔ منورما کی شادی بشال سنگھ کے ساتھ؟ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔

اہلیا۔ بابوجی کو خود تعجب ہورہا تھا۔ کہتے تھے۔ منورما نے اپنی خوشی سے شادی کی ہے سارا اختیار چھوٹی رانی ہی کے ہاتھ میں ہے۔ بابوجی کو پانچ ہزار روپے چندے میں دیے۔

دفعتاً لیڈی نے کہا۔ وقت پورا ہوگیا۔ وارڈر! قیدی کو اندر لے جاؤ!

چکردھر جیل کے اندر چلے۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہے۔

پھاگن کا مہینہ آیا۔ ڈھول منجیرے کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ درختوں پر کوئل کوکی۔ گھروں میں مستورات کو کنے لگیں۔ منشی بجردھر کی مجلس بھی آراستہ ہوئی۔ یوں تو کبھی کبھی احباب جمع ہوجایا کرتے تھے۔ پر پھاگن آتے ہی بلاناغہ مردنگ پر تھاپ پڑنے لگی۔ ذی حوصلہ آدمی تھے۔ فکر کو بھی پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ اس معاملے میں وہ بڑے بڑے فلاسفروں سے بھی دو قدم آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اپنے جسم کو تکلیفوں سے بچاتے رہتے تھے۔ "گذشتہ را صلواۃ" کے قائل تھے۔ مگر "آیندہ را احتیاط" کے قائل نہ تھے۔ لڑکا جیل میں ہے بیوی رورو کر اندھی ہوئی جاتی ہے۔ سیانی لڑکی گھر میں بیٹھی ہے لیکن منشی جی کو کوئی غم نہیں۔ پہلے پچیس روپیہ میں گذر کرتے تھے۔ اب پچھتر بھی پورے نہیں پڑتے جس سے ملتے ہنس کر ہر ایک کی مدد کرنے کو تیار۔ وعدہ سب سے کرتے ہیں۔ ایفا کی فکر نہیں۔ کسی نے جھک کر سلام کیااور خوش ہوگئے۔ دونوں ہاتھوں سے برکتیں بانٹتے پھرتے ہیں۔ اپنے محلے کے کئی بے فکروں کو جنھیں کوئی ٹکے کو نہ پوچھتا تھا۔ ریاست میں نوکر رکھا دیا۔ مگر نیکی کرکے دریا میں ڈالنے کی انھیں عادت نہ تھی۔ جس سے ملتے ہیں اپنا ہی قصیدہ پڑھتے ہیں۔ اور خوب مبالغہ کے ساتھ مشہور ہوگیا کہ راجہ اور رانی دونوں ان کی مٹھی میں ہیں۔ ان کے دروازوں پر سائلوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ منشی جی کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ اور نہ کچھ کرسکے تو باتوں ہی سے پیٹ بھر دیتے ہیں۔ اپنی دھاک جمانا خوب جانتے ہیں۔ جو کام منصب سے باہر ہو۔ اس کے لیے بھی ہاں ہاں کردینا۔ آنکھیں مارنا۔ اوڑن گھائیاں بتانا ان سبھی علوم میں برق ہیں۔ مطلب کی دنیا ہے وکیل، مختار، بنئے، مہاجن، غرض ہر طرح کے لوگ ان سے کوئی نہ کوئی امید رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی حیلے سے کچھ نہ کچھ دے ہی مرتے ہیں۔

رات کے نو بجے تھے۔ منشی جی مسند پر بیٹھے پیچوان پی رہے تھے کہ جھنکو اپنے سازندوں کے ساتھ آپہنچا۔ گانا شروع ہوگیا۔

منشی۔ واہ جھنکو واہ! کیا کہنا ہے۔ اب میں تمھیں ایک دن دربار میں لے چلوں گا۔

جھنکو۔ لے جایئے گا۔ جب میں مرجاؤں گا۔ اپنی تقدیر ہی کھوٹی ہے آپ کیا کریں گے
نہیں تو کیا آپ کی دولت غیر مونچھوں پر تاؤ دیتے اور میں کورا ہی رہ جاتا۔
منشی۔ کیا بتاؤں جی بار بارارادہ کرتا ہوں۔ لیکن موقع ہی نہیں ملتا۔
جھنکو۔ کہیے چاہے نہ کہیے۔ میں آپ کے دروازے سے ٹلنے کا نہیں۔
منشی۔ کہوں گا اور بدکر۔ بس سمجھ لوکہ تم وہاں ہوگئے۔ موقعہ ملنے کی دیر ہے۔ رانی صاحب کی اتنی نگاہ ہے کہ سبھی سلاماں کرتے ہیں۔ دیوان صاحب باپ ہیں تو کیا بلااطلاع کرائے اندر نہیں جاسکتے۔ مگر میرے لیے کوئی روک ٹوک نہیں!
جھنکو۔ رانی صاحب کا کیا پوچھنا۔ آج سارے شہر میں واہ واہ ہورہی ہے۔
منشی۔ پہنچا نہیں کہ سب کام چھوڑ کر دوڑی ہوئی آکر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ کیا ہے لالہ جی! جب تک رہتا ہوں دماغ چاٹ جاتی ہیں۔ دوسروں سے بات تک نہیں کرتی۔ مگر بھئی اتنا یاد رکھو کہ وہاں پکا گانا گایا اور نکالے گئے۔ توم تانانا کا تار مت باندھنا۔
مہاویر نام کے ایک بزاز نے آکر سلام کیا اور بولا۔ حضور کے مجاز اچھے ہیں۔
منشی جی نے تیوریاں بدل کر کہا۔ حضور کے مزاج کی فکر نہ کرو۔ اپنا مطلب کہو۔
مہادیو۔ حضور کو سلام کرنے آیا تھا۔
منشی۔ اچھا سلام!
مہادیو۔ آپ ہم سے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ ہم سے تو کوئی ایسی خطا......
منشی۔ بڑے آدمیوں سے ملنے جایا کرو۔ تو تمیز سے باتیں کرو۔
مہادیو۔ ہاں حضور! اتنی تو خطا ہوگئی۔ اب معافی دی جائے۔ نیا مال آیا ہے۔ حکم ہو تو کچھ کپڑے بھیجوں!
منشی۔ پھر وہی بنئے پن کی باتیں۔ کبھی اور بھی آج تک آئے تھے پوچھنے۔ میں وہی ہوں یا کوئی اور۔ اپنا مطلب صاف صاف کہو۔
مہادیو۔ حضور تو سمجھتے ہی ہیں۔ میں کیا کہوں۔
منشی۔ اچھا تو سنو لالہ جی۔ ظلم نہیں کرتا۔ رشوت نہیں لیتا۔ جب تحصیلداری کے

زمانہ میں نہ لیا تو اب کیا لوں گا۔ لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ جتنا کپڑا لگے گا تمھارے سر۔ بولو۔ منظور ہو تو آج ہی نظر دلوادوں۔ سال بھر میں ایک لاکھ کا مال بیچوگے۔ جو بیچنے کا شعور ہوگا۔ ہاں بڑھیا رانی کا زمانہ نہیں ہے کہ ایک کے چار ہوں۔ بس روپے میں ایک آنہ بہت ہے۔ اس سے زیادہ لیا اور گردن ناپی گئی۔

مہادیو۔ حضور! خرچ نکال کردو پیسے روپیہ ہی دلوادیں۔ آپ کے وسیلے سے جاکر بھلا ایسا دغا کروں گا۔

منشی۔ اچھا تو کل آنا اور دو چار تھان اونچے داموں کے لیتے آنا۔ یاد رکھنا بدیشی چیز نہ ہو۔ نہیں تو پھٹکار پڑے گی۔ سچا سوریشی مال ہو۔ بدیشی چیزوں کے نام سے چڑھتی ہیں۔

بزاز چلا گیا تو منشی جی جھنکو سے بولے۔ دیکھا۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ چلے ہیں سودا بیچنے!

جھنکو۔ بھیا ٹھرا دینا بچارے کو۔ جو اس کی تقدیر میں ہوگا وہ مل ہی جائے گا۔ مفت میں جس ملے تو لینے میں کیا ہرج ہے۔؟

منشی۔ اچھا ذرا ٹھیکا سنبھالو۔ یہ بنیا نہ جانے کہاں سے کود پڑا۔

یہ کہہ کر منشی جی نے میرا کا پد گانا شروع کیا۔

رام کی دیوانی میرا درد نہ جانے کوئی

گھائل کی گت گھائل جانے جو گھائل ہوئی

شیش ناگ پے سیج پیا کی کیہی بدھ ملنا ہوئی۔ رام کی دیوانی......

درد کی ماری بن بن ڈولوں بید ملا نہیں کوئی

میرا کی پیر پر بھو کیسے مٹے گی بید سنولیا ہوئی۔ رام کی دیوانی......

جھنکو۔ واہ بھیا واہ! تمھارا گلا تو دن بدن نکھرتا جاتا ہے۔

منشی۔ گانا ایسا ہونا چاہیے کہ دل پر اثر پڑے۔ یہ نہیں کہ تم توتوم تنانا کی تار باندھ دو اور سننے والے تمھارا راستہ تکتے رہیں۔ جس گانے سے حال نہ آجائے وہ گانا نہیں!

اتنے میں ایک نوجوان کوٹ پتلون پہنے، عینک لگائے ، مونچھیں مڑائے، بال سنوارے آکر بیٹھ گیا منشی جی نے پوچھا۔ تم کون ہو بھائی۔ مجھ سے کچھ کام ہے؟

نوجوان۔ میں نے سنا ہے کہ جگدیش پور میں ایک اکونٹنٹ کی جگہ خالی ہے میں بھی کائستھ ہوں اور برادری کے رشتہ سے آپ کے اوپر میرا بہت بڑا حق ہے۔ میرے والد صاحب کچھ دنوں آپ کی ماتحتی میں کام کرچکے ہیں۔ آپ کو منشی سکھ باسی لال کانام تو یاد ہوگا۔

منشی۔ تو آپ برادری یا دوستی کے ناطے نوکری چاہتے ہیں۔ اپنی لیاقت کے دعوے پر نہیں۔ یہ میرے اختیار کے باہر ہے۔ میں دیوان ہوں نہ محافظ نہ منصرم۔ ان لوگوں کے پاس جائیے۔

نوجوان۔ آپ سب کچھ ہیں۔ میں تو آپ کو اپنا مربّی سمجھتا ہوں۔

"کہاں تک پڑھا ہے آپ نے"؟

"پڑھا تو بی۔ اے تک ہے پر پاس نہ کرسکا"۔

"کوئی ہرج نہیں۔ آپ کو بازار کے سودے پٹانے کا کچھ تجربہ ہے؟ اگر آپ سے کہیں کہ جاکر دس ہزار کی عمارتی لکڑی لایئے تو آپ کفایت سے لائیں گے"؟

"جی میں نے تو کبھی لکڑی خریدی ہی نہیں"۔

"نہ سہی۔ آپ کشتی لڑنا جانتے ہیں۔ کچھ بنوٹ پٹے کے ہاتھ سیکھے ہیں۔ کون جانے کبھی آپ کو راجہ صاحب کے ساتھ سفر کرنا پڑے اور کوئی ایسا موقعہ آجائے تو آپ کو ان کی حفاظت کرنی پڑے۔

"کشتی لڑنا تو نہیں جانتا۔ ہاں فٹ بال۔ ہاکی وغیرہ خوب کھیل سکتا ہوں"۔

"کچھ گانا بجانا جانتے ہو؟ مصاحب میں اس کا علم ہونا لازمی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حساب کتاب کے سوا آپ اور کیا کرسکتے ہیں۔ آپ تیرنا جانتے ہیں"؟

"تیر سکتا ہوں مگر بہت کم"۔

"آپ رئیسوں کی تفریح کے لیے قصے کہانیاں، لطیفے چٹکلے کہہ سکتے ہیں"؟

"آپ تو مذاق کررہے ہیں"۔

"جی نہیں مذاق نہیں کررہا ہوں۔ آپ کی لیاقت کا امتحان لے رہا ہوں۔ تو

آپ صرف حساب کرنا جانتے ہیں۔ میں ایسے آدمی کی سفارش نہیں کرسکتا۔ آپ کی عمر چوبیس سال کی ہوگی۔ اتنے دنوں میں آپ نے صرف حساب لگانا سیکھا۔ ہمارے یہاں ذرا ذرا سے لونڈے چھ مہینے میں منیم بن جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی دکانیں سنبھالتے ہیں۔ آپ کے لیے یہاں جگہ نہیں ہے۔

نوجوان چلاگیا۔ تو جھنکو نے کہا۔ بھیا! تم نے بے چارے کو بہت بنایا۔ کچھ اس کے ٹھاٹھ کی بھی قدر نہ کی۔

منشی۔ اس کا صاحبی ٹھاٹھ دیکھ کر ہی تو میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ آتا تو آپ کو خاک نہیں پر ٹھاٹھ ایسا بنایا ہے۔ گویا خاص ولایت سے چلے آرہے ہیں۔ چار حرف انگریزی پڑھ لی تو سمجھ لیا فاضل ہوگئے۔ پوچھو جب آپ بازار سے دھیلے کا سودا نہیں لاسکتے تو آپ حساب کتاب کیا کریں گے؟

یہی باتیں ہورہی تھیں کہ منورما کی موٹر آکر دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ منشی جی ننگے سر ننگے پاؤں دوڑے۔ ذرا بھی ٹھوکر کھا جاتے تو پھر اُٹھنے کا نام نہ لیتے۔ منورما نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ دوڑیے نہیں۔ آپ ہی کے پاس آئی ہوں۔ کہیں بھاگی نہیں جارہی ہوں۔ اس وقت کیا ہورہا ہے۔؟

منشی۔ کچھ نہیں حضور! ایشور کا بھجن کررہاہوں۔

منورما۔ بہت اچھی بات ہے۔ ایشور کو ضرور ملائے رکھئے۔ وقت پر بہت کام آتے ہیں۔ میں آپ کو ایک بڑی خوشخبری دینے آئی ہوں۔ بابو جی کل یہاں آجائیں گے۔ سرکار نے ان کی میعاد گھٹا دی ہے۔

یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

نرملا بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ رسوئی میں صرف ایک کپی جل رہی تھی۔ باقی سارا گھر اندھیرا پڑا ہوا تھا۔ منشی جی یار باش آدمی تھے۔ جو کچھ پاتے تھے باہر ہی باہر اُڑا دیتے تھے۔ گھر کی حالت جیوں کی تیوں تھی۔ منشی جی بڑے شش و پنج میں پڑے اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ رانی صاحب تشریف لارہی ہیں۔ تو کچھ تیاری کررکھتے۔ بدحواس اندر آگئے اور نرملا سے بولے۔ جلدی باہر نکل جاؤ اور ہاتھ دھوڈالو۔ رانی منورما آرہی ہیں۔ تب تک آٹا لے کر کیا بیٹھ گئیں۔

نرملا چٹ پٹ باہر نکلی۔ منگلا چار پائی بچھانے لگی۔ منورما دہلیز میں آکر رُک گئی۔ اتنا اندھیرا تھا کہ وہ آگے قدم نہ رکھ سکی۔ باہر کمرے میں ایک دیوار گیر جل رہی تھی۔ جھنکو عجلت میں اُسے اُٹھانے لگا تو وہ زمین پر گر پڑی۔ وہاں بھی اندھیرا ہوگیا۔ منشی جی ہاتھ میں کپی لے کر دہلیز کی طرف چلے تو چار پائی کی ٹھوکر لگی۔ کپی بھی ٹوٹ گئی۔ کھڑے کھڑے تقدیر کو کوسنے لگے۔ روز لالٹینیں آتی ہیں روز توڑ کر پھینک دی جاتی ہیں۔ کچھ نہیں تو دس لالٹینیں لاچکا ہوں گا۔ پر ایک کا بھی پتہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قلی کا گھر ہے۔ کسی چیز کی حفاظت کرنی تو آتی ہی نہیں۔

بارے جھنکو دوڑ کر اپنے گھر سے ایک لالٹین لایا اور منورما گھر میں داخل ہوگئی۔ نرملا آنکھوں میں پریم کی ندی بھر سر جھکائے کھڑی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے آنکھیں بچھادے۔

دفعتاً منورما نے جھک کر نرملا کے پیروں پر سر جھکادیا۔ نرملا ساری مدارات ایک دم بھول گئی۔ منورما کے اخلاق اور انکسار نے اُسے مسخر کرلیا۔

اتنے میں منگلا آکر کھڑی ہوگئی۔ منورما نے اُسے گلے سے لگالیا۔ اور خلوص میں ڈوبے ہوئے انداز سے بولی۔ آج تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں گی بی بی۔ دوچار دن تمھیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ گائیں گی۔ ساتھ ساتھ کھیلیں گی۔ اکیلے پڑے پڑے میرا جی گھبراتا ہے۔ تم سے ملنے کو دل بیتاب تھا۔

نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ زمین سے کئی گز اونچی اٹھ گئی ہے۔ بولی۔ منورما تم نے ہمیں زمین سے اٹھاکر آسمان پر پہنچادیا۔ بہت دنوں سے تمھاری تعریف سنتی تھی۔ آج تمھیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔

منورما بولی۔ آپ کو تو میں ہمیشہ اپنی ماں سمجھتی ہوں۔ ماں کے پیار سے تو میں بچپن ہی سے محروم ہوگئی۔ پر آج معلوم ہورہا ہے کہ ماتا ہی کے قدموں پر پڑی ہوں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ جب کبھی جی گھبرائے تو آکر آپ کی گود میں بیٹھ جایا کروں۔ کل بابو جی آئیں گے۔ موقع ملا تو میں بھی آؤں گی۔ پر میں کسی سبب سے نہ آسکوں تو آپ ان سے کہہ دیجیے گا کہ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ میرے دل میں اُن کی وہی عزت اور محبت ہے۔ ان کی رہائی کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ کئی دن ہوئے لکھنؤ

کے ایک تعلقہ دار نے گورنر کی دعوت کی تھی۔ میں بھی راجہ صاحب کے ساتھ دعوت میں شریک ہوئی تھی، لوگ طرح طرح کے کھیل کھیل رہے تھے۔ گورنر نے مجھے شطرنج کھیلنے کی دعوت دی مجھے شطرنج کھیلنا تو آتا نہیں پر ان کے اصرار سے بیٹھ گئی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے انھیں تابڑ توڑ دو ماتیں دیں۔ تب آپ جھلا کر بولے۔ اب کچھ بازی لگا کر کھیلیں گے کیا بدتی ہو۔ میں نے کہا۔ اس کا فیصلہ بازی کے ختم ہونے کے بعد ہوگا۔ اب کی وہ خوب سنبھل کر کھیلے اور میرے کئی مہرے پیٹ لیے۔ لیکن عین وقت پر مجھے ایک ایسی چال سوجھ گئی کہ ہاتھ سے جاتی ہوئی بازی لوٹ پڑی۔ صاحب کے سارے مہرے دھرے ہی رہ گئے اور مات ہوگئی میں نے ہنس کر کہا۔ بازی میری ہوئی۔ اب میں جو کچھ مانگوں وہ آپ کو دینا پڑے گا جب وہ قول ہار گئے تو میں نے کہا آپ میرے ماسٹر صاحب کو بے قصور جیل میں ڈالے ہوئے ہیں انھیں چھوڑ دیجیے۔

یہ سن کر سبھی سناٹے میں آگئے۔ مگر قول ہار چکے تھے مجبور ہوکر انھیں وعدہ کرنا پڑا۔ مجھے کل معلوم ہوا کہ رہائی کا حکم ہوگیا ہے اور بابو جی کل کسی وقت یہاں آجائیں گے۔

نرملا کانپتے ہوئے گلے سے بولی۔ تم نے مجھ پر بڑا رحم کیا۔ نہیں تو میں روتے روتے مرجاتی۔ منورما۔ رونے کی کیا بات تھی۔ ماں کو چاہیے کہ اپنے لڑکے کو دلیر اور مضبوط بنائے۔ ایک تو یہاں لوگ یوں ہی بزدل ہوتے ہیں۔ اس پر گھر والوں کی محبت ان کی رہی سہی محبت بھی توڑ دیتی ہے۔ (منگلا سے) تو کیوں بہن میرے یہاں چلتی ہو؟ مگر نہیں کل تو بابو جی آئیں گے میں کسی دوسرے دن تمھارے لیے سواری بھیجوں گی۔

نرملا۔ جب آپ کا جی چاہے بلا لیجیے گا۔

منورما۔ تم کیوں نہیں بولتی ہو بی بی؟ سمجھتی ہوگی کہ یہ رانی ہیں۔ بڑی عقلمند اور لائق ہوں گی پہلے رانی دیوپریا کو دیکھ کر میں بھی یہی سوچا کرتی تھی پر اب معلوم ہوا کہ ثروت سے نہ عقل بڑھتی ہے نہ لیاقت۔ رانی اور باندی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

یہ کہہ کر اس نے منگلا کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پُرخلوص بے تکلفی سے بولی۔ دیکھ لینا۔ ہم تم کیسے مزے سے گاتی بجاتی ہیں۔ بولو۔ آؤ گی نا؟

منگلا نے ماں کی طرف دیکھا اور اشارہ پاکر بولی۔ جب آپ کی مجھ پر اتنی نوازش ہے تو کیوں نہ آؤں گی۔

منورما۔ عنایت اور نوازش کی باتیں کرنے کے لیے تو میں نہیں بلارہی ہوں۔ ایسی باتوں سے بیزار ہوگئی ہوں۔ سہیلیوں کی طرح گانے بجانے ہنسنے بولنے کو بلاتی ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر منگلا کے گلے میں ڈال دیا اور مسکراکر بولی۔ دیکھو اماں جی! یہ ہار اسے اچھا لگ رہا ہے نا؟

منشی جی بولے۔ لے منگلا تو نے تو پہلے ہی ملاقات میں موتیوں کا ہار مار لیا۔ ہم لوگ منہ ہی تاکتے رہ گئے۔

منورما۔ ماں باپ لڑکیوں کو کچھ دیتے ہیں۔ مجھے تو آپ سے کچھ-ملنا چاہیے۔ منگلا تو میری چھوٹی بہن ہے۔ جی چاہتا ہے اسی وقت لیتی چلوں۔ اس کی صورت بابوجی سے بالکل ملتی ہے ان کے کپڑے پہنادیے جائیں تو پہچاننا مشکل ہوجائے۔ چلو منگلا کل ہم دونوں آجائیں گی

نرملا۔ کل ہی لیتی جایئے گا۔

مگر منورما کب سنتی تھی۔ منگلا کاہاتھ پکڑے ہوئے دروازے کی طرف چلی۔ منگلا ہچک رہی تھی۔ کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔

جب موٹر چلی گئی تو نرملا نے کہا۔ دنیا میں ایسی دیویاں بھی ہوتی ہیں۔

منشی۔ للو سے اتنی محبت کرتی ہے کہ وہ چاہتا تو اس سے شادی کرلیتا۔ دھرم ہی کھوتا تھا تو کچھ لے کر کھوتا۔ نہیں کہاں جاکر گرا۔ اس لڑکی پر جس کے ماں باپ کا بھی پتہ نہیں۔

نرملا۔ واہ! واہ! کیا لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔ ایسی بہو گھر میں آجائے لالہ تو ایک دن بھی نہ چلے۔ پھول سونگھنے کی چیر ہے کھانے کی چیز نہیں۔ غریبوں کا نباہ غریبوں میں ہی ہوتا ہے۔

منشی۔ محبت کی دولت کو بھوکھ نہیں ہوتی۔

نرملا۔ نہ بھی جلاؤ۔ بے بات کی بات کرتے ہو۔ تمھارے للو ایسے ہی تو بڑے خوبصورت ہیں۔ سر میں ایک بال نہ رہتا۔ ایسی عورتوں کو خوش رکھنے کے لیے دولت چاہیے۔

دس بج رہے تھے منشی جی کھانا کھانے بیٹھے۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ للو کو ریاست میں کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ پھر پانچوں گھی میں ہیں۔ مارے خوشی کے کھایا بھی نہ گیا۔ جلد سے دوچار لقمے کھاکر بھاگے اور اپنے ہم جلیسوں سے اپنی خوش نصیبی کی داستان سنانے لگے۔ لیکن نرملا غمگین تھی۔ منورما سے اُسے نہ جانے کیوں ایک طرح کی دہشت سی ہورہی تھی۔

(24)

صبح کا وقت تھا۔ پھاگن کی صبح زرّیں شعاعوں میں نہارہی تھی۔ باغ میں تو شگفتہ پھول شاعروں کے سنہرے ہار پہنے مسکرارہے تھے۔ بورسے مہکتے ہوئے آم کے درختوں پر کوئل اپنے میٹھے نغمے الاپ رہی تھی اور منورما آئینہ کے سامنے کھڑی گیسوئے مشکیں سنوار رہی تھی۔ آج بہت دنوں کے بعد اس نے اپنے جگمگاتے ہوئے مرصع زیورات نکالے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد اپنے باغ حسن کو آراستہ کیا ہے۔ آج اس کے جسم کا ایک ایک عضو فرطِ مسرت سے کھلاہوا ہے۔

یوں آراستہ ہوکر منورما نے بغل والے کمرے کا پردہ ہٹایا اور دبے پاؤں اندر گئی۔ منگلا ابھی تک پلنگ پر پڑی میٹھی نیند کا مزہ لے رہی تھی۔ اس کے گیسوئے دراز تکیے پر پڑے تھے۔ دونوں سہیلیاں آدھی رات تک باتیں کرتی رہی تھیں۔ جب منگلا کی آنکھیں نیند سے گراں بار ہوگئیں تو منورما اسے سلاکر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ منگلا ابھی تک پڑی سورہی تھی۔ منورما کی پلکیں تک نہیں جھپکیں۔ منگلا کو اتنی دیر تک سوتے دیکھ کر اُس نے آہستہ سے پکارا۔ منگلا کب تک سوئے گی۔ دیکھ تو کتنا دن چڑھ آیا۔ جب پکارنے سے منگلا نہ جاگی تو اس نے اس کا شانہ ہلاکر کہا۔ کیا دن بھر سوتی ہی رہے گی منگلانے کروٹ بدل کرکہا۔ سونے دو۔ سونے دو۔ ابھی تو سوئی

ہوں۔ پھر سر پر سوار ہو گئیں۔

منورما۔ تو پھر میں جاتی ہوں یہ نہ کہنا۔ مجھے کیوں نہیں جگایا۔

منگلا نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ارے اِتنا دن چڑھ آیا۔ پہلے کیوں نہ جگایا۔

منورما۔ جگاتو رہی ہوں جب تمھاری نیند بھی ٹوٹے۔ اسٹیشن چلوگی نا؟

میں اسٹیشن کیسے جاؤں گی؟

جیسے میں جاؤں گی ویسے ہی تم بھی چلنا۔ چلو کپڑے پہن لو۔

"نابھیا، میں نہ جاؤں گی لوگ کیا کہیں گے"۔

"مجھے جو کچھ کہیں گے وہی تمھیں بھی کہیں گے۔ میری خاطر سے سن لینا"۔

آپ کی بات اور ہے۔ میری بات اور ہے۔ آپ کو کوئی نہیں ہنستا۔ مجھے سب ہنسیں گے۔ مگر میں ڈرتی ہوں کہیں تمھیں نظر نہ لگ جائے۔

چلو چلو۔ اٹھو بہت باتیں نہ بناؤ۔ موٹر میں پردہ کرادوں گی۔ بس اب توراضی ہوئیں!

"اماں سنیں گی تو بہت ناراض ہوں گی"۔

"اور جو میں انھیں بھی لے چلوں۔ تب تو تمھیں کوئی عذر نہ ہوگا"؟

"ہاں وہ چلیں گی تو میں چلوں گی۔ لیکن نہیں وہ بڑی بوڑھی ہیں۔ جہاں چاہے آجاسکتی ہیں۔ میں تو لوگوں کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر کٹ ہی جاؤں گی"۔

"اچھا تو پڑی پڑی سو۔ میں تو جاتی ہوں۔ ابھی بہت سی تیاریاں کرنی ہیں"۔

منورما اپنے کمرے میں آئی اور میز پر بیٹھ کر عجلت میں کچھ لکھنے لگی کہ دیوان صاحب کے آنے کی اطلاع ہوئی اور ایک لمحہ میں وہ آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ منورما نے پوچھا۔ ریاست کا بینڈ تیار ہے نا؟

ہری سیوک۔ ہاں! اسے پہلے ہی حکم دیا جاچکا ہے۔

منورما۔ جلوس کا انتظام تو ٹھیک ہوگا؟ میں ڈرتی ہوں۔ کہیں بھدنہ ہوجائے۔

ہری سیوک۔ انتظام تو میں نے سب کردیا ہے پر اس معاملے میں ریاست کی طرف سے جس سرگرمی کا اظہار ہورہا ہے۔ وہ شاید ہمارے لیے مضر ہو۔ ریاستوں پر حکام کی کتنی سخت نگاہ رہتی ہے یہ آپ کو خوب معلوم ہے میں پہلے کہہ چکا

ہوں اور اب کہتا ہوں کہ آپ کو اس موقعہ پر احتیاط سے کام کرنا چاہیے۔
منورما۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کر بیٹھتی ہوں۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ بابو چکردھر چور نہیں، ڈاکو نہیں، خونی نہیں، ان کا استقبال کرنے کے لیے اگر حکام برا مانتے ہیں تو مانیں۔ ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔
ہری سیوک۔ راجہ صاحب کی تو رائے ہے کہ شہر والوں کو جلوس نکالنے دیا جائے۔ ہمارے شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔

منورما نے چین بجبیں ہوکر کہا۔ راجہ صاحب سے میں نے پوچھ لیا ہے۔ ان کی وہی رائے ہے جو میری ہے۔ اگر حق پر چلنے میں ریاست ضبط بھی ہوجائے تو میں اس سے منحرف نہ ہوں گی۔ آپ کو ریاست کے متعلق اس قدر متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔

دیوان صاحب نے مایوسانہ نظروں سے منورما کو دیکھ کر کہا۔ بیٹی! میں تمھارے ہی فائدے کے لیے کہتاہوں۔ تم نہیں جانتیں۔ زمانہ کتنا نازک ہے۔

منورما برانگیختہ ہوکر بولی۔ دادا جی! اس بزرگانہ نصیحت کے لیے بہت ہی احسان مند ہوں۔ لیکن میرا ضمیر اسے قبول نہیں کرتا۔ میں نے سانپ کی طرح خزانہ پر بیٹھ کر اس کی خبرگیری کرنے کے لیے یہ ذمہ داری نہیں قبول کی۔ بلکہ اپنی روحانی ترقی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے مگر ریاست ان دونوں میں سے کسی کام میں ہارج ہو تو اس کا رہنا بیکار ہے۔ ابھی سات بجے ہیں آٹھ بجتے بجتے آپ کو اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیے۔

دیوان صاحب کے جانے کے بعد منورما پھر لکھنے لگی۔ یہ وہ تقریر تھی جو وہ چکردھر کے خیرمقدم کے موقعہ پر کرنا چاہتی تھی۔ وہ لکھنے میں اتنی محو تھی کہ اُسے راجہ صاحب کے آکر بیٹھ جانے کی اس وقت تک خبر نہ ہوئی۔ جب تک ان کے پھیپھڑوں نے انھیں کھانسنے پر مجبور نہ کیا۔ کچھ دیر تک تو بیچارے کھانسی کو روکتے رہے۔ لیکن فطری تحریک کو کون روک سکتا ہے۔ کھانسی دب کر لحہ بہ لحہ شدید ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ ابل پڑی۔ کچھ چھینک تھی کچھ کھانسی اور کچھ ان دنوں کی آمیزش۔ گویا کوئی بندر غرار رہا ہو۔ منورما نے چونک کر آنکھیں اُٹھائیں۔ تو

دیکھا۔ راجہ صاحب بیٹھے اس کی طرف مفتوں نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بولی۔
معاف کیجیے گا مجھے آپ کی آہٹ نہ ملی۔ کیا آپ دیر سے بیٹھے ہیں؟
راجہ۔ نہیں تو ابھی ابھی آیا ہوں۔ تم لکھ رہی تھیں، میں نے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔
منورما۔ آپ کی کھانسی بڑھتی جاتی ہے اور آپ اس کا کچھ علاج نہیں کرتے۔
راجہ۔ آپ ہی اچھی ہوجائے گی۔ بابو چکردھر تو دس بجے کی ڈاک سے آرہے ہیں نا۔ استقبال کا انتظام تو ہوگیا ہے۔
منورما۔ جی ہاں! بہت کچھ ہوگیا ہے۔
راجہ۔ میں چاہتا ہوں۔ جلوس اتنا شاندار نکلے کہ کم سے کم اس شہر کی تاریخ میں یادگار ہوجائے!
منورما۔ یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔
راجہ۔ میں فوج کے آگے فوجی وردی میں رہوں گا۔
منورما۔ کچھ فکرمند ہوکر بولی۔ آپ کا شریک ہونا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ آپ یہاں ان کا خیر مقدم کیجیے گا۔ اپنی ذمہ داریوں اور پابندیوں کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یوں بھی ہم شبہ کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تب تو حکام ستو باندھ کر ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔
راجہ۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا میں سبھی آدمی راجہ تو نہیں ہیں۔ اطمینان کا راز ثروت میں نہیں قناعت میں ہے۔ میں ضرور چلوں گا۔ اگر ریاست ایسے نیک کاموں میں ہارج ہو تو اس سے کنارہ کش ہوجانا ہی اچھا۔
منورما نے راجہ کی طرف نہایت حسرت ناک نظروں سے دیکھ کر کہا۔ یہ درست ہے۔ لیکن جب میں جارہی ہوں تو آپ کا جانا قرین مصلحت نہیں۔
راجہ۔ خیر نہ جاؤں گا۔ لیکن یہاں میں ہرگز خاموش نہ رہوں گا اور ان کی امداد بھی تو کچھ کرنی ہوگی۔
منورما۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کسی قسم کی امداد منظور نہ کریں گے۔ نہایت خود دار آدمی ہیں۔

راجہ۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔ ان کے ایثار کا کیا کہنا۔ چاہتے تو کوئی اچھی ملازمت کر کے آرام سے زندگی بسر کرتے۔ پر غیروں کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ تمھیں ان سے کہنے میں تامل ہو تو میں کہہ دوں۔

منورما۔ نہیں آپ نہ کہیے گا۔ میں ہی ذکر کروں گی۔ مان لیں تو ہے۔

راجہ۔ میری ان کی پرانی ملاقات ہے۔ میں بھی ان کی سمتی کا ممبر تھا۔ اب پھر نام لکھاؤں گا تمھارے خیال میں ان کا ماہواز وظیفہ کتنا ہونا چاہیے۔ رقم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ فارغ البال رہ سکیں۔

منورما۔ میرے خیال میں پچاس روپے کافی ہوں گے۔

راجہ۔ واہ! اتنے روپے لے کر بھلا وہ کیا کریں گے۔ تم بھی کمال کررہی ہو۔ پچاس روپے میں آج کل روٹیاں بھی نہیں چل سکتیں اور اخراجات کا ذکر ہی کیا۔ ایک بھلے آدمی کے گزارے کے لیے اس زمانے میں کم سے کم پانچ سوضرور ہونا چاہیے۔

منورما۔ پانچ سو! کبھی نہ منظور کریں گے۔ پچاس لے لیں۔ میں اسی کو غنیمت سمجھتی ہوں۔ پانچ سو کا نام سنتے ہی وہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔

ہمارا جو فرض ہے وہ ہم کردیں گے۔ لینے یا نہ لینے کا انھیں اختیار ہے۔

راجہ صاحب کا اب تک جن عورتوں سے سابقہ پڑا تھا وہ سب نمود ونمائش بغض وحسد خود بینی وخود غرضی کی پتلیاں تھیں۔ آج کل منورما راجہ صاحب کے دل ودماغ پر مطلق العنانی کے ساتھ حکمران تھی۔ منورما ان سبھوں سے جدا تھی۔ اُس کے مزاج میں دنیا داری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ نہ اُسے زیور ولباس کا شوق نہ کسی سے حسد یا کینہ۔ گویاجنت کی دیوی ہو۔ رفاہ فلاح سے اُسے ایسا سچا عشق تھا کہ قدم قدم پر راجہ صاحب کو اپنی تنگ دِلی اور سفلہ پن کا احساس ہوتا تھا اور منورما پر ان کا اعتقاد فزوں ہوتا جاتا تھا۔ ریاست کے اُمور یا ذاتی معاملات میں جب وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے تھے جس میں غرض یا اقتدار یا کج خلقی کی بُو آتی ہو۔ تو انھیں یہ جاننے میں دیر نہ لگتی تھی کہ منورما کی بھویں تنی ہوئی ہیں۔ اور اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ پھر انھیں اس فعل کے اعادہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس کے قریب آتے ہی ان کی نفسانیت

سرنگوں اور روحانیت سرفراز ہوجاتی تھی۔ اس کی بیدار مغزی اور اصابت رائے پر انھیں کامل اعتماد ہوگیا تھا۔ اس کا ہر ایک قول و فعل انھیں بے عیب نظر آتا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے اگر وہ گھر میں آگ لگادیتی۔ تب بھی انھیں اس میں کوئی مصلحت پنہاں معلوم ہوتی۔ ریاست میں اسامیوں سے محاصل کے نام سے نہ جانے کتنی بیگارلی جاتی تھی وہ سب رانی منورما کے حکم سے بند کردی گئی تھی۔ ریاست کو لاکھوں روپیہ کا خسارہ ہونے لگا پر راجہ صاحب نے زبان تک نہ ہلائی۔ منورما دیوی تھی وہ اس کے پجاری تھے۔

راجہ صاحب کی بات سن کر منورما نے منہ پھیر لیا۔ یہ جملہ اسے ناگوار نہ معلوم ہوا۔ اس میں اشارہ تھا کہ آپ کی یہاں ضرورت نہیں پر راجہ صاحب نے جنبش تک نہ کی۔ ان کی مفتون آنکھیں پر اگ کے پیاسے بھونرے کی طرح منورما کے شگفتہ حسن پر منڈلا رہی تھیں۔ اس کی ادا آج ان کی نظروں میں کھبی جاتی تھی۔ اس کا سنگار روپ آج انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا اور سینہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ دل میں بار بار ایک سوال اٹھتا تھا۔ پر پانی چھپکنے والی مچھلیوں کی طرح پھر دل میں تہ نشین ہو جاتا تھا۔ سوال تھا۔ اس کے باطن کی حقیقت کیا ہے۔ یہ زیبائش یا وہ سادگی۔

دفعتہ نو بجے منورما کرسی سے اٹھی۔ راجہ صاحب بھی کسی درخت کے سایہ میں آرام کرنے والے مسافر کی طرح اٹھے اور آہستہ آہستہ دروازہ کی طرف چلے مگر دروازہ پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر ٹھہرے اور منورما سے بولے۔ میں بھی چلوں تو کیاہرج؟

منورما نے مسکراکر کہا۔ اچھی بات ہے چلیے۔ لیکن دیوان صاحب کے پاس کسی اچھے ڈاکٹر کو بٹھاتے جایئے گا۔ ورنہ شاید اس جشن میں ماتم کرنا پڑے۔

راجہ صاحب کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی پُر خیال رفتار سے باہر چلے گئے۔

(25)

ریلوے اسٹیشن پر کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ چبوترے پر مدرسوں کے

طلبا رنگ برنگ کی وردیاں پہنے ہوئے اور سیوا سمتی کے والنٹیر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لیے ہوئے کھڑے تھے۔ منورما شہر کی کئی معزز خواتین کے ساتھ آنچل میں پھول بھرے والنٹیروں کے بیچ میں تھی۔ برآمدے میں راجہ بشال سنگھ اور شہر کے رؤسا جمع تھے۔ منشی بجردھر ادھر ادھر پینترے بدلتے اور لوگوں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے پھرتے تھے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ کوئی تماشہ نہیں۔ وہ بھی تمھارے جیسا دوہاتھ اور دو پیر کا آدمی ہے۔ آئے گا دیکھ لینا۔ دھکم دھکا کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیوان صاحب خالف نظروں سے پولیس کے سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور بار بار راجہ صاحب کے کان میں کچھ کہتے تھے کسی سانحہ کے خوف سے ان کی روح فنا ہورہی تھی۔

ٹھیک دس بجے انجن دور سے دھواں اڑاتا ہوا دکھائی دیا۔ اب تک لوگ اپنی اپنی جگہوں پر قاعدے کے ساتھ کھڑے تھے۔ لیکن گاڑی کے آتے ہی سارا شیرازہ بکھر گیا۔ پیچھے والے لوگ آپہنچے۔ آگے والے پیچھے پڑ گئے۔ منشی بجردھر بہت چیخے چلائے لیکن کون سنتا۔ گاڑی آکر رُکی۔ اور چکردھر اترے۔ مرد و زن بیتاب ہوہو کر چاروں طرف سے دوڑے۔ منورما بھی چلی۔ لیکن تین چار ہی قدم چلی تھی کہ ایک بات ذہن میں آگئی۔ وہیں ٹھٹک گئی۔ اور ایک عورت کی آڑ سے چکردھر کو دیکھا۔ ایک نحیف۔ خستہ حال صورت، سرجھکائے کھڑی تھی۔ گویا زمین پر پیر رکھتے ڈرتی ہو کہ کہیں گر نہ پڑے۔ منورما کا دل مسوس اُٹھا۔ آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔ آنچل کے پھول آنچل ہی میں رہ گئے۔ اس خیرمقدم کے بعد راجہ صاحب نے آگے بڑھ کر باشندگان شہر کی طرف سے چکردھر کو مبارکباد دیا۔ جلوس آراستہ ہونے لگا۔ منشی بجردھر جلوس کے انتظام میں اتنے محو تھے کہ چکردھر کی انھیں سدھ نہ رہی چکردھر نے یہ تیاریاں دیکھیں تو بولے۔ آپ لوگ اتنی توقیر کرکے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ قومی اعزاز شاندار قومی خدمت کا صلہ ہونا چاہیے۔ مجھ جیسوں کے لیے اس دھوم دھام کی ضرورت نہیں۔ مجھے تماشا نہ بنایئے۔

اتفاق سے منشی بجردھر وہیں کھڑے تھے۔ یہ باتیں سنیں تو بگڑ کر بولے۔ تماشہ نہیں بننا تھا تو غیروں کے لیے جان دینے کو کیوں تیار ہوگئے تھے۔ لوگ دس پانچ ہزار

خرچ کر کے عمر بھر کے لیے رائے بہادر یا خان بہادر ہوجاتے ہیں۔ تم اتنی مصیبتیں جھیل کر یہ اعزاز پا رہے ہو۔ تو اس میں جھینپنے کی کون سی بات ہے۔ بھلا دیکھتا ہوں کہ کوئی ایک چھوٹی موٹی تقریر کرلیتا ہے تو اخباروں میں دیکھتا ہے کہ میری تعریف ہورہی ہے یا نہیں۔ اگر بد قسمتی سے کہیں اڈیٹر نے اس کی تعریف نہ کی۔ تو جامہ سے باہر ہوجاتا ہے۔ آدمی کوئی کام کرتا ہے تو روپے کے لیے یا نام کے لیے۔ اگر دو میں سے ایک بھی ہاتھ نہ آئے تو وہ کام کرنا ہی فضول ہے۔

چکردھر کا زرد چہرہ بھی یہ بے محل تقریر سن کر شرم سے سرخ ہوگیا۔

جلوس روانہ ہوا۔ آگے آگے پانچ ہاتھی تھے۔ جن پر نوبت بج رہی تھی۔ ان کے پیچھے کوتل گھوڑوں کی قطار تھی۔ پھر بینڈ کی کمپنی تھی۔ بینڈ کے پیچھے جگدیشپور کے فوجی سپاہی چار چار کی قطار میں قدم ملائے چل رہے تھے۔ پھر ترتیب سے آریہ مہامنڈل، خلافت۔ سیوا سمتی اور مکاؤٹوں کی جماعتیں تھیں۔ اس کے پیچھے چکردھر کی جوڑی تھی۔ جس میں راجہ صاحب منورما کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر طرح طرح کی چوکیاں تھیں جس میں سیاسی اور تاریخی حالات کے نظارے دکھائے گئے تھے۔ اس کے بعد کئی بھجن منڈیاں تھیں۔ کوئی ڈھول مجیرے پر سیاسی نغمے گاتی تھی۔ کوئی ڈنڈے بجا بجا کر قومی "ہرگنگا" سنارہی تھی۔ سب سے پیچھے جھنکو "سیاسی چنا جوری گرم" سنارہا تھا۔ آخر میں خلقت کا ایک جم غفیر چلا آرہا تھا۔

شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا دو گھنٹے میں یہ جلوس منشی بجردھر کے دروازے پر جاپہنچا۔ یہاں ایک خوشنما اور وسیع پنڈال تیار کیا گیا تھا۔ منورما سپاسنامہ پڑھ کر سنانے والی تھی۔ لیکن جب سب لوگ آکر پنڈال میں بیٹھ گئے اور منورما اسے پڑھنے کے لیے منچ پر کھڑی ہوئی۔ تو اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ایک ہفتہ سے اس نے دل توڑ کر اس خیر مقدم کی تیاریاں کی تھیں۔ لیکن جب وہ موقعہ سعید آیا کہ وہ اپنی کاوشوں کا من مانا انعام حاصل کرے تو اس کی زبان دغا دے گئی۔ فٹن میں وہ چکردھر کے روبرو بیٹھی تھی۔ راجہ صاحب چکردھر سے جیل کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ منورما خاموش بیٹھی رہی۔ چکردھر نے اس کی اُمیدوں کے خلاف اس سے کچھ نہ پوچھا یہ ان کی جانب سے تغافل نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ ایک مدت سے اس

کے دل میں جو شبہ جاگزیں ہورہا تھا اس کی تصدیق ہورہی تھی۔ اس نے ثروت کا لطف اُٹھانے کے لیے راجہ صاحب سے ہرگز شادی نہیں کی۔ اگر چکردھر کے دل میں یہ خیال آرہا ہے تو یہ ان کی بے انصافی ہے۔ منورما انھیں کیسے سمجھاوے کہ یہ شادی محبت کی قربان گاہ ہے۔

منورما کی گھبراہٹ دیکھ کر راجہ صاحب منچ پر آکر کھڑے ہوئے اور بولے۔ دوستو! رانی صاحبہ کی تقریر میں آپ کو جو لطف آتا وہ میری باتوں میں کہاں۔ کوئل کی جگہ کوا کھڑا ہوگیا ہے۔ شہنائی کا عیوض نرسنگھے نے لے لیا ہے۔ ہمارے دوست بابو چکردھر نے جس ہمت اور استقلال سے بیکسوں کی حمایت کی وہ آپ لوگوں پر روشن ہے۔ آپ کا دل رحم اور محبت کا دریا ہے۔ جس عمر میں دوسرے نوجوان دولت کے دروازے پر ماتھے رگڑتے ہیں۔ آپ نے مادرِ وطن کی خدمت کا بیڑا ٹھایا ہے۔ میں آپ کا پرانا مداح ہوں۔

ایک صاحب نے اعتراض کیا۔ آپ ہی نے تو انھیں سزا دلوائی تھی۔

راجہ۔ ہاں! میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ میں انسان ہوں اور ثروت کے نشے میں بے خود ہوجانا ایک انسانی کمزوری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے معاف کریں گے۔

راجہ صاحب کی تقریر جاری ہی تھی کہ منورما پنڈال سے نکل کر اپنے محل کو روانہ ہوگئی۔ راستے بھر وہ روتی رہی۔ اس کا دل چکردھر سے اپنا ر؛ دل کہنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ انھیں سمجھانا چاہتی تھی کہ میں تحقیر کے قابل نہیں رحم کے قابل ہوں تم مجھے نفس کا غلام سمجھ رہے ہو۔ یہ تمھاری زیادتی ہے اور کس طرح میں تمھاری خدمت کرتی۔ مجھ میں عقل کا زور نہ تھا۔ دولت کا زور نہ تھا۔ علم کا زور نہ تھا۔ صرف حسن کا زور تھا۔ اور وہ میں نے تمھارے قدموں پر نثار کردیا۔ پھر بھی تم مجھے حقیر سمجھتے ہو۔

منورما نے دن تو کسی طرح کاٹا۔ لیکن شام کو اس سے نہ رہا گیا۔ فوراً ان کے مکان پہ جاپہنچی۔ دیکھا تو وہ تنہا دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ شامیانہ اُکھڑ گیا تھا۔ فرش فروش اُٹھ چکے تھے۔ ملنے والوں کا تانتا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ منورما کو اس وقت ان کے

روبرو جاتے ہوئے بڑی شرم آتی۔ اگر چھپ کر لوٹنا ممکن ہوتا تو وہ ضرور لوٹ پڑتی۔ اس نے اتنی عجلت کیوں کی۔ دوچار دن میں تو ملاقات ہوہی جاتی۔ پر اب پچھتانا بے سود تھا۔

چکردھر اسے دیکھتے ہی بولے۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میں تو خود ہی حاضر ہونے والا تھا۔

منورما۔ میں نے سمجھا، چل کر دیکھو لوں۔ یہاں کا سامان واپس چلا گیا ہے یا نہیں۔ اُٹھیے کہیں سیر کر آئیں۔ آپ بہت دُبلے ہورہے ہیں کوئی شکایت تو نہیں ہے؟

چکردھر۔ نہیں۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ کوئی شکایت نہیں ہے۔ جیل میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو مجھے وہاں بہت آرام تھا۔ مجھے اپنی کوٹھڑی سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ اس سے جداہوتے ہوئے صدمہ ہوتا تھا۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اس وقت تو آپ مضمحل سی معلوم ہوتی تھیں۔

منورما شرما کر بولی۔ وہ کوئی بات نہ تھی۔ ذرا سر میں چکر آگیا تھا۔

یوں باتیں کرتے دونوں چھاؤنی کی طرف جا پہنچے۔ میدان میں ہری ہری گھاس کا مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ شہر کے رنگین طبع اصحاب کو یہاں آنے کی کہاں فرصت، انھیں تو شہر کی گلیوں ہی سے اُنس ہے۔ یاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بہت دور کچھ لڑکے گیند کھیل رہے تھے۔ دونوں آدمی موٹر سے اُتر کر گھاس پر جا بیٹھے کچھ دیر تک تو دونوں اپنے اپنے خیالات کی فضا میں اُڑتے رہے۔ آخر چکردھر بولے۔ آپ ہی کی بدولت میری سزا میں تخفیف ہوئی تھی اور آج رہائی بھی ہوگئی۔ میرا ایک ایک رویاں آپ کا مشکور ہے۔

منورما۔ آپ مجھے 'آپ' کیوں کہہ رہے ہیں۔ کیا اب میں کچھ اور ہوگئی ہوں۔ میں تو اب بھی آپ کو وہی سمجھتی ہوں۔ مجھ سے اسی طرح بولیے۔ جیسے تب بولتے تھے۔ اس وقت بھی میری یہی خواہش تھی۔ اور اب بھی یہی خواہش ہے کہ آپ کی کچھ خدمت کرسکوں۔ آپ پھر مجھے پڑھانے آیا کیجیے اور راجہ صاحب کو بھی۔

چکردھر نے منورما کو ثروت پسند، ہوس پرور، عشوہ طراز سمجھ رکھا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ وہی بھولی بھالی دوشیزہ ہے۔ جو ان کے سامنے بے حجاب اپنا دل کھول کر رکھ دیا کرتی تھی۔ چکردھر خود غرض نہ تھے۔ کورباطن نہ تھے۔ جیل خانہ میں انھوں نے تہذیب نفس کی بھی کوشش کی تھی۔ راہِ خلق کے لیے وہ اپنی جان بھی قربان کرسکتے تھے۔ لیکن انسان کا نفس وہ معمہ ہے جسے آج تک کوئی نہ حل کرسکا۔ وہ صلح کن ہوکر بھی اپنے بھائی کا خون کرسکتا ہے۔ حق اور انصاف کی چوٹی پر بیٹھ کر انتہائی پستی میں گرسکتا ہے۔ منورما کے یہ الفاظ سن کر چکردھر پر ایک بے خودی کی سی حالت طاری ہوگئی۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں وہ سنبھل گئے اور بولے۔ نہیں منورما! مجھے اس خدمت سے معاف رکھو۔ مجھے دیہاتوں میں بہت کام کرنا ہے۔ مہینوں شہر آنے کا اتفاق نہ ہوگا۔

منورما۔ آپ موٹر پر بہت دور تک چکر لگا کر آسکتے ہیں۔ یہ حیلہ کرکے نہ ٹالیے۔

چکردھر نے مسکراکر کہا۔ اوڑن کھٹولے پر بیٹھ کر خدمت نہیں کی جاسکتی۔

منورما۔ اچھا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلا کروں گی۔ اس میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

چکردھر۔ تمھارے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ تمھارے ہاتھ میں ایشور نے ایک بڑی ریاست کی باگ ڈور دے رکھی ہے۔ تمھارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم اپنی رعایا کو خوش وخرم رکھنے کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹا کام نہیں ہے۔

منورما۔ لیکن تنہا تو میں کچھ نہیں کرسکتی۔ مجھے ہر ایک معاملے میں آپ کے مشورے کی اور ہدایت کی ضرورت ہے۔ آپ اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنی خدمتوں میں مجھے شریک ہونے کا موقعہ دیں۔ زیادہ تو نہیں میں ہر مہینے پانچ ہزار روپے آپ کی نذر کرسکتی ہوں۔ آپ اُسے جیسا چاہیں خرچ کریں۔ میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ آپ کے ہاتھوں خرچ ہورہا ہے۔ میں شہرت کی بھوکی نہیں۔ صرف آپ کی کچھ خدمت کرنی چاہتی ہوں۔ اس سے مجھے محروم نہ کیجیے۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔ اس نے منہ پھیر کر آنسو پونچھ

ڈالے اور پھر بولی۔ آپ کو اختیار ہے۔ مجھے دل میں جو چاہیں سمجھیں۔ میں اس وقت آپ سے سب کچھ کہہ دوں گی۔ میں دل میں آپ کی پرستش کرتی ہوں۔ میرا دل کیا چاہتا ہے یہ میں خود نہیں جانتی ہوں۔ تو کہہ نہیں سکتی۔ میں نے محض آپ کی خدمت کے لیے یہ سونے کی زنجیر اپنے پیروں میں ڈالی۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں دولت کو حقیر سمجھتی ہوں۔ نہیں۔ میں افلاس کو دنیا کی مصیبتوں میں سب سے زیادہ جانگداز سمجھتی ہوں۔ لیکن میری تمنائیں کسی معمولی خوشحال گھر میں پوری ہوسکتی تھیں۔ اس کے لیے مجھے جگدیش پور کی رانی بننے کے لیے ضرورت نہ تھی۔ میں نے محض آپ کی خاطر یہ قربانی کی۔

چکردھر کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ گہرے پانی میں پھسل پڑے ہیں۔ ان کی یہ حالت اس آدمی کی سی ہوگئی۔ جس نے چڑیے کا شکار کرتے ہوئے کسی آدمی کی جان لے لی ہو۔ وہ منورما سے اس لیے دور بھاگے تھے کہ وہ اسے اپنے ساتھ غربت کے کانٹوں میں نہیں گھسیٹنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ ان کے کنارہ کش ہوجانے کا یہ نتیجہ ہوگا۔ انھیں وہ بات یاد آئی۔ جو انھوں نے ایک بار منورما سے بطور مذاق کہی تھی۔ "تم رانی ہوکر مجھے بھول جاؤگی"۔ منورما نے جو اس کاجواب دیا تھا وہ بھی انھیں یاد آگیا۔ ان طفلانہ خیالات میں اتنا مستقل ارادہ چھپا ہوا تھا۔ اس کاانھیں گمان بھی نہ تھا۔ ان کے دل میں رنج وغرور حیرت اور عقیدت پر سارے جذبات پانی کے بلبلوں کی طرح اُٹھ اُٹھ کر تیرنے لگے۔ دل میں ایک بیتاب کن خواہش ہوئی کہ منورما کے قدموں پر سر رکھ کر روئیں۔

یکایک منورما نے پھر کہا۔ آپ دل میں مجھے ملامت تو نہیں کررہے ہیں؟

چکردھر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں لیکن اس کا افسوس ضرور ہے کہ میں نادانستہ طور پر تمھاری نظروں میں اتنا درجہ پاگیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں منورما! میں نہایت بے اصول آدمی ہوں۔ ابھی تم نے میری اصلی صورت نہیں دیکھی۔ دیکھ کر شاید نفرت کرنے لگو۔ مجھ جیسے حقیر انسان کے لیے تمھیں اپنے اوپر اتنا بڑا ستم نہ کرنا چاہیے تھا۔ اب تو میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے حق کے

راستے پر رکھے۔ وہ موقع کبھی نہ آئے کہ تمھیں اپنی اس عقیدت پر اور قربانی پر پچھتانا پڑے۔

منورما۔ آپ نے یہ میرا ہدیہ تو قبول کرلیا؟

چکردھر۔ منورما میں نہیں چاہتا کہ کسی کو تمھارے متعلق بدگمانی کا موقع ملے۔

منورما۔ ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد بولی۔ آپ کو میری شادی کی خبر کہاں ملی؟

"جیل میں اہلیا نے کہی تھی"۔

"جیل میں اُس سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟

"ہاں! ایک بار آئی تھی"۔

"یہ خبر سن کر آپ کے دل میں کیا خیالات آئے تھے؟ سچ کہیے گا"۔

"مجھے تو تعجب ہوا تھا"۔

"صرف تعجب"؟

چکردھر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ "نہیں منورما! کچھ رنج بھی ہوا تھا اور کچھ غصہ بھی"۔

حصّہ دوم

(26)

آگرے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر دونوں فرقوں کے شوریدہ سر جمع ہوجاتے اور دو چار جانیں تلف ہوجاتیں۔ کہیں کسی بنئے نے ڈنڈی ماری اور مسلمانوں نے اس کی دکان پر دھاوا بول دیا۔ کہیں کسی جلاہے نے کسی ہندو کا گھڑا چھولیا اور محلے میں فوجداری ہوگئی۔ ایک محلے میں موہن نے رحیم کا کنکوالوٹ لیا۔ اور اسی بات پر کئی ہندوؤں کے گھر لٹ گئے۔ دوسرے محلے میں دو کتوں کی لڑائی پر کئی آدمی زخمی ہوئے۔ کیوں کہ ایک سوہن کا تھا۔ دوسرا سعید کا۔ ذاتی عداوتیں فرقہ وارانہ جنگ کی صورت اختیار کرلیتی تھیں۔ صبح کو خواجہ صاحب حاکمِ ضلع کو سلام کرنے جاتے ، شام کو بابو جسودانندن۔ دونوں اپنی اپنی اطاعت شعاری کا راگ الاپتے دیوتاؤں کے بھاگ جاگے۔ جہاں کتوں کی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔ وہاں پجاریوں کی بھنگ گھٹنے لگی۔ مسجدوں کے دن پھرے جہاں سانڈ جگالی کرتا تھا۔ وہاں پیر صاحب کی ہانڈیاں چڑھیں۔ ہندوؤں نے مہابیردل بنایا اور مسلمانوں نے علی غول سجایا۔ ہولی کے دن تھے۔ گلیوں میں گلال کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اتنے جوش سے کبھی ہولی نہ منائی گئی تھی۔ وہ نئی روشنی کے ہندو جو رنگ کو خون ناحق سمجھتے تھے۔ آج جیتے جاگتے اندر دھنش بنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک میاں صاحب کے کپڑوں پر دوچار چھینٹے پڑ گئے۔ بس آفت ہی تو آگئی۔ سیدھے جامع مسجد میں پہنچے اور مینار پر چڑھ کر بانگ دی۔ اے امت رسول! آج ایک کافر کے ہاتھوں میرے دین کا خون ہوا ہے۔ یا تو کافروں سے اس خون کا انتقام لو۔ یا میں مینار سے گر کر نبی کی خدمت میں فریاد کرنے جاؤں۔

مسلمانوں نے یہ بانگ سنی اور ان کی تیوریاں بدل گئیں۔ شام ہوتے ہوتے دس

ہزار آدمی سروں سے کفن لپیٹے جامع مسجد کے سامنے آکر جمع ہوگئے۔ سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ہولی کا نشہ ہرن ہوگیا۔ پچکاریاں چھوڑ لوگوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔

بابو جسودانندن کبھی اس افسر کے پاس جاتے۔ کبھی اس افسر کے پاس۔ چاروں طرف مسلم زعمیوں کے نام تار بھیجے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بالآخر جب وہ مایوس ہوکر اُٹھے تو لشکر اسلام کا دھاوا ہوچکا تھا۔ پہلا وار جسودا نندن پر ہو۔ بابو صاحب نے پستول نکال لیا۔ لیکن چھوڑنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک اسلامی تلوار نے شہید کردیا۔

اس سانحہ کی خبر پاتے ہی مہابیر دل کے جوانوں کا خون اُبل پڑا۔ دوسو آدمی تلواریں لے کر نکل پڑے۔ ہندو محلوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں جو کچھ ہورہا تھا۔ وہی مسلمان محلوں میں ہندو کرنے لگے۔ اہنسا نے ہنسا کے آگے سر جھکا دیا۔ ہنس کر بھالے اور چھرے چلائے جاتے تھے۔ مناسب تو یہ تھا کہ طرفین کے جو دھا آمنے سامنے کھڑے ہوجاتے اور خوب دل کے ارمان نکالتے۔ لیکن مردوں کی جوانمردی اور نامردوں کی جوانمردی میں بڑا فرق ہے۔

دفعتاً خبر اُڑی کہ بابو جسودانندن کے گھر آگ لگادی گئی۔ دوڈھائی ہزار ہندوؤں کی جماعت ڈبل مارچ کرتی ہوئی اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے اس طرف چلی۔ منٹوں کی راہ پلوں میں طے ہوئی۔ دور ہی سے شعلے آسمان سے باتیں کرتے نظر آئے۔ رفتار اور بھی تیز کی۔ اور ایک لمحہ میں موقع پر جاپہنچے۔ دیکھا تو وہاں کسی مسلمان کا پتہ نہ تھا۔ آگ پشت کی جانب لگی ہوئی تھی۔ باگیشوری ایک کوٹھڑی میں دروازہ بند کیے بیٹھی تھی ان لوگوں کو آواز سنتے ہی وہ باہر نکل آئی اور بولی۔ ہائے میری اہلیا! ارے دوڑو! ڈھونڈو۔ پاپیوں نے نہ جانے اس کی کیا درگتی کی۔ ہائے میری بچی!

ایک نوجوان نے پوچھا۔ کیا اہلیا کو اٹھا لے گئے؟

باگیشوری۔ ہاں بیٹا! اٹھالے گئے۔ منع کررہی تھی کہ اوری! باہر نہ نکل۔ مریں گے تو ساتھ ہی مریں گے۔ لیکن نہ مانی۔ جیوں ہی بدمعاشوں نے گھر میں قدم رکھا۔ آنگن میں آکر ان سے بحث کرنے لگی۔ ہائے! اس کی باتیں کبھی نہ بھولیں گی۔ کس

کس کو روئیں۔ ہمیشہ سمجھاتی رہی کہ ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ نہ مسلمانوں کے لیے دنیا میں کہیں ٹھور ٹھکانہ ہے نہ ہندوؤں کے لیے۔ دونوں اسی دیس میں رہیں گے۔ اور اسی دیس میں مریں گے۔ پھر آپس میں کیوں لڑتے مرتے ہو۔ مگر میری کون سنتا ہے؟ عورتیں تو پاگل ہوتی ہیں۔ بھونکا کرتی ہیں۔ جلنے دو گھر۔ گھر لے کر کیا کرنا ہے۔ تم جاکر میری بچی کو تلاش کرو۔ جاکر خواجہ محمود سے کہو کہ اس کا پتہ لگائیں۔ ہائے ! ایک دن وہ تھا کہ دونوں آدمیوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ آج یہ حال ہے۔ کہنا تمھیں شرم نہیں؟ جس لڑکی کو بیٹی بناکر میری گود میں سونپا تھا۔ آج اسی کی آبرو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہم سے اب ان کی کیا دشمنی۔ جس سے دشمنی تھی وہ تو رخصت ہوگیا۔

اندر باگیشوری یوں گریہ وزاری کررہی تھی۔ ادھر لوگ آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ مگر پانی کے چھینٹے اس پر تیل کا کام کرتے تھے۔ بارے فائر بریگیڈ موقع پر آپہنچا اور شعلے کسی طرح فرد ہوئے۔

ادھر لوگ خواجہ صاحب کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے پر جسودانندن کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اور خواجہ صاحب بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بولے۔ تم سمجھتے ہوگے۔ یہ میرا دشمن تھا۔ خدا جانتا ہے۔ مجھے اپنا بھائی یا بیٹا بھی اس سے زیادہ عزیز نہ تھا۔ اگر مجھ پر کسی، قاتل کاہاتھ اُٹھتا۔تو جسودا اس وار کو اپنی گردن پر لیتا۔ پھر بھی ہم دنوں کی زندگی کے آخری سال میدان آرائیوں میں گذرے اور آج اس کا یہ انجام ہوا۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ اتحاد کی کوشش کی۔ اب بھی میرا یہی ایمان ہے کہ اتحاد ہی سے اس بدنصیب قوم کی نجات ہوگی۔ لیکن خدا جانے وہ کون سی طاقت تھی جو ہم دونوں کو برسر پرخاش رکھتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھے۔ ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی۔ ایک ہی میدان میں کھیلے۔ پرکون جانتا تھا کہ اس دوستی کا یہ انجام ہوگا۔ آؤ! اس لاش کو اٹھاؤ۔ میرے کندھے دینے میں کوئی ہرج تو نہیں ہے؟ اتنی رعایت تو میرے ساتھ کرنی ہی پڑے گی۔

ایک آدمی نے کہا۔ اہلیا کو بھی لوگ اٹھالے گئے۔

خواجہ! اہلیا کو اٹھالے گئے! کب؟ مجھے خبر نہیں! کلام مجید کی قسم۔ جب تک اہلیا کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا۔ مجھے دانہ پانی حرام ہے۔ تم لوگ لاش لے جاؤ۔ میں اہلیا کی تلاش میں جاتا ہوں۔ سارے شہر کی خاک چھان ڈالوں گا۔ ایک ایک گھر میں جاکر دیکھوں گا۔ اگر کسی بے دین نے قتل نہیں کرڈالا ہے۔ تو اُسے ضرور کھوج نکالوں گا۔ میں نے اُسے میلے میں پایا تھا۔ کیسی بھولی بھالی۔ پیاری بچی تھی۔ بھابی سے میری طرف سے عرض کردینا۔ مجھ سے ملال نہ رکھیں۔ جب تک خواجہ زندہ ہے، انھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی کہہ دینا محمود یا تو اہلیا کو ان سے ہم آغوش کرے گا۔ یا منہ میں کالکھ لگاکر ڈوب مرے گا۔

یہ کہہ خواجہ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے لکڑی اٹھائی اور باہر۔

(27)

چکردھر نے اس دن لوٹتے ہی منشی جی سے آگرہ جانے کی اجازت مانگی۔ منورما نے ان کے سینے میں وہ شعلہ پیدا کر دیا تھا۔ جو اہلیا ہی کے چشمۂ الفت میں بُجھ سکتا تھا۔ یوں وہ زندگی بھر منورما سے غیر متاثر رہ سکتے تھے۔ لیکن منورما نے پرانی یادوں کو تازہ کرکے ان کے دل میں اشتیاق، اضطراب اور تمنا کو بیدار کردیا تھا۔ اس لیے اب وہ نفس کو ایسی مضبوط رسی سے باندھنا چاہتے تھے کہ وہ جنبش بھی نہ کرسکے۔ اہلیا کے دامنِ محبت میں پناہ لینا چاہتے تھے۔

منشی جی نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔ یوں تمھاری خواہش سیر کرنے کی ہو تو جاؤ۔ لیکن تمھیں) وعدہ کرنا پڑے گا کہ منشی جسودانندن سے نہ ملوگے۔

چکردھر۔ ان سے ملنے ہی تو جارہا ہوں۔

بجردھر۔ میں کہے دیتا ہوں۔ اگر تم ادھر گئے تو برا ہوگا۔ تمھارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔

چکردھر خاموش ہوگئے۔ آتے ہی آتے ماں باپ کو کیسے ناراض کردیے۔

لیکن ہولی کے تیسرے دن بعد جب انھوں ے آگرے کے بلوے، جسودانندن کے قتل اور اہلیا کی بے حرمتی کی خبر سنی تو وہ ایک اضطراب کی حالت میں آکر منشی

جی سے بولے۔ اب میرا وہاں جانا لازمی ہے۔
منشی جی نے نرملا کی طرف تاکتے ہوۓ کہا۔ ابھی جیل سے طبیعت آسودہ نہیں ہوئی کہ دوبارہ جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ وہاں اس وقت بدامنی مچی ہوئی ہے۔ ناکردہ گناہ پھنس جاؤ گے اور پھر جاکر کروگے ہی کیا؟ جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔
چکردھر۔ کم سے کم اہلیا کا پتہ تو لگا لوں گا۔
بجردھر۔ بالکل فضول۔ پہلے تو اس کا پتہ لگنا ہی مشکل ہے اور لگ بھی گیا تو تمھارا اس سے کیا تعلق؟
نرملا۔ لڑکی کو اپنی عزت وآبرو کا کچھ خیال ہوگا۔ تو وہ اب تک زندہ ہی نہ ہوگی۔ اگر زندہ ہے تو سمجھ لو بھرشٹ ہوگئی۔
چکردھر۔ اماں! کبھی کبھی آپ ایسی باتیں کہہ دیتی ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ جان کے خوف سے تو بڑے بڑے جوانمرد زمین پر سجدہ کرتے ہیں۔ اہلیا کی ہستی ہی کیا۔ بھرشٹ وہ ہوتا ہے جو گمراہ ہوکر کوئی کام کرے۔ جو کام ہم جبراً کرتے ہیں۔ وہ بھرشٹ نہیں ہوسکتا۔
بجردھر۔ تمھارا مطلب میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن تم اُسے چاہے عصمت کی دیوی سمجھو۔ ہم تو اسے بھرشٹ ہی سمجھیں گے۔ ایسی بہو کے لیے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔
چکردھر نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ وہ آپ کے گھر میں نہ آئیں گی۔
بجردھر نے بھی اتنی ہی بے مروتی سے کہا۔ اگر تمھارا خیال ہے کہ بیٹے کی محبت سے لاچار ہوکر میں اسے قبول کرلوں گا تو یہ تمھاری غلطی ہے۔ اہلیا میرے گھر کی دیوی نہیں ہوسکتی۔ چاہے اس کے لیے مجھے بیٹے کی جدائی ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ میں بھی ضدی ہوں۔
چکردھر پیچھے پھرے ہی تھے کہ نرملا نے ان کے ہاتھ پکڑ لیا اور مادرانہ فہمائش کے انداز سے بولی۔ بچہ! تم سے ہمیں ایسی امید نہ تھی۔ اب ہمارا کہنا مانو۔ خاندان میں داغ نہ لگاؤ۔
چکردھر نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ میں نے آپ کی مرضی کو ہمیشہ مقدم سمجھا۔

لیکن اس معاملے میں مجبور ہوں۔

بجردھر نے بے رحمی کے ساتھ کہا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم آپ سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔

چکردھر۔ اگر آپ کو یہی منظور ہے تو میرا کیا اختیار!

بجردھر۔ یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟

چکردھر۔ جی ہاں آخری!

چکردھر کے چلے جانے کے بعد نرملا نے کہا۔ للّو کبھی ایسا کام نہ کرے گا جس سے خاندان کی رسوائی ہو۔ تم نے اسے ناحق چڑھا دیا۔

بجردھر۔ بیٹے کا پیار کھینچ رہا ہو تو جاکر اسی کے ساتھ رہنا۔

نرملا۔ تم تو جیسے میان سے تلوار نکالے بیٹھے ہو۔ للّو اگر بے دل ہوکر کہیں چلا جائے تو؟

بجردھر۔ تو میرا کیا نقصان ؟ ایسا لڑکا مر بھی جائے تو مجھے رنج نہ ہو۔

نرملا۔ اچھا۔ بس اب منہ بند کرو۔ بڑے دھرماتما بن کر آئے ہو۔ رشوتیں لے لے کر ہڑپتے ہو تو دھرم نہیں جاتا۔ شرابیں اُڑاتے ہو۔ تو منہ میں کالکھ نہیں لگتی؟ جھوٹ کے پہاڑ کھڑے ہو تو آبرو نہیں جاتی۔ لڑکا ایک بے کس کی حفاظت کرنے جاتا ہے تو ناک کٹتی ہے ؟ تم نے کون کون سے بُرے کام نہیں کیے۔ آج دیوتا بننے چلے ہو۔

منشی جی نے نرملا کے منہ سے اتنی دلآزار باتیں پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ وہ جو محبت اور عصمت کی مورت تھی۔ آج شمشیر برہنہ بنی ہوئی تھی۔ ڈاٹ کر بولے۔ سنو جی! میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ باتیں تو نہیں سنیں میں نے اپنے افسروں کی۔ جو میری قسمت کے مالک تھے۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔ زبان تالو سے کھینچ لوں گا۔ سمجھ گئیں؟

یہ کہہ کر منشی جی باہر چلے گئے اور ستار پر ایک گیت چھیڑ دی۔

چکردھر آگرے پہنچے تو سویرا ہوگیا تھا۔ آفتاب ایک قطرہ اشک کی طرح اُفق کی سرخ آنکھوں میں کانپ رہا تھا۔ چکردھر کا دل طرح طرح کے دل شکن خیالات کا

آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ کھڑے سوچتے رہے۔ کہاں جاؤں۔ جسودانندن کے گھر جانا بے کار تھا۔ آخر انھوں نے خواجہ صاحب کے گھر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ خواجہ صاحب پر اب بھی بے حد اعتماد تھا۔ راستے میں فوجی سپاہی گشت لگاتے ہوئے نظر آئے۔ دکانیں سب بند تھیں۔ شہر میں ماتم چھایا ہوا تھا۔

خواجہ صاحب کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا، ہزاروں آدمی ایک لاش کے گرد کھڑے ہیں اور اسے قبرستان لے جانے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ چکردھر کو اندیشہ ہوا۔ کہیں خواجہ صاحب تو نہیں قتل کردیے گئے۔ کسی سے پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ دفعتاً خواجہ صاحب نے آکر ان کا ہاتھ پکڑلیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بولے۔ خوب آئے بیٹا! تمھیں آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ ابھی ابھی تمھارا ہی ذکر تھا۔ خدا تمھاری عمر دراز کرے۔ جانتے ہو۔ یہ کس کی لاش ہے۔ یہ میری آنکھوں کا نور۔ میرے دل کا سرور۔ میرا لخت جگر ہے۔ جس کی ذات سے زندگی کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ اب تمھیں اس کی صورت یاد آگئی ہوگی۔ لیکن خدا جانتا ہے۔ اس کی موت پر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نکلا۔ تمھیں حیرت ہورہی ہوگی میں بالکل سچ کہہ رہاہوں۔ ایک گھنٹہ قبل تک اس پر نثار ہوتا تھا۔ لیکن اب اس کے نام سے نفرت ہورہی ہے۔ اس نے وہ فعل کیا ہے جو انسانیت کے درجہ سے گرا ہوا ہے۔ تمھیں اہلیا کے بارے میں تو کوئی خبر ملی ہوگی۔

چکردھر۔ جی ہاں! شاید کچھ بدمعاش اُسے پکڑ لے گئے۔

خواجہ۔ یہ وہی بدمعاش ہے جس کی لاش تمھارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ وہ اسی کی حرکت تھی۔ میں تو سارے شہر میں اہلیا کو تلاش کرتا پھرتا تھا اور وہ میرے ہی گھر میں قید تھی۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ کوئی عالی خاندان لڑکی ہے۔ کاش اس ملک میں ایسی اور لڑکیاں ہوتیں۔ آج اس نے موقعہ پاکر اُسے جہنم کا راستہ دکھایا۔ سینے میں چھری چبھودی۔ ظالم تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ ایسے لڑکے کی موت پر کون باپ روئے گا۔ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ ایسی پارسا بیوی پاؤگے۔ ابھی اسی گھر میں ہے۔ صبح سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ چل تجھے تیرے گھر پہنچا آؤں۔ گھر جاتی ہی نہیں۔ بس بیٹھی رو رہی ہے۔

اس سانحہ نے چکردھر کے حواس کو مفلوج کردیا۔ رنج یا تعزیت کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکلا۔

جنازہ اٹھایا گیا۔ سوگواروں کا ایک جم غفیر جنازہ کے ساتھ تھا۔ چکردھر بھی خواجہ صاحب کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ جس وقت لاش قبر میں اتاری گئی۔ خواجہ صاحب روپڑے۔ ہاتھوں سے مٹی دے رہے تھے اور آنکھوں سے اشک کی بوندیں مرنے والے کی میت پر گر رہی تھیں۔ چکردھر بھی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔

دوپہر ہوتے ہوتے لوگ گھر لوٹے۔ خواجہ صاحب ذرا دم لے کر بولے۔ آؤ بیٹا! تمھیں اہلیا کے پاس لے چلوں۔ اسے ذرا تشفی دو!

یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے چکردھر کا ہاتھ پکڑلیا اور اندر چلے گئے۔ چکردھر کا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ وہ خیال کررہے تھے۔ اہلیا کی اس وقت کچھ اور ہی حالت ہوگی۔ آنکھیں سرخ ہوں گی۔ چہرہ غضبناک۔ ایک ایک عضو سے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ مگر جب اس پر نگاہ پڑی تو دیکھا وہی لجاجت، وہی متانت، وہی شرمیلا پن، وہی درد اور رقت سے بھری آنکھیں۔ ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی باغیچہ کی طرف تاک رہی تھی۔ چکردھر کو دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ اور گھونگٹ میں منہ چھپا لیا۔ پھر ایک ہی لمحہ میں وہ ان کے پیروں کو پکڑ کر آنسو سے دھونے لگی۔ ان قدموں پر سر رکھے ہوئے اسے ایک روحانی تسکین، ایک غیبی طاقت اور صبر آمیز سکون کا احساس ہورہا تھا۔

چکردھر نے کہا۔ اہلیا! تم نے جس بہادری سے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ اس پر میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم نے بیر چھترانیوں کی یاد تازہ کردی۔ اگر افسوس ہے تو یہی کہ خواجہ صاحب کا گھر تباہ ہوگیا۔

اہلیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ چکردھر پھر بولے۔ مجھے شرمندہ نہ کرو اہلیا! مجھے تمھارے قدموں پر سر جھکانا چاہیے۔ الٹی گنگا بہارہی ہو۔ کہاں ہے وہ چھری، ذرا اس کے درشن تو کرلوں۔

اہلیا نے اٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فرش کا کونہ اٹھایا اور نیچے سے ایک چھری نکال کر چکردھر کے سامنے رکھ دی۔ اس پر خون جم کر سیاہ ہوگیا تھا۔

چکردھر نے پوچھا۔ یہ چھری تمھیں یہاں کیسے مل گئی۔ اہلیا۔ کیا ساتھ لیتی آئی تھیں۔

اہلیا نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ اسی کی ہے۔

چکردھر۔ تمھیں کیسے مل گئی؟

اہلیا۔ یہ نہ پوچھیے۔ بیکسوں کے پاس اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے مکروفریب کے سوا اور کون سا وسیلہ ہے؟

چکردھر۔ یہی تو سننا چاہتا ہوں اہلیا!

اہلیا نے سر اٹھا کر چکردھر کی طرف پرغرور نظروں سے دیکھا اور بولی۔ سن کر کیا کیجیے گا؟

چکردھر۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی پوچھ رہا تھا۔

اہلیا۔ نہیں آپ یوں ہی نہیں پوچھ رہے ہیں۔ اس سے آپ کی کوئی خاص منشا ہے۔ اگر کوئی شبہ ہو تو میری اگنی پریکشا لے لیجیے۔

چکردھر نے دیکھا۔ بات بگڑ رہی ہے۔ سمجھے شاید میرے بے موقع سوال نے اہلیا کے زخمی دل کو ٹھیس لگادی۔ یہ سمجھ رہی ہے میں اس پر شبہ کررہا ہوں۔ تمھاری اگنی پریکشا تو ہوچکی اہلیا! اور تم اس میں کھری نکلیں۔ اب بھی اگر کسی کے دل میں شبہ ہو تو سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنی عقل کھو بیٹھا ہے۔ تم گل نو بہار کی طرح پاکیزہ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی طرح بے لوث ہے۔ میرے دل میں کسی بات کا گمان بھی ہوتا تو تم مجھے یہاں زندہ نہ دیکھتیں۔ وہ محبت اور اعتماد کا ل جو مجھے تم پر ہے وہ اب روشن ہوجائے گا۔ اہلیا! میں کب کا تمھیں اپنے دل میں بٹھا چکا۔ وہاں تم محفوظ بیٹھی ہو۔ شبہ یا بدگمانی کا قاتل ہاتھ وہاں اسی وقت پہنچے گا۔ جب (سینے پر ہاتھ رکھ کر) یہ قلعہ مسمار ہوجائے گا۔ چلو گھر چلیں۔ ماتا جی گھبرا رہی ہوں گی۔

یہ کہہ کر انھوں نے اہلیا کا ہاتھ پکڑلیا۔ اور چاہا کہ اسے سینے سے لگالیں۔ لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر ہٹ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ نہیں۔ نہیں میرے جسم میں ہاتھ نہ لگائیے۔ سونگھا ہوا پھول دیوتاؤں پر نہیں چڑھایا جاتا۔ میں اب وہاں نہ جاؤں گی۔ کہیں نہ جاؤں گی۔ آپ کی خدمت کرنا میری تقدیر میں نہ تھا۔ میں نامراد پیدا

ہوئی اور نامراد ہی مروں گی۔ آپ میرے لیے افسوس نہ کریں۔ اماں جی کو بھی سمجھا دیجیے گا ....

چکردھر سے اب رہا نہ گیا۔ انھوں نے پھر اہلیا کا ہاتھ پکڑلیا اور بولے۔ اہلیا! جس جسم میں پاکیزہ اور بے داغ روح جلوہ گزیں ہوتی ہے۔ وہ جسم بھی پاکیزہ اور بے لوث ہوجاتا ہے۔ میری نظروں میں تم آج اس سے کہیں زیادہ پاکیزہ ہو جتنی پہلے تھیں۔ تمھاری آزمائش ہوچکی ہے۔ اب دیر نہ کرو۔ ایشور نے چاہا تو کل ہم اس محبت کے رشتے میں باندھ جائیں گے۔ جسے ایام کی گردش بھی نہیں توڑ سکتی۔ جولافانی اور لازوالی ہے۔

اہلیا کئی منٹ تک چکردھر کے کندھے پر سر رکھے روتی رہی۔ اور بولی ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں بتاؤ گے؟ سچے دل سے کہنا۔

چکردھر۔ کیاپوچھتی ہو۔ پوچھو!

اہلیا۔ تم صرف میرے اوپر ترس کھاکر یہ رسوائی کا بوجھ اپنے سر پر لے رہے ہو یا سچی محبت سے؟

اس سوال سے وہ خود شرمندہ ہوئی۔ پھر کہا۔ بات بے ڈھنگی سی ہے۔ لیکن معاف کرنا میں نادان نہیں۔ یہ خیال میرے دل میں بار بار پیدا ہوتا ہے۔ پہلے بھی ہوا تھا اور اب تو اور بھی ہورہا ہے۔

چکردھر کا دل بیٹھ گیا۔ اہلیا کی سادگی اور صاف گوئی نے انھیں ان باتوں کے اظہار کے لیے مجبور کردیا۔ جو وہ نہ کہنا چاہتے تھے۔ ہاں! اس کا رنج ضرور ہوا کہ وہ انھیں اتنا سفلہ اور تنگ نظر سمجھ رہی ہے۔ بولے۔ تمھیں کیا معلوم ہورہا ہے اہلیا!

اہلیا۔ میں جانتی تو آپ سے پوچھتی کیوں۔

چکردھر۔ اہلیا! تم ان باتوں سے مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ چیل کو چاہے گوشت کا ٹکڑا نہ نظر آئے۔ چیونٹی کو چاہے شکر کی خوشبو کا احساس نہ ہو۔ لیکن حسنہ کے وجود کا ایک ایک ذرّہ حواس خمسہ کی طرح محبت کی صورت ذائقہ بو آواز اور لمس کا احساس کرلیتا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ رحم اور فرض کے اصولوں سے میں واقف نہیں۔ صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔ تمھیں پاکر مجھے

پھر کسی چیز کی ہوس نہ رہے گی۔
اہلیا نے مسکرا کر کہا۔ تو آپ کے قول کے مطابق میں آپ کے دل کا حال جانتی ہوں۔
چکردھر۔ بے شک! اس سے زیادہ جتنا میں خود جانتا ہوں۔
اہلیا۔ تو صاف صاف کہہ دوں۔
چکردھر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ کہو سنوں۔
اہلیا۔ تمھارے دل میں محبت سے زیادہ رحم کا خیال ہے۔
چکردھر۔ بالکل غلط ہے اہلیا!تم میرے ساتھ بے انصافی کررہی ہو۔
اہلیا۔ ابھی آپ نے کہا کہ میں آپ کے دل کاحال آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔ اس لیے آپ کو قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ جس چیز کو لینے کی میری بساط نہیں ہے اس پر ہاتھ بڑھاؤں گی۔ میرے لیے وہی بہت ہے جو آپ دے رہے ہیں۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔
چکردھر۔ تم نے تو میری زبان بند کردی۔ اگر یہی سوال میں تم سے کرتا تو تم کیاجواب دیتیں؟
اہلیا۔ تو میں صاف صاف کہہ دیتی کہ میں آپ کی محبت سے زیادہ آپ کی تعظیم کرتی ہوں۔
چکردھر کا منہ لٹک گیا۔ ساری گرمئ الفت غائب ہوگئی۔ مایوسانہ انداز سے بولے۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھااہلیا!
تو آپ غلطی کررہے تھے۔ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ محبت دل کی ساری کیفیات کے توازن کا نام ہے۔ اس میں رحم اور عفو۔ ہمدردی اور عزت اعتقاد اور اعتماد۔ خدمت اور احسان سبھی شامل ہوتے ہیں۔ ممکن ہے۔ آج کے دس سال بعد میں آپ کے دل کی مالک بن جاؤں۔ لیکن اتنی جلد ممکن نہیں۔ ان جذبات میں سے کوئی ایک محبت کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ پر اس کا نشوونما دیگر جذبات کی آمیزش سے ہی ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں ابھی صرف رحم کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ میرے دل میں تعظیم اور اعتقاد کا۔ اور تعظیم اور اعتقاد رحم کی نسبت محبت سے قریب

تر ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہی جذبات دلکش ہوکر محبت کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

اہلیا کے منہ سے محبت کی ایسی فلسفیانہ تشریح سن کر چکردھر دنگ رہ گئے۔ انھیں گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بیدار مغز اور عقیل ہے۔ انھیں اس خیال سے مسرت ہوئی کہ اس کے ساتھ زندگی پرلطف ہوجائے گی۔ مگر اہلیا کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے آپ ہی آپ چھوٹ گیا اور انھیں اس کی طرف تاکنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس کی محبت کا معیار کتنا اعلیٰ ہے۔ شاید یہ گفتگو اس کی نظروں میں نفسانیت سے ملوث ہوگی۔ اس خیال نے ان کے جذبات کو مفلوج کردیا۔ بے حس وحرکت کھڑے رہ گئے۔

دفعتہً اہلیا نے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ مجھ سے رشتہ کرکے آپ رسوا نہ ہو جائیں۔ شاید آپ کے والدین آپ سے کنارہ کش ہوجائیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوش نصیبی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ آپ کی خادمہ بنوں۔ لیکن آپ کی رسوائی اور تحقیر کا خیال کرکے بھی دل میں آتا ہے کہ کیوں نہ اس زندگی کا خاتمہ کردوں۔ محض آپ کے دیدار کی تمنا نے مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔ میں آپ کو اپنے داغوں سے داغدار بنانے کے پہلے مرجانا اچھا سمجھتی ہوں۔

چکردھر نے دردناک لہجے میں کہا۔ ایسی باتیں نہ کرو اہلیا۔ اگر دنیا میں اب بھی کوئی ایسا کمینہ آدمی ہے جو تمھاری دلیرانہ جاں نثاری کی قدر نہ کرے تو وہ انسان نہیں اور نہ میں والدین کی رضامندی پر اپنے ضمیر کی آزادی کو قربان کرسکتا ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ دل میں ایسے خیالات کو جگہ دے کر مجھے خفیف نہ کرو۔

اہلیا نے اب کی محبت سے سرشار آنکھیں چکردھر کی طرف پھیریں وہ آگ جو اس کے دل ودماغ کو جلائے ڈالتی تھی بجھ گئی اور اس کی پرسکون نگاہوں میں چکردھر نورانی محبت سے منور دکھائی دیے۔

شام کے وقت اہلیا اپنے گھر پہنچی۔ باگیشوری اس سے گلے لپٹ کر رو رہی تھی اور چکردھر کھڑے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے اس گھر کو دیکھ رہے تھے۔ سب کچھ وہی تھا پر ماتم کے گہرے رنگ میں رنگا ہوا۔

(28)

جسودانندن کے آخری مراسم ادا ہوگئے۔ مگر دھوم دھام سے نہیں۔ یہ مرنے والے کی آخری وصیت تھی۔

اس کے تیسرے ہی دن چکردھر اور اہلیا کی قسمتیں باہم مربوط ہوگئیں۔ چکردھر تو ابھی کچھ دن اور ٹالنا چاہتے تھے لیکن باگیشوری بہت مصر تھی۔ شوہر کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد وہ ایک پرائی لڑکی کی حفاظت کا بار نہ لینا چاہتی تھی۔ شادی میں کسی قسم کی نمائش نہ کی گئی۔ ہاں شہر کے کئی رئیسوں نے کنیا دان میں بڑی بڑی رقمیں دیں۔ اور سب سے بڑی رقم خواجہ محمود کی تھی۔ افراق کا بھوت دو قربانیاں پاکر خاموش ہوگیا تھا۔

جس دن چکردھر اہلیا کو رخصت کرکے گھر چلے۔ ہزاروں آدمی انھیں اسٹیشن پر پہنچانے آئے۔ باگیشوری کا روتے روتے برا حال تھا۔ جی چاہتا۔ اہلیا کو پکڑلوں۔

لیکن چکردھر کے سامنے ایک دوسرا ہی مرحلہ درپیش تھا۔ وہ گھر تو جارہے تھے۔ لیکن اس گھر کے دروازے ان کے لیے بند تھے۔ اور ان پر دل کی گانٹھ سے بھی زیادہ مضبوط قفل پڑا ہوا تھا۔ جس کے کھلنے کی تو کیا ٹوٹنے کی بھی امید نہ تھی۔ نویلی دولہن کے ساتھ لیے ہوئے نوشے کے دل میں جو مسرتیں ہنگامہ خیز ہوتی ہیں۔ ان کا یہاں نشان بھی نہ تھا۔ باپ کا غصہ ، ماں کی ناراضگی ، رشتہ داروں کا احتراز ساری مصیبتیں گھر پر ان کا انتظار کررہی تھیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ گاڑی سے اتر کر جائیں گے کہاں؟ احباب کی کمی نہ تھی۔ لیکن دلہن کو ساتھ لیے ہوئے کسی دوست کے گھر جانے کے خیال ہی سے شرم آتی تھی۔ اپنی تو زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ یہ سبھی مشکلات برداشت کرسکتے تھے۔ لیکن اہلیا نہیں کیسے جھیلے گی۔ انھوں نے سوچا۔ وہ گھر جائیں ہی کیوں؟ کیوں نہ الہ آباد میں اُتر پڑیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب والدین کا غصہ فرد ہوجائے تو چلے جائیں۔ ان تفکرات سے ان کا چہرہ اتنا گھرا ہوا تھا کہ اہلیا نے ان کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔ بولی۔ آپ اتنے متفکر کیوں ہیں۔ کیا ابھی سے میری فکر سوار ہوگئی؟۔

چکردھر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ متفکر تو نہیں ہوں۔ یہ تو خوش ہونے کا موقع ہے۔

اہلیا۔ یہ تم اپنی صورت سے پوچھو!

چکردھر نے ہنسنے کی ناکام کوشش کر کے کہا۔ میں تو اتنا خوش ہوں کہ ڈرتا ہوں لوگ مجھے کم ظرف نہ سمجھنے لگیں۔

مگر چکردھر اپنے اضطراب کو جتنا چھپاتے تھے۔ اتنا ہی وہ اور بھی عیاں ہوتا جاتا تھا۔ جیسے کوئی مفلس اپنی ساکھ بنائے رکھنے کی کوشش میں اور بھی مفلس ہوتا جاتا ہے۔ اہلیا نے گلہ کر کے کہا۔ خیر! نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں۔ تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں۔

چکردھر اب خاموش نہ رہ سکے۔ والدین کی ناراضگی کی داستان اول سے آخر تک کہہ سناتی اور الہ آباد اترنے کی تجویز پیش کی۔

اہلیا نے خودداری کی شان سے کہا۔ تا گھر رہتے الہ آباد کیوں اُتریں۔ ماں باپ کی ناراضگی کے خوف سے کوئی اپنا گھر نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ کتنے ہی ناراض ہوں۔ ہیں تو اپنے ہی ماں باپ ہم لوگوں نے کتنی ہی بے جا حرکت کی ہو۔ پر ہیں تو انھیں کی اولاد۔ اس رشتہ کو کون توڑ سکتا ہے۔ آپ ان فکروں کو دل سے نکال ڈالیئے۔

چکردھر۔ نکالنا تو چاہتا ہوں پر نکلتے نہیں۔ بابو جی کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہو سکتی ہے وہ ہے۔ لیکن ان کے مذہبی اور مجلسی خیالات اتنے تنگ ہیں کہ ان میں ہردم کی گنجائش بھی نہیں۔ مجھے خوف ہے کہ وہ ہمیں گھر میں جانے ہی نہ دیں گے۔ اس میں کیا ہرج ہے کہ ہم لوگ الہ آباد اتر پڑیں۔ اور جب تک گھر کے لوگ ہمارا خیر مقدم کرنے کو تیار نہ ہوں۔ یہیں رہیں۔

اہلیا۔ آپ کو کوئی ہرج نہ معلوم ہوتا ہو تو رہئے۔ مجھے تو ماں باپ سے الگ جنت میں بھی رہنا ہو تو اچھا نہ لگے۔ آخر ہمیں ان کی خدمت کرنے کا اور کون سا موقع ملے گا۔ بچپن میں تو ہم ماں باپ کی ناراضگی کا برا اثر نہیں مانتے۔ مچل مچل کر ان کی گود میں بیٹھتے ہیں۔ مار کھاتے ہیں۔ گھڑکے جاتے ہیں۔ مگر ان کا گلا نہیں چھوڑتے۔ تو اب ان کی خدمت کرنے کے موقع پر ان کی ناخوشی پر

منہ پھلا لینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

رات کے دس بجتے بجتے گاڑی بنارس پہنچی۔ اہلیا کے اطمینان دلانے پر بھی چکردھر بہت متفکر ہو رہے تھے۔ کہیں دادا نے جاتے ہی جاتے گھڑکیاں جمانی شروع کیں اور اہلیا کو گھر میں نہ جانے دیا۔ تو ڈوب مرنے کی بات ہوگی۔ لیکن انھیں کتنا تجربہ ہوا جب انھوں نے منشی جی کو دو آدمیوں کے ساتھ اسٹیشن پر اپنی انتظار میں کھڑے پایا۔ منشی جی کی اس بزرگانہ شفقت نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ جاکر ان کے پیروں پر گر پڑے۔ منشی جی نے انھیں سینے سے لگالیا اور ان کے اشک سعادت کو رومال سے پونچھتے ہوئے محبت آمیز لہجہ میں بولے۔ کم سے کم ایک تار تو دے دیتے کہ فلاں گاڑی سے آرہا ہوں۔ خط تک نہ لکھا۔ یہاں برابر دس دن سے دوبار اسٹیشن پر دوڑا آتا ہوں اور ایک آدمی ہر دم تمھارے انتظار میں بٹھائے رکھتا ہوں کہ نہ جانے آپ کس گاڑی سے آجاؤ۔ کہاں ہے بہو چلو۔ اُتار لائیں۔ بہو کے ساتھ یہیں ٹھیرو۔ اسٹیشن ماسٹر سے کہہ کر ویٹنگ روم کھلوائے دیتا ہوں۔ میں دوڑ کر ذرا باجے گاجے کی فکر کرلوں۔ یہاں لوگ کیا جانیں گے کہ بہو آئی ہے۔ وہاں کی بات اور تھی، یہاں کی بات اور ہے۔

چکردھر نے منشی جی کو اہلیا کے ڈبے پر لاکے کھڑا کردیا۔ اہلیا نے آہستہ سے اترکر ان کے قدموں پر سر رکھا۔ منشی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ اور دونوں آدمیوں کو ویٹنگ روم میں بٹھاکر بولے۔ میں کوئی گھنٹے بھر میں آجاؤں گا۔ تم سے بڑی غلطی ہوئی مجھے تار نہ دے دیا۔ اب بے چاری بہو یہاں پر دیسیوں کی طرح گھنٹوں بیٹھی رہے گی۔ تمھارا کوئی کام لڑکپن سے خالی نہیں ہوتا۔ چھوٹی رانی صاحب کئی بار آچکی ہیں۔ آج چلتے چلتے تاکید کر گئی ہیں کہ بابوجی آجائیں تو مجھے خبر دیجیے گا۔ میں اسٹیشن پر ان کا استقبال کروں گی اور بہو کو ساتھ لاؤں گی۔ سوچو انھیں کتنی تکلیف ہوگی۔

چکردھر نے انکسار کے ساتھ کہا۔ انھیں تو آپ اس وقت تکلیف نہ دیجیے۔ اور رات کو بھی اس وقت باجے گاجے کے لیے تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ سویرے تو سب کو معلوم ہو ہی جائے گا۔

منشی جی نے لکڑی سنبھالتے ہوئے کہا۔ سنتی ہو۔ بہو ان کی باتیں؟ سویرے لوگ جان کر کیا کریں گے۔ دنیا کیا جانے گی کہ بہو کب آئی؟

منشی جی چلے گئے تو اہلیا نے چکردھر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ تم تو کہتے تھے بڑے بدمزاج ہیں۔ مجھے تو یہ دیوتا معلوم ہوتے ہیں۔

چکردھر شرمندہ ہوگئے۔ اس کی تردید نہ کی۔ مگر ان کا دل کہہ رہا تھا کہ دادا اس وقت دنیا کو دکھانے کے لیے کتنی ہی دھوم دھام کیوں نہ کرلیں۔ گھر میں کوئی نہ کوئی گل کھلے گا ضرور۔ انھیں یہاں بیٹھنا ناگوار گذر رہا تھا۔ ساری رات کا جھمیلا ہوگیا۔ شہر کی گشت لگانی پڑے گی۔ گھر پہنچ کر نہ جانے کتنی رسمیں ادا کی جائیں گی۔ تب کہیں جاکے گلا چھوٹے گا۔

منشی جی کو ابھی گئے آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ منورما آکر کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ چکردھر چونک پڑے اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ منورما سے آنکھیں چار کرنے کی ان کی ہمت نہ پڑی۔ گویا کوئی تقصیر کی ہو۔ منورما نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔ واہ بابو جی ! آپ چپکے چپکے بہو کو اڑا لائے اور مجھے خبر تک نہ دی۔ منشی جی نہ کہتے تو مجھے معلوم نہ ہوتا۔ آپ نے اپنا تو گھر بسایا۔ میرے لیے بھی تو کوئی سوغات لائے؟

چکردھر نے منورما کی طرف منجل آنکھوں سے دیکھا۔ تو اس کا چہرہ اڑا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی پر آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ ان آنکھوں میں کتنی التجا تھی۔ اور کتنی مایوسی! چکردھر کو اس کا جواب دینے کے لیے الفاظ نہ ملے۔

اہلیا بھی کھڑی ہوگئی تھی۔ منورما نے اس کے پاس جاکر کہا۔ آؤ بہن! تم سے تو گلے مل لوں۔ میری شکایت تو ان سے ہے۔

یہ کہہ کر وہ اہلیا کے پاس گئی اور اسے گلے سے لگا کر اپنا جڑاؤ کنگن اہلیا کے ہاتھ میں پہنادیا۔ دفعتاً اس کی نگاہ آئینے پر جا پڑی۔ اہلیا کا چاند سا چہرہ اپنے سارے دلفریبوں کے ساتھ اس میں من عکس ہورہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دیوتا کا آشیرواد صورت پذیر ہوکر آسمان سے اتر آیا ہے۔ اس کی نازک شرمیلی اور متین اداؤں کے سامنے اس کا شکوہ حسن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کسی سادھو کی کٹی کے سامنے

کوئی شاہی ایوان کھڑا ہو۔ وہ ایوان اس کٹی کے سامنے اس وقت جھک گیا۔ ایوان ویران تھا۔ کٹی میں ایک نورانی وجود جلوہ افروز تھا۔

اہلیا نے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ اور پان الائچی پیش کرتی ہوئی بولی۔ میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ آپ کے آرام کا وقت تھا۔

چکردھر باہر چلے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ میرے روبرو دونوں کو باتیں کرنے میں حجاب ہوگا۔

منورما نے گرسنہ آنکھوں سے اہلیا کو دیکھ کر کہا۔ نہیں بہن! مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں تو یوں ہی بارہ ایک بجے تک نہیں سوتی۔ تم سے ملنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ میں نے اپنے دل میں تمھاری جو صورت کھینچ رکھی تھی۔ تم بجنسہ ویسے ہی نکلیں۔ جبھی تو بابو جی تم پر فدا ہوگئے۔ تم خوش نصیب ہو۔ تم نے زندگی کا ایسا رفیق پایا۔ جو ظاہر میں انسان اور باطن میں فرشتہ ہے۔

اہلیا نے مسکرا کر کہا۔ آپ کے لیے کوئی سوغات تو لائے ہی نہیں۔

منورما۔ میرے لیے تم سے بڑھ کر اور کیا سوغات لاتے۔ میں دنیا میں اکیلی تھی۔ تمھیں پاکر دوکیلی ہوجاؤں گی۔ منگلا سے میں نے محبت نہیں بڑھائی۔ کل کو وہ پرائے گھر چلی جائے گی کون اس کے نام پر بیٹھ کر روتا۔ تمھیں سہیلی بنانے میں کوئی اندیشہ نہیں۔ آج سے تم میری سہیلی ہو۔ ایشور سے میری یہی دعا ہے کہ ہم اور تم آخر تک محبت کے رشتہ میں بندھی رہیں۔

اہلیا۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ آپ کے حسن اخلاق کی تعریف کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔

منورما نے بے صبر ہوکر پوچھا۔ سچ۔ میرا ذکر کبھی کرتے ہیں؟

اہلیا۔ برابر بات چیت پر آپ کا تذکرہ آجاتا ہے۔

اتنے میں باجوں کی دھوں دھوں پوں پوں سنائی دی۔ منشی جی بارات سجائے چلے آرہے تھے۔ سامان تو پہلے ہی سے جمع کر رکھے تھے۔ جاکر لے آنا تھا۔

اہلیا کے دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے جن باتوں کا خواب میں بھی گمان نہ تھا۔ وہ سب پوری ہوئی جاتی تھیں۔ کبھی اس کا خیر مقدم اس شان سے

ہوگا۔ کبھی ایک بڑی رانی اس کی سہیلی بنے گی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

منورما نے اُسے آہستہ سے لاکر سکھپال پر بٹھادیا۔ برات چلی۔ چکردھر ایک سبزہ گھوڑے پر سوار تھے۔

ایک لمحہ میں سناٹا ہوگیا۔ لیکن منورما ابھی تک اپنی موٹر کے پاس کھڑی تھی۔ گویا راستہ بھول گئی ہو۔

(29)

گروسیوک سنگھ جگدیش پور کے ناظم ہوگئے تھے۔ تینوں پہلی رانیاں وہیں رہتی تھیں۔ ان کے آسائش و آرام کے لیے ضروری چیزیں مہیا کرنا ان کا کام تھا۔

تینوں رانیوں میں اب معرکہ آرائیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ اب ہر ایک کو اختیار تھا۔ جتنے نوکر چاہے رکھے۔ جتنے زیور چاہے بنوائے۔ جتنی تقریبیں چاہے منائے۔ پھر قضیہ کس بات کے لیے ہوتا۔ راجہ صاحب کو کسی رانی سے خاص الفت نہ تھی۔ نفاق کا یہ سب سے بڑا سبب بھی اب نہ تھا۔

ٹھاکر صاحب نے دیوان خانہ میں اپنا دفتر بنالیاتھا۔ رانیاں ان سے پردہ تو کرتی تھیں۔ مگر پردے کی اوٹ سے بات چیت کرلیتی تھیں۔ بسومتی اوٹ کو بھی فضول سمجھتی تھی۔ اس کا دل دنیا سے بیزار ہوگیاتھا۔ دن بھر دھیان پوجا میں مصروف رہتی تھی۔ روہنی سے ان کا خوب میل جول تھا۔ دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتیں۔ بسومتی کو زیوروں کا شوق اب بھی تھا۔ روہنی کو ان سے نفرت ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ مانگ میں سندھور ڈالنا اب چھوڑ دیا تھا۔ کہتی۔ مجھ میں اور بیوہ میں اب فرق کیا ہے۔ بلکہ بیوہ مجھ سے ہزار درجہ اچھی۔ اسے ایک یہی رونا ہے کہ شوہر نہیں۔ جلن تو نہیں۔ یہاں تو زندگی رونے اور کڑھنے میں کٹ رہی ہے۔ رہی رانی رام پریا۔ انھیں آج کل گانے کی دھن سوار تھی۔ طرح طرح کے باجے منگاتی رہتی تھیں۔ ٹھاکر صاحب نے بھی کچھ گانے کا شوق پیدا کرلیاتھا۔ کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ کر رام پریا کے پاس جابیٹھتے۔ رات کو اکثر کھانا بھی وہیں کھالیتے۔ رام پریا ان کے لیے خود تھال پروس کر لاتی تھی۔ ٹھاکر صاحب کی جو اتنی خاطر ہونے لگی تو مزاج آسمان پر چڑھ گیا۔ نوکروں

پر رعب جمانے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راجہ وہی ہیں۔ دن دن یہ یقین ہوتا جاتا تھا کہ رام پریا میرے تیر نگاہ کا شکار ہوگئی ہے۔

ایک دن آپ نے رام پریا کی محبت کا امتحان لینے کی ٹھانی۔ کمرے میں لحاف اوڑھ کر پڑ رہے۔ رام پریا نے کسی کام کے لیے بلا بھیجا تو کہلادیا۔ مجھے رات سے زوروں کا بخار ہے۔ رام پریا یہ سنتے ہی دیوان خانہ میں آپہنچی اور ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ پیشانی سرد تھی۔ سمجھی کچھ سر بھاری ہوگیا ہوگا۔ کچھ پروا نہ کی۔ اندر جاکر ایک تیل سر میں لگانے کو بھجوادیا۔

ٹھاکر صاحب کو اس امتحان سے اطمینان نہ ہوا۔ اسے محبت ہے یہ تو واضح تھا۔ ورنہ وہ دیکھنے دوڑے آئی ہی کیوں۔ لیکن محبت کی گہرائی کا کچھ انداز نہ ہوا۔ کہیں وہ محض ظاہر داری نہ کررہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر، آنکھیں میں باتوں میں تو انھیں محبت کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن اس کا وہ کوئی صریح ثبوت چاہتے تھے۔ اب کے انھوں نے کوئی سخت امتحان لینے کا ارادہ کیا۔

کنوار کا مہینہ تھا۔ ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ آپ ایک دن سارے دن پیدل کھیتوں میں گھومتے رہے۔ اور کئی بار تالاب کا پانی بھی پیا۔ بخار کا پورا سامان کرکے گھر لوٹے۔ نتیجہ ان کے خاطر خواہ ہی ہوا۔ دوسرے دن صبح کو انھیں بخار چڑھ آیا۔ اور ایسے زور سے آیا کہ دوپہر تک سرسام کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اب تو بے چاروں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ محبت کے امتحان میں ان کے صبر کا امتحان ہونے لگا۔ اور اس میں وہ کچے نکلے۔ اتنا چیخے چلائے کہ نوکروں کا ناکوں دم ہوگیا۔ رام پریا نے آکر دیکھا تو حالت خراب تھی۔ بیچاری گھبرا اُٹھی۔ فوراً ڈاکٹر بلانے کے لیے ایک آدمی کو شہر دوڑایا۔ اور آپ ٹھاکر صاحب کے سرہانے بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگی۔ ٹھاکر صاحب کو ہوش ہوتا اور رام پریا کی بے چینی دیکھتے تو پھولے نہ سماتے۔ لیکن وہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

ایک ہفتہ تک گروسیوک کا بخار نہ اترا۔ رام پریا کو دانہ پانی حرام ہوگیا۔ دن کے دن اور رات کی رات ان کی تیمارداری میں حاضر رہتی کسی نوکر پر اسے اعتبار نہ تھا۔

اب لوگوں کو فکر پیدا ہوئی۔ مریض کو یہاں سے اٹھاکر لے جانے میں اندیشہ تھا۔ سارا خاندان یہیں آپہنچا۔ اور راجہ صاحب بھی دن میں ایک دو بار منورما کے ساتھ مریض کی عیادت کرنے آجاتے۔ لیکن اس طرح بھاگتے۔ گویا کسی دشمن کے گھر آئے ہیں۔ رام پریا تو مریض کی تیمارداری میں مصروف رہتی۔ اسے اس کی پروا نہ تھی کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے۔ لیکن روہنی کو راجہ صاحب کی یہ سرد مہری بہت شاق گزری۔ وہ ان پر دل کاغبار نکالنے کے لیے موقعہ کی تلاش کرتی رہتی تھی۔ آخرایک دن وہ منورما ہی پر پل پڑی۔ بات کچھ نہ تھی۔ منورما نے تجاہل سے کہا تھا۔ یہاں آپ لوگوں کی زندگی بڑے سکون سے کٹتی ہوگی۔ شہر میں تو روز ایک نہ ایک خلجان ہوتا رہتا ہے۔ ناکوں دم رہتاہے۔

روہنی اُٹھ کر بولی۔ ہاں بہن۔ کیوں نہ ہو۔ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔ جنھیں ہمسایہ کے گھر فاقہ دیکھ کر بھی جلن ہوتی ہے۔ کسی کو بھوک، کسی کو جوگ، یہ پرانا دستور چلاآتا ہے۔ تم کیاکروگی؟

منورما نے پھر اسی بھولے پن سے کہا۔ اگر تمھیں وہاں کی زندگی بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے تو چلی کیوں نہیں آتیں۔ تمھیں کسی نے منع کیا ہے؟

روہنی ناک سکوڑ کر بولی۔ بھلا مجھ میں وہ ہنر کہاں ہے کہ ادھر راجہ کو مٹھی میں لیے رہوں۔ ادھر حکام کی نازبرداری بھی کروں۔ یہ ہنر تو پڑھی لکھی شہر والیوں کو آتا ہے۔ ہم گنوار ہیں۔ یہ تریا چرتر کیا جانیں۔ یہاں تو ایک ہی کی ہوکر رہنا جانتی ہوں۔

منورما کو سکتہ سا ہوگیا۔ ایسامعلوم ہواکہ ایک شعلہ پیروں سے اٹھا اور سر سے نکل گیا۔ گویا کسی نے ہزاروں بھالے کلیجے میں چبھودیے۔ سارے اعضاء مفلوج سے ہوگئے۔ اس کی خبر ہی نہ رہی کہ کہاں آئی ہوں۔ کیا کررہی ہوں۔رات ہے یا دن۔ وہ دس بارہ منٹ تک اسی طرح نقش دیوار بنی کھڑی رہی۔ راجہ صاحب موٹر پر بیٹھے اسے بار باربلوا بھیجتے تھے اور اُسے خبر نہ ہوتی تھی۔ آخر راجہ صاحب اندر آئے۔ دیکھا۔ منورما بے حس وحرکت کھڑی ہے۔ دور ہی سے پکارا نورا کیا کررہی ہو۔ چلو دیر ہورہی ہے۔ سات بجے لیڈی کاپ نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ساڑھے چھ یہیں بج

گئے۔ منورما نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ تب انھوں نے قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس کا چہرہ دیکھ کر چونک پڑے۔ وہ مارگزیدوں کی طرح ٹکٹکی باندھے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا آنکھوں کے راستے جان نکل گئی ہو۔

راجہ صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ نورا کیسی طبیعت ہے؟

اب منورما کو ہوش آیا۔ اس نے راجہ صاحب کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اور اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ گویا جان ہی دے دے گی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھوں نے منورما کو روتے دیکھا۔ عالم اضطراب میں بولے۔ بات کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے۔ اس گھر میں کسی کی اتنی مجال ہے کہ تمھارے سامنے منہ کھول سکے۔ خون پی جاؤں۔ تم نے کچھ کہا۔؟ روہنی! صاف صاف بتادو!

روہنی پہلے تو منورما کی حالت دیکھ کر سہم اُٹھی تھی۔ پر راجہ صاحب کے منہ سے خون پی جانے کی دھمکی سن کر وہ برانگیختہ ہوگئی۔ جی میں تو آیا۔ کہہ دوں، ہاں میں نے کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے حق ہی کہا ہے۔ جو کچھ کرنا ہو کرلو۔ خون پی کر یوں کھڑے نہ رہوگے۔ لیکن راجہ صاحب کی غضب ناک صورت دیکھ کر سہم گئی۔ بولی۔ انھیں سے کیوں نہیں پوچھتے۔ میری بات کا اعتبار ہی کیا؟

راجہ۔ نہیں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔

روہنی۔ ان سے پوچھتے کیا ڈر لگتا ہے؟

منورما نے سسکتے ہوئے کہا۔ اب میں یہیں رہوں گی۔ آپ جاکر میری سب چیزیں یہیں بھجوا دیجیے۔

راجہ۔ آخر بات کیا ہے؟ کچھ معلوم بھی ہو۔

منورما۔ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اب یہیں رہوں گی۔ آپ جائیں۔

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ روہنی نے ضرور کوئی زہر اگلا ہے۔ اس کی طرف لال لال آنکھیں کرکے بولے۔ تمھارے کارن یہاں سے جان لے کر بھاگا۔ پھر بھی تمھیں تسکین نہیں۔ میری خوشی ہے۔ جس سے چاہتا ہوں بولتا ہوں۔ تمھیں اس کی جلن کیوں ہوئی ہے۔

روہنی۔ جلن ہوگی۔ میری بلا کو۔ تم یہاں تھے ہی تو کیا کردیا تھا۔ یہاں تو جیسے کتنا گھر رہے۔ ویسے رہے بدیس۔ تقدیر میں رونا لکھا ہے روتی ہوں۔

راجہ۔ ابھی تو نہیں روئیں۔ مگر شوق ہے تو روؤگی۔

روہنی۔ جنھیں رونے کا شوق ہے وہ روئیں۔ یہاں آنکھیں پھوڑنے کا شوق نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے دانت پیس کر کہا۔ شرم وحیا چھو نہیں گئی۔ کنجڑنوں کو بھی مات کردیا۔

روہنی۔ شرم وحیا والی تو ایک وہ ہیں۔ جنھیں چھاتی سے لگائے کھڑے ہو۔ ہم گنوارن میں شرم اور حیا کیا جانیں؟

راجہ صاحب نے زمین پر پیر ٹیک کر کہا۔ اس کا نام مت لو۔ اتنا بتلائے دیتا ہوں۔ اُسے کوسا تو اچھا نہ ہوگا۔

روہنی۔ تم تو ایسی ڈانٹ بتارہے ہو۔ گویا میں کوئی لونڈی ہوں۔ کیوں نہ ان کا نام لوں۔ وہ سیتا اور ساوتری ہوں گی۔ تو تمھارے لیے ہوں گی۔ یہاں کیوں پردہ ڈالنے لگی۔ جو بات دیکھوں گی۔ سنوں گی وہ کہوں گی بھی۔ کسی کو اچھا لگے یا برا۔

راجہ صاحب کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ لیکن منورما کے سامنے وہ اپنی حیوانی صورت دکھاتے ڈرتے تھے۔ مگر اب ان سے ضبط نہ ہوسکا۔ بولے تم جیسی عورتوں کو زہر کھاکر مرجانا چاہیے۔ زندگی تلخ کردی۔

روہنی نے شعلہ بار آنکھوں سے راجہ صاحب کو دیکھا اور پاندان کو ٹھکراتی لوٹے کاپانی گراتی وہاں سے چلی گئی۔

منورما نے تحمل کے ساتھ کہا۔ آپ ناحق ان کے منہ لگے۔ میں آپ کے ساتھ نہ جاؤں گی۔

راجہ۔ نورا کبھی کبھی مجھے تمھارے اوپر بھی غصہ آتا ہے۔ ان گنوارنوں کے ساتھ تمھیں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔

راجہ صاحب بہت دیر تک سمجھایا کیے۔ لیکن منورما نے ایک نہ مانی۔ روہنی کی باتیں ابھی تک اس کے دل کے ایک ایک ذرے میں سلگ رہی تھیں۔ اسے اندیشہ

ہورہا تھا کہ مجھ سے یہ بدگمانی روہنی ہی کو نہیں ہے۔ یہاں سبھی کے دلوں میں میری طرف سے یہی سلوک ہوں گے۔ روہنی محض اس سوئے ظن کو ظاہر کردینے کی خطا وار ہے۔ اس بدگمانی کا ازالہ یہاں سب کے ساتھ رہنے ہی سے ہوسکتا تھا۔ اوریہی اس کی ضد کا سبب تھا۔ آخر راجہ صاحب نے مایوس ہوکر کہا۔ تو پھر میں بھی کاشی چھوڑ ے دیتا ہوں تم جانتی ہو کہ اکیلے وہاں ایک دن مجھ سے نہ رہا جائے گا۔

منورما نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ جیسے آپ کی مرضی۔

یکایک منشی بجردھر لاٹھی ٹیکتے آتے دکھائی دیے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ پاجامے کا ازار بند نیچے لٹکتا ہوا۔ آنگن میں کھڑے ہوکر بولے۔ رانی منورما آپ کہاں ہیں۔ ذرا یہاں آیئے گا یا حکم ہو تو میں ہی آؤں۔

راجہ صاحب نے چڑھ کر کہا۔ کیا ہے۔ آپ کو اس وقت یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ سب لوگ یہیں چلے آئے۔ کوئی وہاں بھی توچاہیے۔

منشی جی کمرے میں آکر، بیکسانہ انداز سے بولے۔ کیا کروں حضور گھر تباہ ہوا جارہا ہے۔ حضور سے نہ روؤں۔ تو کس سے روؤں۔ للو نہ جانے کیا کرنے پر آمادہ ہے۔

منورما نے خائف ہوکر کہا۔ کیا بات ہے۔ منشی جی۔ ابھی تو آج بابو جی وہاں میرے پاس آئے تھے۔ کوئی نئی بات نہیں کہی۔

منشی۔ وہ اپنی بات کسی سے کہتا ہے کہ آپ ہی سے کہے گا۔ مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن آج الہ آباد جانے کو تیار بیٹھا ہوا ہے۔ بہو کو بھی لیے جاتا ہے۔ کہتا ہے۔ اب یہاں نہ رہوں گا۔

منورما۔ آپ نے پوچھا نہیں۔ کیوں جارہے ہو۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہوگی۔ نہیں تو بہو کو لے کر نہ جاتے۔ بہو نے تو ان کے کان نہیں بھردیے۔

منشی۔ نہیں حضور۔ وہ تو ساکشات لکشمی ہے۔ ایک مہینے سے زیادہ ہوگئے۔ پر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اپنی ساس کا بدن دبائے بغیر سوئی ہو۔ یہ سب للو کی شرارت ہے اتنی خود پروری نہ جانے اس میں کہاں سے آگئی۔ مجھے تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ آگرے میں جاکر شادی کی۔ کتنا سمجھاتا۔ نہ مانا۔ میں نے درگذر کیا۔ سوچا جب

لڑکے سے اس کی شادی ہوگئی تو اب اس کا دل کیوں دکھاؤں۔ لیکن للو کا منہ پھر بھی سیدھا نہیں ہوتا۔ اب نہ جانے کیا کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

منورما۔ گھر میں کسی نے طعنہ تو نہیں دیا؟

منشی۔ علم کی قسم کھاکر کہتا ہوں حضور! جو کسی نے چوں تک کی ہو۔ طعنے تو اسے دیے جاتے ہیں جو اپنی حیثیت سے بڑھے۔ وہ تو سیوا اور پریم کی دیوی ہے۔ہاں ! اتنا ضرور ہے کہ دونوں آدمی اس کاچھوا نہیں کھاتے۔

منورما۔ اچھا یہ بات ہے۔ بھلا بابو جی یہ کب برداشت کرنے لگے۔ میں اہلیا کی جگہ ہوتی۔ تو اس گھر میں ایک لمحے بھر بھی نہ رہتی۔ وہ نہ جانے کیسے اتنے دنوں رہ گئی۔

منشی۔ اس نے تو کبھی زبان تک نہیں کھولا حضور! اس لیے تو میں نے اس کے آتے ہی آتے ایک مہراجن رکھ لی۔ جس میں چھوت چھات کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ پر اتفاق کی بات ہے۔ کل وہ چوکے میں چلی گئی۔ چوکا چھوت ہوگیا۔ للو نے کھانا کھایا اور ہم دونوں آدمیو ں کے لیے بازار سے پوریاں آئیں۔ اتنی بات پر للو جامے سے باہر ہوگیا ہے۔

منورما نے افسردہ دلی سے کہا۔ تو میں کیا کرسکتی ہوں۔

منشی۔ آپ جو کچھ کرسکتی ہیں۔دوسرا نہیں کرسکتا۔ ذرا چل کر اُسے سمجھادیجیے۔ مجھ پر اتنا رحم کیجیے۔ ہمیشہ سے جو باتیں مانتے آتے ہیں۔ وہ اب نہیں چھوڑی جاتیں۔

منورما۔ تو نہ چھوڑیے۔ آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا۔ آپ کو اپنے رسوم پیاری ہیں اور ہونی چاہیے۔ تو انھیں بھی اپنی عزت پیاری ہے اور ہونی چاہیے۔ میں جیسے آپ کو مجبور نہیں کرسکتی۔ اسی طرح انھیں بھی مجبور نہیں کرسکتی۔ آپ جانیں اور وہ جانیں مجھے بیچ میں نہ ڈالیے۔

منشی۔ رانی صاحب ! اتنا مایوس نہ کیجیے۔ للو اگر چلا گیا تو ہم دونوں روتے روتے مر جائیں گے۔

منورما۔ تو اس کی کیافکر۔ ایک دن تو سبھی کو مرنا ہے۔ یہاں بیٹھا کون رہے گا؟

منشی۔ آپ تو جلے پر نمک چھڑک رہی ہیں۔ ہم نے بہو کی دلجوئی میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ صرف اس کا چھوا نہ کھایا۔ تو اس میں روٹھنے کی کیا بات ہے۔ ہم کتنی ہی باتوں میں دب گئے۔ تو کیا انھیں ایک بات میں بھی نہ دبنا چاہیے۔

منورما۔ تو جاکر دبائیے نا۔ میرے پاس کیا دوڑے آتے ہیں۔ میری رائے اگر پوچھتے ہو تو جاکر چپکے سے بہو کے ہاتھ سے کھانا پکوا کر کھائیے۔ دل سے یہ خیال نکال ڈالیے کہ وہ نیچی ہے اور آپ اونچے ہیں۔ اپنی تقدیر کو سراہیئے کہ ایسی بہو پائی۔ اور اگر چھوت چھات کا ڈھونگ کرنا ہے۔ تو جاکر کیجیے۔ میں اس معاملے میں بابوجی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی۔ وہ وہی کررہے ہیں۔ جو انھیں کرنا چاہیے۔

منشی جی بڑی امیدیں باندھ کر دوڑے آئے تھے۔ یہ فیصلہ سنا تو کمر ٹوٹ گئی۔ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے۔ اب کیا کروں۔ راجہ صاحب ابھی تک چپ چاپ ان دونوں آدمیوں کی باتیں سن رہے تھے۔ اب انھیں اپنی داستانِ مصیبت کہنے کا موقع ملا۔ بولے۔ آپ کی بات تو طے ہوگئی۔ اب ذرا میری بھی سنیئے۔ یہاں نورا اور روہنی میں کسی بات پر جھڑپ ہوگئی۔ اس نے انھیں نہ جانے کیا کہہ دیا کہ اب کہہ رہی ہیں۔ میں کاشی جاؤں گی ہی نہیں۔ کتنا سمجھا رہا ہوں مانتی ہی نہیں۔

منشی۔ انھیں بھی تو للو ہی نے تعلیم دی ہے۔ نہ وہ کسی کی مانتا ہے۔ نہ یہ کسی کی مانتی ہیں۔

منورما نے مسکراکر کہا۔ آپ کو ایک دیوی کی توہین کرنے کی سزا مل رہی ہے۔

راجہ صاحب نے پوچھا اور مجھے؟

منورما نے منہ بھر کر کہا۔ آپ کو بہت سی شادیاں کرنے کی۔

منورما یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ راجہ صاحب منشی کو لیے ہوئے باہر آئے سامنے والے باغ میں ایک بنچ پر جا بیٹھے اور بولے۔ منشی جی ! آپ نے نورا کی باتیں سنیں۔ کتنی میٹھی چٹکیاں لیتی ہے۔ اس وقت اس نے کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ میں نے سمجھا تھا۔ اب زندگی آرام سے گزرے گی۔ ان چڑیلوں سے گلا چھوٹ جائے گا۔ مگر نورا نے مجھے پھر اسی بھنور میں ڈال دیا۔ یہاں رہ کر میں بہت دنوں زندہ نہیں رہ

سکتا۔ روہنی مجھے زندہ نہ چھوڑے گی۔ شاید اس کا بس ہوتا تو مجھے کھا جاتی۔ کوئی ایسی ترکیب نہیں آتی کہ نورا کی تالیف قلب کردوں۔

منشی۔ حضور! وہ خود بہت دنوں تک یہاں رہیں گی۔ ان کا جی یہاں سے بہت جلد اکتا جائے گا۔

راجہ۔ ایشور کرے آپ کی پیشین گوئی سچی ہو۔ آپ کو دیر ہورہی ہو تو جایئے۔ میری ڈاک وہاں سے برابر بھجواتے رہئے گا!

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ پر منورما کی آنکھیں میں نیند نہ تھی۔ اُس شاہی محل میں جو عیش اور تکلف کی چیزوں سے پُر تھا۔ اُسے اپنی زندگی ویران اور خشک نظر آرہی تھی۔ وہ ایک سنسان۔ ہیبت ناک جنگل میں اکیلی کھڑی تھی۔ سامنے بہت دور پر ایک چراغ جل رہا تھا۔ پر جیوں جیوں وہ چراغ کی طرف بڑھتی تھی۔ چراغ دور تر ہوتا جاتا تھا۔ اس نے منشی جی سے تو چکردھر کو سمجھانے سے انکار کردیا۔ پر جیوں جیوں رات بھگتی تھی۔ اس کا دل انھیں روکنے کے لیے بے قرار ہورہا تھا۔ وہ کیسے جائیں گے میں ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لاؤں گی۔ اگر اپنے گھر میں نہیں رہ سکتے۔ تو میرے یہاں رہنے میں انھیں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ مگر نہایت سنگ دل آدمی ہیں۔ آج میرے پاس اتنی دیر بیٹھے اپنی سمتی کارونا روتا رہے۔ چھوٹے منہ سے بھی نہ کہا کہ میں پریاگ جارہا ہوں۔

یہ سوچتے ہی اُسے خیال آیا کہ چکردھر بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ بیوی ساتھ خالی جگہ، نئی جگہ، نہ کسی سے راہ نہ رسم، شرمیلے آدمی۔ انھیں پریاگ میں کتنی تکلیف ہوگی۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ مجھے منشی جی کے ساتھ چلی جانا چاہیے تھا۔ شاید بابو جی میرا انتظار کررہے ہوں۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج گیا تھا۔ چیت کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ چارپائی سے اُٹھ کر آنگن میں آئی۔ کیوں نہ اسی وقت چلوں گھنٹے بھر میں پہنچ جاؤں گی۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے ڈر کس بات کا۔ راجہ صاحب سورہے ہیں۔ انھیں جگانا فضول ہے سویرے تک میں لوٹ ہی آؤں گی۔

لیکن پھر خیال آیا۔ اس وقت جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟ اتنی رات گئے

سب کو جگانا کتنا بے موقع ہوگا۔ وہ پھر آکر لیٹ رہی اور سوجانے کی کوشش کرنے لگی۔ پانچ گھنٹے اسی انتظار میں جاگتے رہنا غیر ممکن تھا۔ پچھلے پہر اُسے نیند آگئی۔ اس وقت شاید فکر بھی تھک کر سوجاتی ہے۔ لیکن دیر سے سونے پر بھی منورما کو اٹھنے میں دیر نہ لگی۔ ابھی سب لوگ سوتے ہی تھے کہ وہ اٹھ بیٹھی اور اپنا ہینڈ بیگ لے کر روانہ ہوگئی۔

چکردھر بھی علی الصبح اٹھے اور چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انھیں ماں باپ کو چھوڑ کرجانا بہت شاق گزر رہا تھا، پر اس گھر میں اہلیا کی جو حالت تھی، وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اہلیا نے کبھی شکایت نہ کی تھی۔ وہ چکردھر کے ساتھ سب کچھ جھیلنے کو تیار تھی۔ لیکن چکردھر یہ کسی طرح گوارانہ تھا کہ اہلیا ان کے گھر میں پرائی بن کر رہے۔ والدین سے بھی کچھ کہنا سننا انھیں بیکار معلوم ہوتا تھا۔ مگر ان کے یہاں سے جانے کا صرف یہی ایک سبب نہ تھا۔ ایک سبب اور بھی تھا۔ جسے وہ پوشیدہ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ جس کی اہلیا کو کچھ خبر نہ تھی۔ آج کل منورما دن میں ایک بار ان کے پاس ضرور آجاتی۔ اگر خود نہ آسکتی۔ تو انھیں بلا بھیجتی تھی۔ اس کے روبرو آکر چکردھر کو اپنا ضبط، اپنی تمیز اور سکون قلب بالوں کی منڈکی طرح کھسکتے معلوم ہوتے۔ راہ فرار اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت نظر آتی تھی۔ وہ اپنی کتابیں وغیرہ نکال ہی رہے تھے کہ منورما کی موٹر آتی دکھائی دی۔ چکردھر مارے شرم کے گڑ گئے۔ وہ اس کے آنے کے پہلے ہی روانہ ہوجانا چاہتے تھے۔

منورما نے موٹر سے اُترتے ہی کہا۔ بابوجی! ابھی ذرا ٹھہر جایئے۔ اتنی عجلت کیا ہے آپ تو ایسے بھاگے جارہے ہیں۔ گویا روٹھے جارہے ہیں۔ بات کیا ہے۔ معلوم بھی تو ہو۔

چکردھر نے کتابوں کا بقچہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ بات کچھ نہیں ہے۔ یوں ہی ذرا الٰہ آباد رہنے کاارادہ ہے۔زندگی بھر والدین کا دست نگر رہنا تو مناسب نہیں۔

منورما۔ وہاں کیا کرنے کا قصد ہے؟

چکردھر۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

منورما۔ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہوجائے گا۔ کیوں اور کس ارادے سے جارہے ہیں۔

میں آپ کو نہ جانے دوں گی۔

چکردھر۔ میں دس پانچ دن کے بعد آکر آپ سے سارا واقعہ بیان کروں گا۔ اس وقت گاڑی چھوٹ جائے گی۔ میرے احباب مجھے اسٹیشن پر لینے آئیں گے۔

منورما۔ میں نے کہہ دیا۔ آپ اس گاڑی سے نہیں جاسکتے۔

چکردھر۔ اگر آپ کو ساری کیفیت معلوم ہوتی۔ تو آپ کبھی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرتیں۔ آدمی مجبور ہوکر اپنا گھر چھوڑتا ہے۔ میرے لیے اب یہاں رہنا غیر ممکن ہوگیا ہے۔

منورما۔ تو کیا یہاں کوئی دوسرا مکان نہیں مل سکتا ہے؟

چکردھر۔ مگر ایک ہی جگہ والدین سے الگ رہنا کتنا بھدا معلوم ہوتا ہے۔

منورما۔ آپ سمجھتے ہوں گے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مگر مجھے آپ کے گھر کی حالت تھوڑی بہت معلوم ہے کیوں نہ اہلیا کو کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ رہنے دیجیے۔ میں نے اب جگدیش پور میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ بھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ میری بہت دنوں سے آرزو ہے کہ کچھ دن آپ میرے مہمان ہوں۔ مہمان کیوں ہوں۔ وہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج میری اتنی بات مان لیجیے۔ میں ذرا گھر میں جاتی ہوں۔ یہ بستر وغیرہ کھول کر رکھ دیجیے۔ یہ سب سامان دیکھ کر میرا دل نہ جانے کیسا ہوا جاتا ہے۔

چکردھر۔ نہیں منورما! مجھے جانے دو!

منورما۔ آپ نہ مانیں گے؟

چکردھر۔ یہ بات نہ مانوں گا۔

منورما۔ مجھے روتے دیکھ کر بھی؟

منورما کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ چکردھر کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ بولے۔ منورما! مجھے جانے دو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد لوٹ آؤں گا۔

منورما اچھی بات ہے جائیے۔ لیکن میری یہ نذر قبول کیجیے۔

اس نے اپنا بیگ چکردھر کی طرف بڑھادیا۔ چکردھر نے پوچھا۔ اس میں کیا ہے؟

"کچھ بھی نہیں"۔

"اگر نہ لوں تو؟"

تو میں اپنے ہاتھوں سے آپ کا بورا یا بندھنا اٹھا کر گھر میں رکھ آؤں گی۔

چکردھر نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔ میں اسے لے لیتا ہوں۔ شاید وہاں بھی مجھے کام کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس بیگ کا وزن ہی بتلا رہا ہے۔

تانگا آگیا۔ چکردھر اور اہلیا اس پر جابیٹھے۔ گھر کی باقی تینوں آدمی دروازے پر کھڑے روتے رہ گئے۔

(30)

قومی خدمت کے لیے کہیں بھی موقعہ کی کمی ہیں۔ صرف دل میں ایثار کا جذبہ ہونا چاہیے۔ چکردھر الٰہ آباد میں اچھی طرح جمنے بھی نہ پائے تھے کہ چاروں طرف سے ان کے لیے کھینچ تان ہونے لگی۔ ان میں قوم کی محبت تھی۔ خدمت کا جوش تھا اور تنظیم کی قابلیت تھی۔ سارے شہر میں ایک بھی ایسا آدمی نہ تھا۔ جو ان کی طرح بے غرض ہو اور لوگ قومی خدمت کو ایک ضمنی کام سمجھتے تھے۔ کسب زر ان کی اصلی غرض تھی۔ چکردھر کے لیے اس کام کے سوا اور کوئی فکر نہ تھی۔ انھوں نے مضاف شہر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ اور بڑی کفایت سے گذر کرتے تھے۔ آگرے میں انھیں جتنے روپے ملے تھے۔ وہ سب منشی بجردھر کے نذر ہوگئے تھے۔ وہاں روپے کی ہمیشہ قلت رہتی تھی۔ کم ملنے پر کم قلت رہتی تھی۔ کیوں کہ ضرورتیں گھٹالی جاتی تھیں۔ چکردھر کو اب محسوس ہونے لگا تھا کہ خانہ داری میں پکڑ کر کچھ نہ کچھ مستقل آمدنی کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے تو انھیں کوئی فکر نہ تھی۔ لیکن اہلیا کو وہ افلاس کی آزمائش میں ڈالنا نہ چاہتے تھے وہ اب اکثر متفکر دکھائی دیتی تھی۔ یوں تو وہ کبھی شکایت نہ کرتی۔ پر اس کے بشرے سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ اپنی حالت پر قانع نہیں ہے۔ وہ تکلفات کے دلدادہ نہ تھی نہ سیر تماشے کا ہی اسے چسکا تھا۔ مگر ضروریات کی تکلیف اس سے نہ برداشت ہوتی تھی۔ جہاں تک اس کی ذات کا

تعلق تھا۔ جب اور لوگ پہلے اپنے گھر میں چراغ جلاکر مسجد میں چراغ جلاتے ہیں۔ تو وہی کیوں اپنے گھر کو اندھیرا چھوڑ کر مسجد میں چراغ جلائیں اور ان کو اگر بنگلہ اور موٹر چاہیے۔ تو کیا ان کے لیے صاف ستھرا مکان بھی نہ ہو۔ سواری کے لیے پیر گاڑی بھی نہ ہو۔ دوسرے ثروت اور جائداد پیدا کرتے ہیں۔ تو کیا یہاں روٹیوں کے بھی لالے ہوں۔ اگر اس نفس کشی کے عوض چکردھر کو نیک نامی کا بڑا حصہ ملتا ہے تو شاید اہلیا کے آنسو پونچھ جاتے۔ لیکن جب اوروں کو وہ بغیر اتنی قربانیاں کیے چکردھر سے ثبوت زیادہ شہرت اور عزت پاتے دیکھتی تھی تو اُسے ضبط نہ ہوتا تھا۔ عوام امیروں کی جتنی عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ اتنی خاص خادموں کی نہیں۔ جوشِ خدمت کے ساتھ اسے دولت کی بھی ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ اہلیا کو چکردھر کی یہ بے نفسی اسی لیے بری معلوم ہوتی تھی۔ خدمت خود اپنا صلہ ہے۔ یہ اعلیٰ معیار اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

اگر چکردھر کو اپنی ہی خانہ داری کا بار سنبھالنا ہوتا تو شاید انھیں زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ کیوں کہ ان کے مضامین بہت مقبول ہوتے تھے۔ اور دو تین رسالوں میں لکھ کر وہ اپنی گزران کے لیے کافی پیدا کرلیتے تھے۔ مگر منشی بجردھر کے تقاضوں کے بارے میں ان کا ناک میں دم تھا۔ منورما جگدلیش پور میں جاکر گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ ریاست کے معاملات میں بالکل دخل نہ دیتی۔ شاید اسے دولت ہی سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس لیے اب منشی جی کی صرف تنخواہ ہی پر گذر کرنا پڑتا تھا۔ چکردھر کو بار بار تنگ کرتے انھیں مجبور ہوکر باپ کی امداد کرنی پڑتی تھی۔

اگن کا مہینہ تھا۔ خاصی سردی پڑرہی تھی۔ مگر ابھی تک چکردھر جاڑوں کے کپڑے نہ بنوا پائے تھے۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ کہیں سے روپے آجائیں۔ تو ایک کمبل لے لوں۔ آج بڑے انتظار کے بعد لکھنؤ کے ایک ماہوار رسالے کے دفتر سے ۲۵ روپئے کا منی آرڈر آیا تھا اور وہ اہلیا کے پاس بیٹھے ہوئے کپڑوں کا پروگرام بنارہے تھے۔

اہلیا نے کہا۔ مجھے ابھی کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے لیے کوئی اچھا سا کمبل پندرہ روپے میں لے لو۔ باقی روپوں میں اپنے لیے ایک ادنیٰ کرتہ بنوا لو اور نئے

جوتے لے لو۔

چکردھر۔ میرے لائق تین چار روپے میں اچھا کمبل آجائے گا۔ باقی روپوں میں تمھارے لیے ایک الوان لائے دیتا ہوں۔ سویرے سویرے اٹھ کر تمھیں کام کاج کرنا پڑتا ہے۔ کہیں سردی کھا جاؤ تو مشکل پڑے۔ اونی کرتے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تگڑا آدمی ہوں۔ سردی برداشت کرسکتا ہوں۔

اہلیا۔ خوب تگڑے ہو کیا کہنا ہے۔ ذرا آئینے میں جاکر صورت تو دیکھو۔ جب سے یہاں آئے ہو صورت ہی بدل گئی۔ میں جانتی کہ یہاں آکر تمھیں یہ حالت ہوگی تو گھر سے قدم نہ نکالتی۔ میں الوان سلوان نہ لوں گی۔ تم محض اپنے لیے ایک کمبل لاؤ۔ نہیں میں سچ کہتی ہوں۔ اگر مجھے دق کروگے تو میں آگرے چلی جاؤں گی۔

چکردھر۔ تمھاری یہی ضد مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں کئی سال سے اپنے کو اسی قسم کی زندگی کا عادی بنارہا ہوں۔ دُبلا ہوں تو کیا گرمی سردی خوب سہہ سکتا ہوں۔ تمھیں یہاں آئے نو دس مہینے ہوئے۔ بتاؤ میرے سر میں ایک دن بھی درد ہوا؟

ڈاکیے نے پکارا۔ خط لے جایئے۔

چکردھر نے جاکر خط لے لیا۔ اور اسے پڑھتے ہوئے اندر لے آئے اور مایوسانہ انداز سے بولے۔ میرے آتے ہی گھر والوں پر کچھ ایسی ساڑھ ساتی سوار ہوگئی ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک دن مصیبت گھیرے ہی رہتی ہے۔ ابھی منگلا بیمار تھی۔ اب اماں بیمار ہیں۔ بابو جی کو بھی کھانسی آرہی ہے۔ آج کل بالائی آمدنی کچھ نہیں ہوتی۔ لکھا ہے ۵۰ روپے بھیج دو۔

اہلیا نے پوچھا۔ اماں جی بہت بیمار ہیں؟

"ہاں لکھا تو ہے"۔

"تو جاکر انھیں دیکھ ہی کیوں نہ آؤ"۔

"تمھیں اکیلا چھوڑ کر"؟

"ڈر کیا ہے"؟

"چلو ......"

"اچھا تو مجھی کو پہنچا دو"۔

"ہم اور تم دونوں کیوں نہ چلیں"۔

اہلیا نے کہا۔ جی نہیں معاف کیجیے۔ آپ وہاں میری جان کھائیں گے اور بیچاری اماں کو رلائیں گی۔

چکردھر نے بے دردی کے ساتھ کہا۔ بہانہ ہے سراسر بہانہ۔ ناحق مجھے تنگ کرتے ہیں۔

اہلیا۔ بہانہ ہو یا سچ ہو۔ روپے تو بھیجنے ہی پڑیں گے۔ روپے بھیج دو۔ باقی کے لیے لکھ دو۔ کوئی فکر کر کے جلدی بھیج دوں گا۔ تمھاری تقدیر میں اسال جڑاور نہیں لکھا ہے۔

چکردھر۔ لکھے دیتا ہوں۔ میں خود تنگ ہوں۔ آپ کے پاس کہاں سے بھیجوں۔

اہلیا۔ اے ہٹو۔ بھلا وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

چکردھر کو دیر تک تو سکون کے عالم میں بیٹھے رہے۔ پھر معذرت آمیز لہجہ میں بولے۔ کسی سے قرض لینا پڑے گا اور کیا۔

اہلیا۔ نہیں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ قرض نہ لینا۔ اس سے تو انکار کر دینا ہی اچھا۔

چکردھر۔ ایک ایسے مہاجن سے لوں گا جو تقاضے نہ کرے گا۔

اہلیا۔ ایسا کون مہاجن ہے بھئی! یہیں رہتا ہے؟ کوئی دوست ہوگا؟ دوست سے تو قرض لینا ہی نہ چاہیے۔ اس سے تو مہاجن کہیں اچھا۔ کون ہے ذرا اس کا نام سنوں۔

چکردھر۔ ایک پرانا دوست ہے۔ جس نے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ تمھیں روپے کی جس وقت ضرورت سخت پڑے۔ مجھ سے لے لینا۔ پھر جب جی چاہے دے دینا۔

اہلیا۔ کون ہے۔ بتاؤ۔ تمھیں میری قسم!

چکردھر۔ تم نے قسم رکھا دی۔ اس نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا۔ وہ دوست رانی منورما ہیں۔ انھوں نے مجھے گھر سے چلتے وقت ایک چھوٹا سا بیگ دیا تھا۔ میں

نے اس وقت تو کھولا نہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر کھولا تو اس میں پانچ ہزار روپے
نکلے۔ سب روپے جیوں کے تیوں رکھے ہیں۔

اہلیا۔ کبھی اس میں سے نکالا تو نہیں؟

چکردھر۔ کبھی نہیں۔ یہ پہلا ہی موقعہ ہے۔

اہلیا۔ تو بھول کر بھی نہ نکالنا۔

چکردھر۔ دادا زندہ نہ چھوڑیں گے۔

اہلیا۔ ان سے صاف کہہ دو۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ رانی جی کی امانت کسی موقعہ سے لوٹانی ہوگی۔ امیروں کا احسان کبھی نہ لینا چاہیے کبھی کبھی اس کے عوض میں اپنے ضمیر کا خون کرنا پڑتا ہے۔ رانی منورما تو ہمیں بھول ہی گئیں۔ ایک خط بھی نہ لکھا۔

چکردھر۔ آج کل انھیں اپنے گھر کے جھگڑوں ہی سے نہ فرصت ملتی ہوگی۔

اہلیا۔ یہ روپے لالہ جی کے پاس بھیج دو۔ تب تک اور سردی کا مزا اٹھالو۔

اہلیا بڑی رات تک اسی فکر میں مبتلا رہی کہ جڑاور کا کیا انتظام ہو۔ چکردھر نے قومی خدمت کا اتنا بھاری بوجھ اپنے سر لے لیا تھا کہ ان سے زیادہ فارغ البال ہونے کی امید نہ کی جاسکتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے رات کا تھوڑا وقت نکال کر بیچارے کچھ لکھ پڑھ لیتے تھے۔ زیادہ دولت پیدا کرنے کے لیے انھیں مجبور کرنا ان پر ظلم کرنا تھا۔ سوچنے لگی۔ میں کچھ کام کرسکتی ہوں یا نہیں۔ سلائی اور بوٹے کا کام وہ خوب کرسکتی تھی۔ مگر چکردھر کو یہ کب منظور ہوسکتا تھا کہ وہ پیسے کے لیے دیدہ ریزی کرے۔ ایک دن اس نے ایک ماہوار رسالے میں اپنی ایک سہیلی کا مضمون دیکھا۔ دونوں آگرے میں ساتھ ساتھ پڑھتی تھیں۔ اہلیا ہمیشہ اس سے اچھے نمبر پاتی تھی۔ یہ مضمون پڑھ کر اہلیا کی وہی حالت ہوئی جو کسی اصیل گھوڑے کی چابک پڑنے پر ہوتی ہے۔ وہ قلم لے کر بیٹھ گئی اور اسی مضمون پر تنقید کرنے لگی۔ وہ اتنی تیزی سے لکھ رہی تھی گویا بھاگتے ہوئے خیالات کو سمیٹ رہی ہو۔ الفاظ اور جملے آپ ہی آپ نکلتے چلے جاتے تھے۔ اپنے ذہن میں ایسی آمد کا اسے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ آدھ گھنٹے میں اس نے چار پانچ صفحے لکھ ڈالے۔ جب اس نے اپنی تنقید پر نظر ثانی کی۔ تو اسے

معلوم ہوا کہ میرا مضمون سہیلی کے مضمون سے کہیں اچھا ہے۔ تاہم اُسے ایڈیٹر کے پاس بھیجتے ہوئے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں نامنظور نہ ہوجائے۔ اس نے دونوں مضامین کا دو تین بار موازنہ کیا اور آخر اسے تیسرے دن بھیج ہی دیا۔ تیسرے دن جواب آگیا۔ تنقید منظور کرلی گئی تھی اور جلد ہی معاوضہ بھیجنے کا وعدہ تھا۔ کئی دنوں کے بعد ایک رجسٹری لفافہ سے دس روپے کا ایک نوٹ آپہنچا۔ اہلیا پھولی نہ سمائی۔ اُسے اس خیال سے اطمینان بخش غرور ہوا کہ خانہ داری میں میں بھی کچھ مدد کرسکتی ہوں۔ اُسی دن اس نے ایک دوسرا مضمون لکھنا شروع کیا اور دو تین دن میں اسے ختم کرکے بھیج دیا۔

پوس کا مہینہ آگیا ہے زوروں کی سردی پڑنے لگی ہے۔ نہاتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کاٹ کھائے گا۔ پر ابھی تک چکردھر جڑاور نہ بنواسکے۔ ایک دن بادل آئے اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ چکردھر دس بجے رات کو ایک جلسے سے لوٹے تو مارے سردی کے کلیجہ کانپ اٹھا۔ چال تیز کی۔ مگر سردی کم نہ ہوئی تب دوڑنے لگے۔ گھر کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔ سوچا ابھی سے یہ حال ہے۔ تو رات کیسے کٹے گی۔ میں تو کسی طرح کاٹ لوں گا۔ اہلیا کا کیاحال ہوگا۔ اس بے چاری کو میرے باعث بہت تکلیف ہورہی ہے۔ میرے ساتھ شادی اس کے لیے سزا ہوگئی۔ کل سب سے پہلے کپڑوں کی فکر کروں گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا۔ اہلیا انگیٹھی میں کوئلہ بھرے بیٹھی تاپ رہی ہے۔ آج وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ رات کو عموماًوہ روٹی اور کوئی سبزی کھایا کرتے تھے۔ آج اہلیا نے پوریاں پکائی تھیں اور سالن بھی کئی قسم کے تھے۔ کھانا کھاکر لیٹے تو دیکھا چارپائی پر ایک بہت اچھا کمبل پڑا ہوا ہے۔ تعجب سے پوچھا۔ یہ کمبل کہاں تھا؟

اہلیا نے مسکرا کر کہا میرے پاس ہی رکھا تھا۔ پسند ہے نا؟

چکردھر۔ تمھارے پاس کمبل کہاں تھا۔ سچ بتاؤ۔ کہاں ملا۔ بیس روپے سے کم کا نہ ہوگا۔

"تم مانتے ہی نہیں تو کیا کروں؟"

"مول لیا ہوگا۔ سچ بتاؤ۔روپے کہاں تھے؟"

"تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے"؟

"جب تک یہ نہ معلوم ہوجائے کہ آم کہاں سے آئے۔ میں انھیں ہاتھ بھی نہ لگاؤں"۔

"میں نے کچھ روپے بچا رکھے تھے۔ آج کمبل منگوالیا؟"

میں نے تمھیں اتنے روپے کب دیے؟ کہ خرچ سے بچ جاتے"۔

"میں تھوڑا تھوڑا بچاتی گئی تھی"۔

"میں یہ ماننے کا نہیں۔ بتاؤ روپے کہاں سے ملے؟"

"بتاہی دوں۔ اب کے میں نے ادیب کو دو مضمون بھیجے تھے۔ اسی کے معاوضہ میں ۳۰ روپے ملے تھے"۔

اہلیا نے سمجھا تھا کہ چکردھر یہ خبر سنتے ہی خوشی سے اچھل پڑیں گے اور فرط مسرت سے مجھے گلے لگالیں گے۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ چکردھر نے دل گرفتہ ہوکر کہا۔ کہاں ہے ادیب؟ ذرا تمھارے مضامین دیکھوں!

اہلیا نے دونوں نمبر لاکر ان کو دے دیے اور شرما کر بولی۔ کچھ ہے نہیں۔ اوٹ پٹانگ جو کچھ جی میں آیا لکھ دیا۔

چکردھر نے سرسری نگاہ سے مضامین کو دیکھا۔ ایسی چست عبارت وہ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ خیالات بھی دقیق اور سلجھے ہوئے تھے۔ اگر اہلیا نے خود نہ بتایا ہوتا تو وہ مضامین پر اس کا نام دیکھ کر بھی سمجھتے کہ اس نام کی کوئی اور خاتون ہوگی۔ انھیں گمان بھی نہ تھا کہ اہلیا اس قدر بلند خیال ہے۔ مگر یہ جان کر بھی وہ خوش نہ ہوئے۔ ان کے جذبۂ خودداری کو ایک چوٹ سی لگی۔ ان کے دل میں گھر کے مالک ہونے کا جو غرور چھپا ہوا بیٹھا تھا وہ چور چور ہوگیا۔ وہ نادانستہ طور پر عقل میں، علم میں، تجربہ میں اپنے کو اہلیا میں فائق سمجھتے تھے۔ کسب معاش کا حق تھا۔ آج وہ حق ان کے ہاتھ سے چھن گیا۔ شرمندہ ہوکر بولے۔ تمھارے مضامین بہت اچھے ہیں اور پہلی بار ہی کوشش میں تمھیں معاوضہ بھی مل گیا۔ یہ اور بھی خوشی کی بات ہے۔ لیکن مجھے تو کمبل کی ضرورت نہ تھی۔ کم سے کم میں اتنا قیمتی کمبل نہ چاہتا تھا۔ اسے تمھیں اوڑھو۔ آخر تمھارے پاس بھی تو وہی ایک پرانی چادر ہے۔ میں اپنے لیے دوسرا کمبل لے لوں گا۔

اہلیا ان کے دل کی کیفیت سمجھ گئی۔ بولی۔ میں نے معاوضہ کے خیال سے تو مضامین نہ لکھے تھے۔ اگر تمھاری مرضی نہیں ہے تو اب نہ لکھوں گی۔

چکردھر۔ نہیں نہیں۔ میں تمھیں لکھنے سے منع نہیں کرتا۔ تم شوق سے لکھو۔ مگر میرے لیے تمھیں یہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے عیش کرنا ہو تو اس کوچہ میں قدم ہی کیوں رکھتا۔ میں سب کچھ سوچ سمجھ کر ادھر آیا ہوں۔ مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ خدا اور دنیائے دوں، دونوں ساتھ نہیں ملتے۔ مجھے خدا سے منہ موڑ کر دنیائے دوں کی عبادت کرنی پڑے گی۔

اہلیا نے دردناک لہجہ میں کہا۔ میں نے تم سے کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ تم جو کچھ ہو وہ نہ ہوکر اگر دولت مند ہوتے تو شاید میں اب تک کنواری ہی رہتی۔ دولت کی تمنا مجھے نہ تب تھی نہ اب ہے۔ میں نے صرف یہ خیال کیا کہ جب میں نے محنت کی ہے۔ تو اس کی مزدوری لے لینے میں کیاہرج ہے۔ یہ کمبل تو کوئی شال نہیں ہے۔ جسے اوڑھنے میں تمھیں شرم آئے۔ میرے لیے چادر کافی ہے۔ تمھیں جب روپے ملیں تو میرے لیے ایک لحاف بنوادینا۔

کمبل جیوں کا تیوں تہ کیا ہوا رات بھر پڑا رہا۔ سردی کے مارے چکردھر کو نیند نہ آئی تھی۔ کمبل میں ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس کا ایک ایک ریشہ ان کے جسم میں تیر کی طرح چبھتا تھا۔ ایک بار انھوں نے اہلیا کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ پاؤں سمیٹے چادر سر سے اوڑھے گٹھری بنی پڑی ہوئی تھی۔ پر ان کی ہمت نہ پڑی۔ وہ کمبل اس کو اوڑھا دیں۔ اہلیا کی دل شکنی کا خیال مانع ہوتا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ان کا ضمیر انھیں نفریں کرنے لگا۔ جب تم اس عورت کی ضروریات پوری نہیں کرسکتے۔ جو تمھارے اوپر اپنی جان تک نثار کرسکتی ہے۔ تو تم قوم کی خدمت کیا کروگے؟ ترک اور خط میں مشرقین کا تفاوت ہے۔ چکردھر بیتاب ہوکر چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگے کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جو اسے اوڑھا سکوں۔ لیکن پرانی دھوتیوں کے سوا کوئی چیز نہ نظر آئی۔ انھیں اس وقت دلدوز روحانی خلش ہورہی تھی جس غربت کا انھوں نے دامن پکڑاتھا۔ وہ اس وقت انھیں شرمناک معلوم ہوتی تھی۔

دفعتاً اہلیا نے آنکھیں کھول دیں اور بولی۔ تم کھڑے کیا کررہے ہو؟ میں ابھی

خواب دیکھ رہی تھی کہ ایک دیوندی کے گہرے پانی میں مجھے ڈبائے دیتا ہے۔ ابھی تک چھاتی دھڑک رہی ہے۔

چکردھر نے نادم ہو کر کہا۔ وہ دیو میں ہی ہوں اہلیا! میرے ہی ہاتھوں تمھیں یہ مصیبتیں سہنی پڑ رہی ہیں۔

اہلیا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر سلادیا اور وہی کمبل اوڑھاتی ہوئی بولی۔ تم میرے دیوتا ہو۔ جس نے مجھے منجدھار سے نکالا ہے۔ دیو میرا نفس ہے جو مجھے ڈبانے کے لیے آمادہ ہے۔

ایک مرغ نے بانگ دی۔ چکردھر نے دروازہ کھول کر دیکھا تو نورِ سحر کی دیوی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ اسی وقت اٹھ بیٹھے اور کچھ لکھنے لگے۔ صبح کو بھی وہ کہیں باہر نہ گئے۔ ناشتہ کرکے پھر لکھنے لگے۔ شام کو انھیں کارسبھا میں ایک تقریر کرنی تھی۔ پر وہ اس جلسہ میں بھی نہ گئے۔ اب ان کا یہی دستور ہوگیا کہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں صرف کرتے۔ اب وہ خدمت کے بندے نہیں۔ نفس کے بندے تھے۔ نصب العین کے ساتھ زندگی کے اصول بھی تبدیل ہوگئے۔ اب ان کی غائت حق کی تلاش اور علم کی اشاعت نہ رہی۔ وہ کسب زر کا وسیلہ بن گئی۔ اس مکان میں اب انھیں تکلیف ہونے لگی۔ دوسرا مکان لیا جس میں بجلی کے پنکھے اور روشنی تھی۔ ان نئی آسائشوں سے انھیں تصنیف میں اور بھی آسانی ہوگئی۔ مکان میں مچھروں کے مارے کوئی دماغی کام نہ کرسکتے تھے۔ گرمی میں تو اس ننھے سے آنگن میں بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ کام کرنے کا ذکر ہی کیا۔ اب وہ کھلے ہوئے چھت پر بجلی کے پنکھے کے سامنے شام ہی سے بیٹھ کر کام کرنے لگتے تھے۔ اہلیا خود تو کچھ نہ لکھتی۔ مگر چکردھر کی کچھ امداد کردیتی تھی۔ مضامین کا صاف کرنا۔ دوسری کتابوں اور اخباروں سے کارآمد مضامین کی نقل کرنا اس کا کام تھا۔ پہلے اس کی کھیتی کرتے تھے۔ جہاں دولت تھی نہ شہرت۔ وہ اوسراب گلزار بن گیا تھا۔ اب رسالوں کے ایڈیٹر ان سے تقاضے کرکے مضامین لکھواتے۔ لوگ ان مضامین کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ فلسفہ سے انھیں الفت تھی۔ ان کے مضامی بھی فلسفیانہ ہوتے تھے۔

لیکن چکردھر کو اپنی کامیابیوں پر غرور نہ ہوتا تھا۔ انہیں کافی دولت ملتی تھی۔

غربت کم نہ تھی۔ لیکن خدمت کے کاموں میں انھیں جو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا تھا۔ وہ اب میسر نہ تھا۔ اپنے بدنصیب خستہ حال بھائیوں کی خدمت کرنے میں جو افتخار آمیز مسرت ہوتی تھی وہ اب مہا ذلت جماعت کی دعوتوں میں نہ ہوتی تھی۔ مگر اہلیا خوش تھی۔ وہ اب بھولی بھالی نازنین نہ تھی۔ معاملہ فہم اور بیدار مغز عورت تھی۔ خانہ داری میں مشاق، فراخ دل، نیک مزاج اور اصولوں کی پابند۔ مجال نہ تھی کہ کوئی عورت اس کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ بھی کھا جائے۔ ایشور نے ایک گلعذار بچہ بھی دے دیا۔ زندگی پُر بہار ہوگئی۔

اس طرح پانچ سال گزر گئے۔

ایک دن کاشی سے راجہ بشال سنگھ کا تار آیا۔ رانی منورما بہت بیمار ہیں فوراً آیئے! بچنے کی کم امید ہے۔ چکردھر کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔ اہلیا سنبھال نہ لیتی تو شاید وہ خود گر پڑتے۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں سی اڑنے لگیں۔ ایک لمحہ کے بعد ذرا سنبھل کر بولے۔ میرا بستر باندھ دو۔ میں اسی گاڑی سے جاؤں گا۔

اہلیا۔ یہ ہوکیا گیا۔ ابھی تو دادا نے لکھا تھا کہ سب خیر وعافیت ہے۔

چکردھر۔ کیا بتلاؤں۔ کچھ نہیں۔ یہ سب گھر کی نااتفاقی کا نتیجہ ہے۔ منورما نے راجہ صاحب سے شادی کر کے سخت غلطی کی۔ سوتنوں نے اس کی زندگی وبال کردی ہوگی!

اہلیا۔ ہم لوگوں کے یہاں چلے آنے سے شاید ناراض ہوگئیں۔ کبھی ایک خط بھی نہ لکھا۔

چکردھر۔ ان کی تمنا تھی کہ ہم سب ان کے ساتھ رہیں۔

اہلیا۔ کہو۔ تو میں بھی چلو۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی شفقت اور نوازش کبھی نہ بھولے گی۔

چکردھر۔ جوگیندر بابو کو ساتھ لیتے چلیں۔ ان سے زیادہ حاذق تو یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔

اہلیا۔ ہاں اچھا تو ہوگا۔ بے لوث آدمی ہیں۔

چکردھر۔ مگر تم میرے ساتھ لوٹ نہ سکوگی یہ سمجھ لو! منورما تمھیں اتنی جلد نہ آنے

دیں گی۔

اہلیا۔ وہ اچھی تو ہو جائیں۔ لوٹنے کی بات پیچھے دیکھی جائے گی۔

دس بجتے بجتے یہ لوگ یہاں سے ڈاک پر چلے۔ اہلیا کھڑکی سے برسات کا دلفریب منظر دیکھ رہی تھی۔ چکردھر بے تاب ہو کر کھڑے دیکھتے تھے کہ پہنچنے میں کتنی دیر ہے۔ اور منو کھڑکی سے باہر کود پڑنے کے لیے زور مار رہا تھا۔

(31)

چکردھر جگدیش پور پہنچے تو رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ محل کے دروازے پر غریبوں کو خیرات تقسیم کی جارہی تھی۔ کنگلے ایک پر ایک ٹوٹے پڑتے تھے۔ سپاہی دھکے پر دھکے دیتے تھے۔ مگر کنگلوں کا ریلا کم نہ ہوتا تھا۔ منشی بجردھر بار بار چلارہے تھے۔ کیوں ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہو۔ سب کو ملے گا۔ کوئی خالی ہاتھ نہ جانے پائے گا۔ لیکن پھر بھی غربا کو صبر نہ ہوتا تھا۔

منشی جی نے چکردھر کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لگالیا۔ اور دونوں آدمی رونے لگے۔ اہلیا شوہر کے پیچھے کھڑی تھی۔ منو اس کی گود میں بیٹھا طفلانہ حسرت سے دونوں آدمیوں کا رونا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمجھا۔ ان دونوں میں ضرور مار پیٹ ہوئی ہے۔ شاید دونوں نے ایک دوسرے کا گلا پکڑ کر دبایا ہے۔ جبھی تو یوں رو رہے ہیں۔ بابو جی کا گلا دکھ رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے بھی رونا شروع کیا۔ منشی جی اسے روتے دیکھ کر بڑھے کہ اس کو گود میں لے کر پیار کروں۔ مگر منو نے منہ پھیرلیا۔ جس نے ابھی بابو جی کو مار کر رُلایا ہے وہ کیا اسے نہ مارے گا۔ کتنی خوفناک صورت ہے۔ ضرور مارے گا۔

دفعتاً راجہ صاحب اندر سے بدحواس دوڑے ہوئے آئے۔ صورت سے معلوم ہورہا تھا۔ امید نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ آتے ہی آتے پوچھا۔ میرا تار مل گیا تھا؟۔

چکردھر۔ آج صبح ملا۔ رانی جی کا کیا حال ہے؟

راجہ۔ وہ تو اپنی آنکھوں دیکھوگے۔ میں کیا کہوں۔ اب تو ایشور ہی کا بھروسہ ہے۔ اچھا یہ شنکھ مہاشے ہیں؟

یہ کہہ کر انھوں نے منو کو گود میں لے لیا۔ انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں کی بصارت تیز ہوگئی ہے۔ بولے۔ میری سکھدا بالکل ایسی ہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس کا چھوٹا بھائی ہو۔ ہو بہو یہی صورت تھی۔

چکردھر نے اندر جاکر منورما کو دیکھا۔ وہ موٹے گدوں میں ایسی سماگئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ بستر خالی ہے۔ صرف چادر پڑی ہوئی ہے۔ چکردھر کی آہٹ پاکر اس نے چادر سے منہ باہر نکالا۔ شمع کی ہلکی روشنی میں کسی بے کس کی آہ مظلوم آنکھوں سے آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔

راجہ صاحب نے آہستہ سے کہا۔ نورا! تمھارے بابو جی آگئے۔

منورما نے تکیے کا سہارا لے کر کہا۔ زہے نصیب! آیئے۔ بابو جی آپ کے درشن بھی ہوگئے۔ تار نہ جاتا تو آپ کیوں آتے۔

چکردھر۔ مجھے تو بالکل خبر ہی نہ تھی۔ تار پہنچا تو حال معلوم ہوا۔

منورما۔ خیر آپ آگئے۔ یہ آپ کی شفقت ہے۔ مجھے تو امید نہ تھی۔

راجہ۔ بار بار کہتی تھیں وہ نہ آئیں گے۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ آپ یہ خبر پاکر رُک نہیں سکتے۔ شہر کے سب بیدوں، حکیموں کو دیکھ چکا۔ اب ایشور ہی کا بھروسہ ہے۔

چکردھر۔ میں بھی ایک ڈاکٹر کو ساتھ لیتا آیا ہوں۔ بہت ہی ہوشیار آدمی ہیں۔

منورما۔ (بچے کو دیکھ کر) اچھا۔ اہلیا دیوی بھی آئی ہیں اور یہ ٹھاکر شنکھ دھر ہیں۔ ذرا یہاں تو لانا اہلیا! اسے چھاتی سے لگالوں۔

راجہ۔ اس کی صورت سکھدا سے بہت ملتی ہے۔ نورا! بالکل اس کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

سکھدا کا نام سن کر اہلیا پہلے بھی چونکی تھی۔ اب پھر چونکی۔ بچپن کے دن کسی بھولے ہوئے خواب کی طرح ادراک کے دائرے میں آگئے۔ اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے راجہ صاحب کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے حافظے پر ایسی ہی صورت کھینچی ہوئی نظر آئی۔

منو کو گود میں لیتے ہی منورما کے نیم جاں جسم میں ایک حرارت سی پیدا ہوگئی۔

بچے کو سینے سے لگائے ہوئے اسے ایسی مسرت ہو رہی تھی۔ گویا برسوں سے پیاسے حلق میں ٹھنڈا پانی پڑ گیا ہو۔ اور اس کی پیاس نہ بجھتی ہو۔ وہ بچے کو لیے ہوئے اٹھ بیٹھی اور بولی۔ اہلیا! میں اب یہ لال تمھیں نہ دوں گی۔ اسے مجھے دے دو!

راجہ صاحب نے منورما کو سنبھال کر کہا۔ لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ بدن میں ہوا لگ رہی ہے۔ کیا کرتی ہو؟

مگر منورما بچے کو لیے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور راجہ صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ کمرے میں صرف چکردھر اور اہلیا رہ گئے۔ تب اہلیا آہستہ سے بولی۔ مجھے اب یاد آرہا ہے کہ میرا نام بھی "سکھدا" تھا۔

چکردھر نے بے اعتنائی سے کہا۔ ہاں یہ کوئی نیا نام نہیں۔

اہلیا۔ میرے بابو جی کی صورت راجہ صاحب سے بہت ملتی تھی۔

چکردھر نے پھر بے اعتنائی سے کہا۔ ہاں! کبھی کبھی آدمی کی صورت مل جاتی ہے۔

اہلیا۔ نہیں بالکل ایسے ہی تھے۔

چکردھر۔ ہو سکتا ہے۔ بیس سال کی صورت اچھی طرح ذہن میں تو نہیں رہتی۔

اہلیا۔ ذرا تم راجہ صاحب سے پوچھو کہ آپ کی سکھدا کب کھوئی تھی؟

چکردھر نے جھنجھلا کر کہا۔ چپ چاپ بیٹھو۔ تم اتنی خوش نصیب نہیں ہو۔ راجہ صاحب کی سکھدا کہیں کھوئی نہیں مر گئی ہوگی۔

راجہ صاحب اس وقت بچے کو گود میں لیے کمرے میں آئے۔ چکردھر کے آخری الفاظ ان کے کان میں پڑگئے۔ بے صبری کے ساتھ بولے۔ نہیں بابو جی میری سکھدا مری نہیں۔ کمبھ کے میلے میں کھوگئی تھی۔ اسے بیس سال ہوگئے۔ اس وقت اس کی عمر کوئی چار سال کی ہی ہوگی۔ بہت تلاش کی پر کچھ پتہ نہ چلا۔ اس کی ماں اسی غم میں مر گئی۔ میں بھی برسوں پاگل بنا رہا۔ آخر صبر کرکے بیٹھ رہا۔

اہلیا نے سامنے آکر بے حجابانہ انداز سے کہا۔ میں بھی تو تربینی کے اشنان میں کھوگئی تھی۔ آگرے کی سیوا سمتی والوں نے مجھے کہیں روتے پایا اور آگرے لے گئے۔

راجہ۔ تمھاری اس وقت کیا عمر ہوگی؟

اہلیا۔ چوبیسواں لگا ہے۔

راجہ۔ تمھیں اپنے گھر کی کچھ یاد ہے۔ تمھارے دروازے پر کس چیز کا درخت تھا؟

اہلیا۔ شاید برگد کا درخت تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں اس کے گودے چن چن کر کھایا کرتی تھی۔

راجہ نے اور قریب آکر اس کے منہ کی طرف تاکتے ہوئے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ تمھیں اپنے اماں کی کچھ یاد آتی ہے؟

اہلیا نے سر ہلا کر کہا۔ ہاں یاد کیوں نہیں آتی۔ سانولا رنگ تھا، دبلی پتلی اور لمبی تھیں۔ دن بھر کچھ پڑھتی تھیں۔

راجہ صاحب کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ گھر میں اور کون کون لوگ تھے؟

اہلیا۔ میری ایک بڑھیا دادی تھیں۔ جو مجھے گود میں لے کر کہانی سنایا کرتی تھیں۔ ایک بوڑھا نوکر تھا۔ جس کے کندھے پر میں روز سوار ہوا کرتی تھی۔ دروازے پر ایک بڑا سا گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ دروازے پر ایک کنواں تھا پیچھے کی طرف ایک بڑھیا چمارن کا مکان تھا۔

راجہ صاحب نے فرط اشتیاق سے آغوش پھیلاتے ہوئے کہا۔ بس بس بیٹی! آ۔ تجھے سینے سے لگالوں۔ تو ہی میری سکھدا ہے۔ میں بچے کو دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا میری سکھدا مل گئی! میری سکھدا مل گئی!!

راجہ صاحب پر مسرت کا ایک جنون طاری ہوگیا۔ چکردھر نے بے رُخی کے ساتھ کہا۔ ابھی آپ کا خاموش رہنا ہی ناسب ہے۔ ممکن ہے آپ غلطی کررہے ہیں۔

راجہ صاحب نے زور دے کر کہا۔ ذرا بھی نہیں۔ جو بھر بھی نہیں۔ میری سکھدا یہی ہے۔ اس نے جتنی باتیں بتائیں سب ٹھیک ہیں۔ مجھے رتی بھر بھی شبہ نہیں رہا۔ ہائے! آج اس کی ماتا ہوتی تو اُسے کتنی خوشی ہوتی۔ کیا لیلا ہے ایشور کی۔ ذرا سی گئی اور بڑی ہوکر آئی اور میری تاریک زندگی کو روشن کرنے کے لیے ایک چاند سا بچہ بھی لائی۔ آؤ بھیا چکردھر! تمھیں بھی سینے سے لگالوں۔ اب تک تو تم میرے دوست تھے اب میرے لڑکے ہو۔

چکردھر بے دل سے کھڑے تھے۔ منورما باغ باغ ہورہی تھی اور اہلیا کھڑی رو

رہی تھی۔ اس وقت روہنی کمرے کے دروازے سے جاتی ہوئی نظر آئی۔ راجہ صاحب دیوانہ وار باہر نکل آئے اور بولے۔ کہاں جاتی ہو روہنی! میری سکھدا مل گئی۔ آؤ دیکھو یہ اس کا لڑکا ہے۔

روہنی وہیں ٹھٹھک گئی اور مشتبہ انداز سے بولی۔ کیا آسمان سے لوٹ آئی ہے کیا؟

راجہ۔ نہیں نہیں آگرے میں تھی۔ دیکھو یہ اس کا لڑکا ہے۔ میری صورت اس سے کتنی ملتی ہے۔ آؤ سکھدا کو دیکھو!

روہنی نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ یہ آپ کی سکھدا نہیں۔ رانی منورما کا رچایا ہوا کھیل ہے۔

راجہ صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ کیا یہ میری سکھدا نہیں ہے۔ یہ تم کیا کہتی ہو۔ میں نے خوب امتحان کر کے دیکھ لیا۔

روہنی۔ ایسے مداری کے کھیل بہت دیکھ چکی ہوں۔ بھدری بھی آپ کو ایسی باتیں بتادیتا ہے۔ جو آپ کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ سب شعبدے بازی ہے۔

راجہ۔ کیوں ناحق کسی پر تہمت لگاتی ہو روہنی۔ منورما کو بھی تو وہ باتیں معلوم نہیں ہیں جو سکھدا نے مجھے بتادیں۔ بھلا کسی غیر کی لڑکی کو منورما کیوں میری لڑکی بتائیں گی۔ اس میں اس کیا غرض ہو سکتی ہے؟

روہنی۔ وہ ہماری جڑ کھودنا چاہتی ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ چکردھر کو راجہ بناکر وہ آپ کو کونے میں بٹھا دے گی۔ یہی لڑکا جو آپ کی گود میں ہے ایک دن آپ کا دشمن ہوگا۔ یہ سب سدھی بدی باتیں ہیں۔ جسے آپ مٹی کی گو سمجھتے ہیں۔ وہ آپ جیسوں کو بازار میں بیچ سکتی ہے۔

راجہ نے بے قرار ہو کر کہا۔ اچھا اب چپ رہو روہنی! مجھے معلوم ہو گیا کہ تمھارے دل میں میری بداندیشی کے سوا اور کوئی خیال ہیں۔ آج نہ جانے کس کی دعا سے ایشور نے مجھے یہ دن دکھایا ہے اور تم منہ سے ایسے نازیبا کلمات نکال رہی ہو۔ ایشور نے مجھے یہ سب کچھ عطا کردیا۔ جس کی مجھے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ یہ چاند سا بچہ میری گود میں کھیلے گا۔ یہ امید کس کو تھی اور ایسے مبارک موقع پر اتنے زہر

اگل رہی ہو۔

یہ کہتے ہوئے راجہ صاحب اسی جوش میں دیوان خانہ میں جا پہنچے۔ دروازے پر ابھی تک کنگلوں کا ہجوم تھا۔ دوچار عملے ابھی تک بیٹھے دفتر کا کام کررہے تھے۔ راجہ صاحب نے شنکھ دھرم کو کندھے پر بٹھا کر بلند آواز میں کہا۔ دوستو! یہ دیکھو ایشور رحمت بیکراں سے میرا نور سا گھر بیٹھے میرے پاس آگیا۔ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ بیس سال ہوئے میری لڑکی سکھدا کمبھ کے میلے میں کھو گئی تھی۔ وہی سکھدا آج مجھے مل گئی ہے اور یہ بچہ اس کا لڑکا ہے۔ آج سے تم لوگ اسے اپنا ولی عہد سمجھو۔ میرے بعد یہی اس ریاست کا جانشین ہوگا۔ گارد سے کہہ دو۔ اپنے ولی عہد کی سلامی دے۔ نوبت خانہ میں کہہ دو۔ نوبت بجے۔ آج کے ساتویں دن ولی عہد کے تلک کی رسم ادا ہوگی۔

یہ حکم دے کر راجہ صاحب بچہ کو گود میں لیے ٹھاکر دروازے میں جاپہنچے۔ وہاں اس وقت ٹھاکر جی کے بھوگ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ سادھو سنتوں کا ہجوم تھا۔ ایک پنڈت جی کوئی کتھا کہہ رہے تھے۔ مگر حاضرین کے کان اس گھنٹے کی طرف لگے ہوئے تھے جو ٹھاکر جی کی پوجا کی خبر دے گی۔ اور جس کے بعد اشیاء لطیف کے درشن ہوں گے۔ دفعتاً راجہ صاحب نے آکر بچہ کو ٹھاکر جی کے سامنے بٹھادیا اور خود سر وقد ڈنڈوت کرنے لگے۔ اتنے خلوص سے انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی ایشور کی عبادت نہ کی تھی۔ اس مسرت میں انھیں ساری دنیا خوشی سے رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ٹھاکر جی خود سنگاسن سے اتر کر بچہ کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ آج ان کا نخلِ مراد بار ور ہوا۔ یہ ایشور کا رحم نہیں تو اور کیا ہے۔ فرزند کے سامنے ثروت ومال کی حقیقت کیا۔ حیات کا مقصد ہی کیا ہے؟ عمل کی غایت ہی کیا ہے؟ اپنے لیے کون دنیا کے منصوبے باندھتا ہے؟ اپنی تو ارادوں میں ہی ختم ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب ارادوں کے پورے ہونے کے دن آتے ہیں تو ہماری منزل حیات قریب ہوتی ہے۔ فرزند ہی تمناؤں کا سرچشمہ، خواہشوں کا مرکز، علایق کی زنجیر اور زندگی کا سب کچھ ہے۔ وہی فرزند آج بشال سنگھ کو مل گیا تھا۔ اس معصوم بچے کو سینے سے لگاکر انھیں اپنے اندر سوگنی طاقت کا احساس ہورہا تھا۔ اب ان کے

لیے دنیا ہی جنت تھی۔

پجاری نے کہا۔ بھگوان راج کنور کی عمر دراز کرے۔

راجہ صاحب نے اپنے ہیرے کی انگوٹھی اتار کر اُسے دے دی۔ ایک بابا جی کو اسی دعا کے لیے سو بیگھے کی معافی مل گئی۔

ٹھاکر دوارے سے جب وہ گھر میں آئے تو دیکھا۔ چکردھر آسن پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور منورما سامنے کھڑی کھانا پروس رہی ہے۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی سرخی جھلک رہی تھی۔ کوئی یہ قیاس نہ کر سکتا تھا کہ یہ وہی مریضہ ہے۔ جو ابھی دس منٹ پہلے بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔

(32)

شباب انسانی زندگی کا معراج ہے طفلی میں اگر ہم سنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب ان خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور بڑھاپا اس تعبیر کی یادگار۔ ہماری ساری جسمانی اور دماغی قوتوں کے ارتقا کا نام جوانی ہے۔ کلی کو کون پوچھے۔ اگر اس کے پھول ہونے کی اُمید نہ ہو۔ اور مرجھایا ہوا پھول پیروں تلے روندے جانے کے سوا اور کس کام آتا ہے۔ اگر کائنات کی ساری برکتیں ایک طرف رکھ دی جائیں۔ اور شباب دوسری طرف۔ تو ایسا کون انسان ہے جو اس مال وزر کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی دیکھے۔ رانی دیوپریا کی سی خوش نصیب اور کون عورت ہوگی۔ جسے ایک بار شباب نے پھر اپنی گود میں لے لیا ہے۔

شام کا وقت تھا۔ رانی دیوپریا ایک کوہستانی غار میں ایک چٹان پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ کنور مہندر سنگھ اس کے قریب بیٹھے ہوئے اس کے چہرے کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا جسم لاغر ہوگیا ہے۔ چہرہ زرد ہے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوی ہیں۔ جیسے کوئی تپ دق کا مریض ہو۔ یہاں تک کہ اسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ زندگی کی اگر کوئی علامت ہے تو وہ ان کی آنکھوں میں امید کی جھلک ہے۔ آج ان کی تپسیا کا آخری دن ہے۔ آج دیوپریا کی زندگی میں نئی بہار شروع ہوگئی۔ سوکھا ہوا درخت نئی نئی کونپلوں سے لہرائے گا۔ کنور صاحب بار بار اس

کے بے حرکت سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہیں کہ خون کی گردش ہونے میں کتنی دیر ہے اور زندگی کی کوئی علامت نہ پاکر مایوس ہوجاتے ہیں۔ انھیں اندیشہ ہورہا ہے۔ میری تپسیا بیکار تو نہ ہوگی۔

دفعتاً مہندر چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ روحانی مسرت سے چہرہ روشن ہوگیا۔ دیوپریا کے تار ہائے دل میں نغمہ حیات کا زمزمہ ہورہا تھا۔ ایک لمحہ میں اس کے نیلے ہونٹوں پر سُرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں کھل گئیں اور چہرے پر زندگی کی رونق نمودار ہوگئی۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور تعجب آمیز نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر چٹان سے اُٹھ بیٹھی۔ اس کا دلفریب حسن دیکھ کرکون کہہ سکتا تھا کہ وہ موت کے پنجے سے نکل آئی ہے۔ یہ وہی دیوپریا ہے جو امید اور بیم سے کانپتا ہوا دل لیے آج سے ۴۰ برس پہلے سسرال آئی تھی۔ وہی شباب کی لطافت تھی۔ وہی آنکھوں کو مسحور کرنے والی رعنائی۔ وہی شگفتہ تبسم۔ وہی نازک جسم، اُسے اپنے جسم کے ایک ایک عضو میں نئی زندگی کا احساس ہورہا تھا۔ لیکن خامہ تن تبدیل ہوجانے پر بھی اُسے اپنی زندگی کی پہلی ساری باتیں تھیں۔ لٹے ہوئے سہاگ کے زمانہ کی نفس پروری اپنی مکروہ صورت میں سامنے کھڑی تھی۔ ایک لمحہ تک وہ شرم اور ندامت کے باعث کچھ بول نہ سکی۔ کنور صاحب کے ان عاشقانہ سرفروشی کے آگے اس کی عصمت فروشانہ زندگی کتنی شرمناک تھی۔

مہندر نے مسکراکر کہا۔ یہ میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے تمھاری حالت دیکھ کر میں اپنی دلیری پر افسوس کررہا تھا۔

دیوپریا نے مہندر کو محبت سے متوالی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ پران ناتھ! تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

دیوپریا کے دل میں ایک ولولہ سا اٹھا کہ شوہر کے قدموں پر سر رکھ دے۔ اور کہے۔ تم نے مجھے وہ نعمت عطا کردی۔ جو ہمیشہ سے انسانی تخیل کا سنہرا خواب رہی ہے۔ مگر حجاب نے زبان پر مہر لگادی۔

مہندر۔ سچ کہنا۔ تمھیں یقین تھا کہ میں تمھاری تبدیلی ہیئت کرسکوں گا۔

دیوپریا۔ پیارے ! تم کیوں پوچھتے ہو۔ مجھے یقین نہ ہوتا تو تمھارے پاس آتی ہی کیوں؟
مہندر۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس عمل میں کتنے دن لگے؟
دیوپریا۔ میں کیا جانوں ، کتنے دن لگے۔
مہندر۔ پورے تین سال۔
دیوپریا۔ تین سال! تین سال سے تم میرے لیے تپسیا کررہے ہو؟
مہندر۔ تین کیا اگر بیس سال بھی یہ تپسیا کرنی پڑتی۔ تو میں شوق سے کرتا۔

دیوپریا نے شرماتے ہوئے پوچھا۔ یہ تو نہ ہوگا کہ دو چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ ہوجائے۔

مہندر۔ نہیں جانِ من۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔
دیوپریا۔ ہم لوگ اس وقت کہاں ہیں۔
مہندر۔ ایک پہاڑ کے غار میں۔ میں نے اپنے شاہی اختیارات اپنے وزیر کو دے دیے۔ اور تمھیں لے کر یہاں چلاآیا۔ سلطنت کے تفکرات میں پڑ کر میں اس عمل میں کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔ اب شاید میں اپنے راج پر قابض نہ ہوسکوں۔ مگر تمھارے لیے ایسے کئی راج قربان کرسکتا ہوں۔

دیوپریا کو اب ایک ایسی نایاب چیز مل گئی تھی۔ جس کے مقابلہ میں شاہی اقتدار کی کوئی ہستی نہ تھی۔ صحرائی زندگی کا تخیل اسے اس وقت نہایت دلآویز معلوم ہوا۔ محبت کی خوشیوں میں ڈوب جانے کے لیے کنور صاحب اپنی وفادار خلوص کے اظہار کے لیے یہاں جتنے موقعہ تھے اتنے شاہی محل میں کہاں مل سکتے تھے۔ اُسے شاہی اقتدار کی ذرا بھی تمنا نہ تھی۔ خوش ہوکر بولی۔ یہی تو میں چاہتی تھی۔

مہندر۔ اس بے سروسامانی کی زندگی تمھیں ناگوار تو نہ گذرے گی؟ ابھی تمھیں اس زندگی کی تکلیفوں کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر تم ان تکلیفوں کو برداشت نہ کرسکو۔ تو میں ایک بار پھر شاہی اقتدار کے لیے کوشش کرسکتا ہوں۔
دیوپریا۔ تمھارے ساتھ میں سب کچھ خوشی سے جھیل سکتی ہوں۔

اسی وقت دیوپریا نے غار سے باہر نکل کر دیکھا۔ تو چاروں طرف تاریکی کا عالم تھا۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں اسے وہاں کی سب چیزیں صاف نظر آنے لگیں۔ سامنے

اونچی پہاڑیوں کے سلسلے بہشتی حوروں کے محل سے معلوم ہوتے تھے۔ داہنی طرف درختوں کی قطار، سادھوؤں کی کٹیوں سی نظر آتی تھی۔ اور بائیں طرف تاروں سے جگمگاتی ہوئی رانی کسی پنہارن کی طرح میٹھے راگ گاتی اٹھلاتی چلی جاتی تھی۔

دفعتاً دیوپریا کے دل میں ایک حسرت ناک خیال پیدا ہوا۔ میری ہوس پروری کہیں پھر تو مجھے تباہ نہ کردے گی؟۔

(33)

راجہ بشال سنگھ نے ادھر کئی سالوں سے ریاست کے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ منشی بجردھر اور دیوان صاحب کی چڑھ بنی تھی۔ گروسیوک سنگھ بھی اپنے راگ رنگ میں مست تھے۔ رعایا کے سکھ دکھ کی فکر اگر کسی کو تھی تو وہ منورما تھی۔ راجہ صاحب نے انصاف اور حق کا جوش ٹھنڈا پڑگیاتھا۔ منورما کو پاکر انھیں کسی چیز کی سدھ نہ تھی۔ انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی منورما کی جدائی شاق تھی۔ ان کی حالت اس قلانچ کی سی تھی۔ جو کہیں سے دولت بیکراں پاجائے اور شب وروز اسی فکر میں پڑا رہے۔ ان کی نگاہ میں منورما ورق گل سے بھی زیادہ نازک تھی۔ اُسے کچھ نہ ہوجائے۔ انھیں یہی اندیشہ ہمیشہ ہوتا رہتاتھا۔ دوسری رانیوں کی اب وہ خوشامد کرتے تھے۔ جس میں وہ منورما کو کچھ کہہ نہ بیٹھیں۔ منورما کو بات کس قدر لگتی ہے۔ اس کاانھیں تجربہ ہوچکا تھا۔ روہنی کے ایک طعنہ نے اُسے کاشی چھوڑ کر اس گاؤں میں لابٹھایا تھا۔ ویسا ہی دوسرا طعنہ اس کی جان لے سکتا تھا۔ اس لیے وہ رانیوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔ خاص کر روہنی کو۔ حالانکہ وہ منورما کو جلانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔

لیکن اس بچے نے آکر راجہ صاحب کی زندگی میں ایک نئی اُمنگ ڈال دی۔ اب تک ان کی زندگی کا کوئی مدار نہ تھا۔ دل میں سوال ہوتا تھا کس لیے مروں؟ کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے؟ دیوتا ہی نہ تھا تو مندر کی تعمیر کیسے ہوتی۔ اب وہ دیوتا اتر آیا تھا۔ پھر مندر کی تعمیر کیوں نہ ہوتی۔ اب وہ ریاست کے کاموں سے کنارہ کش کیوں رہتے؟

منشی بجردھر اب تک تو دیوان صاحب سے مل کر اپنا مطلب نکالتے رہتے تھے۔ مگر اب وہ کسی کو کیوں گننے لگے تھے۔ دیوان صاحب سے ایک دن کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ دیوان صاحب اگر منورما کے باپ تھے۔ تو منشی جی ولی عہد کے دادا تھے۔ پھر دونوں میں کون دبتا۔ عملے منشی جی کو دیکھتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ نصیب کسی کا چمکے تو ایسا چمکے۔ کہاں پنشن کے ۲۵ روپیوں پر گذر بسر ہوتی تھی۔ کہاں اب ریاست کے مالک تھے۔ اگر کوئی عملہ ان کے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر کرتا۔ تو جامہ سے باہر ہوجاتے۔ یہاں تمھاری دال نہ گلے گی۔ سمجھ گئے۔ ایک ایک کو نگل جاؤں گا۔ راجہ صاحب بھی ان کا اب بہت ادب کرتے تھے۔

مگر منشی جی کی یہ زبان درازی اور تنگ ظرفی لوگوں کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ چکردھر کے کانوں میں کبھی یہ باتیں پڑ جاتیں تو مارے شرم کے گڑ جاتے تھے۔ وہ آج کل منشی جی سے بہت کم بولتے۔ گھر پر بہت کم جاتے۔ دوستوں سے ملنا جلنا بہت کم کردیا تھا۔ حالانکہ اب دوستوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ فی الحقیقت یہاں کی زندگی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ وہ پھر اپنے اسی گوشہ عافیت میں واپس جانا چاہتے تھے۔ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوجاتی تھی۔ جو انھیں دن بھر مضطرب رکھنے کو کافی ہوتی تھی۔ کئی بار انھیں مجبور ہوکر کارکنوں کو تنبیہ اور نوکروں کی گوشمالی کرنی پڑی تھی۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ان کی زندگی کے پرانے اصول ٹوٹتے چلے جاتے تھے۔ وہ بہت کوشش کرتے کہ ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ پر قریب قریب روز ہی ایسے موقعے آپڑتے تھے کہ انھیں لاچار ہوکر آئین سیاست سے کام لینا پڑتا۔

مگر اہلیا کی حالت بالکل اس کے برعکس تھی۔ بہت دنوں تک جھیلنے کے بعد اُسے یہ راحت میسر ہوئی تھی اور وہ اس کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اپنے پرانے دن اُسے بہت جلد بھول گئے تھے اور ان کی یاد دلانے سے اسے ملال ہوتا تھا۔ اس کا طریق معاشرت بالکل تبدیل ہوگیا تھا۔ وہ اچھی خاصی امیر زادی بن گئی تھی۔ سارے دن عیش و تفریح کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ شوہر کے دل پر کیا گذر رہی ہے یہ سوچنے کی تکلیف وہ کیوں اٹھاتی۔ جب وہ خوش تھی۔ تو اس کا شوہر بھی ضرور ہی خوش ہوگا۔

ثروت اور اقتدار پاکر کون روتا ہے۔ اس کا حسن اب بدر کامل کی طرح پرشکوہ ہوگیا تھا۔ اس کی وہ سادگی، وہ انکسار، وہ تمیز داری غائب ہوگئی تھی۔ وہ اب ایک مغرور، نازک طبع نفاست پسند نازنین تھی۔ جس کی آنکھوں سے حد چھلکا پڑتا تھا۔ چکردھر نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ تب وہ ایک کونپل تھی۔ اور منورما ایک نوشگفتہ صبح کی زریں شعاعوں سے مسکراتا ہوا پھول۔ اب اہلیا منورما ہوگئی تھی اور منورما اہلیا۔ اہلیا پہروں چڑھے انگڑائیاں لیتی آرام گاہ سے نکلتی۔ منورما پہر رات ہی سے گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرنے لگتی تھی۔ شنکھ دھر اب منورما ہی کے پاس رہتا تھا۔ وہ اس کی ناز برداری کرتی تھی۔ اہلیا صرف اسے کبھی کبھی گود میں لے کر پیار کرلیتی تھی۔ گویا کسی دوسرے کا لڑکا ہو۔ منورما کی تو اس میں اب جان ہی بستی تھی۔ کبھی کبھی وہ عالم تنہائی میں منورما بچے کو گود میں لیے گھنٹوں منہ چھپائے روتی۔ جب شنکھ دھر اسے روتے دیکھ کر رونے لگتا۔ تو وہ آنسو پی جاتی اور ہنسنے کی کوشش کرتی۔ اس کی تمکنت ایک گہرے فکر اور دردناک حسرت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ اہلیا سے دبتی تھی۔ مگر اہلیا اس سے کھنچی رہتی تھی۔ شاید وہ منورما کے اختیارات اور تصرف کرنا چاہتی تھی۔ مگر رانی اپنے اختیارات کا ایک شمہ بھی نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ یہی اس کی زندگی کا سہارا تھا۔

اب چکردھر اہلیا سے اپنے دل کی باتیں کبھی نہ کہتے تھے۔ یہ ثروت ان کی زندگی کو تباہ کیے ڈالتی تھی۔ کیا اہلیا یہ ناز ونعمت چھوڑ کر ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگی؟ انھیں خوف ہوتا تھا کہ کہیں وہ اس تجویز کا مذاق نہ اڑائے۔ پھر انھیں کیا حق ہے کہ وہ اُسے اپنے ساتھ تکلیفیں جھیلنے کے لیے مجبور کریں۔ اگر وہ عارضی جوش میں آکر اس کے ساتھ چلنے پر تیار بھی ہوگئی۔ تو کیا اس بے سروسامانی میں وہ خوش بھی رہے گی؟ کیا منورما شنکھ دھر کو چھوڑ بھی دے گی؟ کیا شنکھ دھر کو چھوڑ کر ان کے ساتھ جائے گی۔ اسی طرح کے کتنے ہی سوالات چکردھر کے دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے اور وہ کسی طرح اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ نہ کرسکتے تھے۔ صرف ایک ہی بات یقینی تھی۔ وہ ان بندشوں میں پڑ کر اپنی زندگی برباد نہ کرنی چاہتے تھے۔ ثروت پر اپنے اصولوں کو قربان نہ کرسکتے تھے۔

ایک دن چکردھر بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے کہ منشی جی نے آکر کہا۔ بیٹا! ذرا ایک بار ریاست کا دورہ کیوں نہیں کر آتے۔ آخر دن بھر پڑے ہی تو رہتے ہو میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ تم کس قماش کے آدمی ہو۔ بیچارے راجہ صاحب تنہا کہاں کہاں جائیں اور کیا کریں۔ رہا میں۔ وہ کسی مصرف کا نہیں۔ مجھ سے کسی دعوت یا برات یا مجلس کا انتظام کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ گاؤں گاؤں دوڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ اب تو خدا کے فضل وکرم سے ریاست اپنی ہے۔ ہاتھی گھوڑے موٹریں سب کچھ موجود ہیں۔ کبھی کبھی علاقہ کا چکر لگا آیا کرو۔ اسی طرح دھاک بیٹھے گی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے تمھیں کون جانتا ہے؟

چکردھر نے بے نیازی کے انداز سے کہا۔ میں اس وبال میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو یہاں سے چلنے کو تیار بیٹھا ہوا ہوں۔

منشی چکردھر کا منہ تاکنے لگے۔ بات اتنی انوکھی اور نرالی تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ پوچھا۔ کیا اب بھی وہی سنک سوار ہے؟

چکردھر۔ آپ اُسے سنک، جنون۔ فتور عقل جو چاہیں سمجھیں مگر مجھے تو گوشۂ عافیت میں جتنا اطمینان ہوتا ہے وہ اس طمطراق میں نہیں ہوتا۔ آپ کو بھی میری یہی صلاح ہے کہ آرام سے گھر میں بیٹھ کر بھگوان کا بھجن کیجیے!

منشی۔ کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا! ایک ایک اُنگل زمین کے لیے تو خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور تم اتنی بڑی ریاست پاکر ایسی باتیں کرتے ہو۔ اب تم سمجھ دار ہوئے۔ ان پرانی باتوں کو دل سے نکال ڈالو۔ خدا نے تمھیں جو رتبہ عطا کیا ہے۔ اس کا شکر بجا لاؤ اور ریاست کا انتظام اپنے ہاتھ میں لو۔

چکردھر کو اب اطمینان ہوا کہ وہ یہاں اطمینان سے نہ بیٹھنے پائیں گے۔ آج منشی جی نے یہ نصیحت کی۔ ممکن ہے کل اہلیا بھی یہی نصیحت کرے۔ انھیں محسوس ہوا کہ اگر بے لوث زندگی بسر کرنی ہے تو بہت جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔

ایک دن چکردھر ہوا کھانے نکلے۔ گرمی کے دن تھے۔ ہوا بند تھی۔ دیہات کی طرف دور نکل گئے۔ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے۔ سڑک خراب ہوتی جاتی تھی۔ دفعتاً انھیں راستے میں ایک بڑا سانڈ دکھائی دیا۔ بہت ہارن بجایا۔ پر سانڈ نہ ہٹا۔ جب

قریب آنے پر بھی سانڈ کھڑا ہی رہا۔ تو انھوں نے چاہا کہ کترا کر نکل جائیں۔ مگر سانڈ سر جھکائے فوں فوں کرتا پھر سامنے آکھڑا ہوا۔ چکردھر چھڑی ہاتھ میں لے کر نیچے اُترے کہ اُسے بھگادیں۔ مگر وہ بھاگنے کے بدلے ان کے پیچھے دوڑا۔ خیرت یہ ہوئی کہ سڑک کے کنارے ایک درخت مل گیا۔ چھڑی پھینکی اور درخت کی ایک شاخ پکڑ کر لٹک گئے۔ سانڈ ایک منٹ تک تو درخت سے ٹکر لیتا رہا۔ پھر موٹر کے پاس آکر اسے سینگوں سے پیچھے کی طرف ٹھیلتا ہوا دوڑا۔ کچھ دور کے بعد موٹر سڑک سے ہٹ کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اب سانڈ پونچھ اُٹھا کر بار بار زور لگاتا ہے۔ پیچھے ہٹ ہٹ کر اس میں ٹکریں مارتا ہے۔ مگر موٹر جگہ سے نہیں ہلتی۔ تب اس نے موٹر کے بغل میں جاکر اتنے زور سے ٹکر لگائی کہ موٹر الٹ گئی۔ موٹر کے پہیے پھٹ گئے۔ کئی پرزے ٹوٹ گئے۔ چکردھر شاخ پر بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ موٹر کی فکر تو نہ تھی۔ فکر یہ تھی کہ گھر کیسے لوٹیں گے۔ چاروں طرف تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ ابھی معلوم نہیں سانڈ کتنی دیر موٹر سے لڑے گا۔ اگر ان کے پاس اس وقت بندوق ہوتی تو سانڈ کو مار ہی ڈالتے۔ دل میں سانڈ چھوڑنے کی رسم پر جھنجھلا رہے تھے۔ پاجی نے سانڈ چھوڑ رکھا ہے۔ اگر اس کا نام معلوم ہوجائے تو ساری جائداد کو بکوالوں۔

سانڈ نے جب دیکھا کہ دشمن کی دھجیاں اڑ گئیں اور اب وہ شاید پھر نہ اٹھے۔ تو ڈکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

چکردھر نیچے اترے اور موٹر کو دیکھا تو وہ الٹی پڑی ہوئی تھی۔ موٹر کا سیدھا کرنا ایک آدمی کا کام نہ تھا۔ کسی آدمی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے۔ اتفاق سے پورب کی طرف تھوڑی ہی دور پر ایک گاؤں نظر آیا۔ اسی طرف چلے راستے میں ادھر ادھر تاکتے تھے کہ کہیں سانڈ پیچھے نہ آتا ہو۔ یہ ایک چھوٹا سا پروا تھا۔ لوگ بھی تھوڑی ہی دیر پہلے اوکھ کی سینچائی کرکے آئے تھے۔ چکردھر نے ایک آدمی سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا گاؤں کا بھنیسور ہے اور جگدیش پور کی ریاست میں ہے۔

چکردھر نے خشمناک لہجہ میں کہا۔ وہ بدمعاش سانڈ کس کا ہے جو اس وقت سڑک پر گھوما کرتا ہے۔

ایک کسان نے جواب دیا۔ یہ تو نہیں جانتے صاحب! مگر اس کے مارے ناکوں دم ہے۔ ادھر سے کسی کو نکلنے ہی نہیں دیتا۔ جس گاؤں میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ چار بیلوں کو مار ڈالتا ہے۔

چکردھر۔ آج اس بدمعاش نے مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ میری موٹر الٹ دی۔ تم لوگ میرے ساتھ چل کر موٹر اٹھادو!

اس پر ایک دوسرا کسان اپنے دروازے سے بولا۔ سرکار! بھلا رات کو موٹر اٹھواکر کیا کیجیے گا۔ وہ چلنے لائق تو ہوگی نہیں۔

چکردھر۔ تم لوگوں کو اُسے ٹھیل کر جگدیش پور تک لے جانا پڑے گا۔

پہلا کسان۔ سرکار رات بھر یہیں ٹھہریں۔ سویرے ہم گاڑی پر لاد کر موٹر پہنچا دیں گے۔

چکردھر نے جھلا کر کہا۔ کیسی باتیں کرتے ہو جی! میں رات بھر یہیں پڑا رہوں گا۔ تم لوگوں کو اس وقت چلنا ہوگا۔

چکردھر کو وہاں کوئی پہچانتا نہ تھا۔ لوگ سمجھے راجاؤں کے یہاں سبھی طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہوگا کوئی۔ اس کے سوا وہ ٹھاکروں کا گاؤں تھا اور ٹھاکر سے مدد کے نام جو کام چاہو لے لو۔ بیگار کے نام سے ان کا خون اُبل پڑتا ہے۔ کسان نے کہا صاحب! اس بکھت تو ہمارا جانا نہ ہوگا۔ اگر بیگار چاہتے ہو۔ تو وہ اتر کی طرف دوسرا گاؤں ہے۔ وہاں چلے جائیے۔ بہت سے چمار مل جائیں گے۔

چکردھر نے غصہ میں آکر کہا۔ میں کہتا ہوں۔ تم کو چلنا پڑے گا۔

کسان نے اکڑ کر کہا۔ تو صاحب اس بات پر تو ہم نہ جائیں گے۔ ہم پاسی چمار نہیں۔ ٹھاکر ہیں۔

چکردھر کو ایسا غصہ آیا کہ اُسے ٹھوکریں مارتا ہوا لے چلیں۔ مگر ضبط کر کے بولے شرافت سے کہتا ہوں۔ تو تم لوگ اڑن گھاٹیاں بتاتے ہو۔ ابھی کوئی چپراسی آکر دو گھرکیاں جمادیتا تو سارا گاؤں بھیڑ کی طرح ،س کے پیچھے چلا جاتا۔

کسان نے بے خوفی سے جواب دیا۔ سپاہی کیوں گھرکیاں جمائے گا۔ کوئی چور ہیں ہماری خوشی نہیں جاتے۔ آپ کو جو کرنا ہو کر لیجیے۔

چکردھر سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ چھڑی ہاتھ میں تھی ہی۔ باز کی طرح کسان پر ٹوٹ پڑے اور دھکا دے کر بولے۔ چلتا ہے یا جماؤں دو چار ہاتھ۔

چکردھر مضبوط آدمی تھا۔ کسان دھکا کھا کر گر پڑا۔ یوں وہ بھی کرارا آدمی تھا۔ اُلجھ پڑتا تو چکردھر کے چھکے چھوٹ جاتے۔ مگر وہ رعب میں آ گیا۔ سوچا کوئی حاکم ہے نہیں تو اس کی ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی کیسے پڑتی۔ سنبھل کر اٹھنے لگا۔ چکردھر نے سمجھا۔ شاید اٹھ کر مجھ پر وار کرے گا۔ لپک کر پھر ایک دھکا دیا۔ اسی وقت سامنے والے مکان میں سے ایک آدمی لالٹین لیے ہوئے باہر نکل آیا۔ اور چکردھر کو دیکھ کر تعجب سے بولا۔ ارے بھگت جی! تم نے یہ بھیس کب سے بدلا۔ مجھے پہچانتے ہو۔ چکردھر اسے فوراً پہچان گئے۔ یہ ان کا جیل کا ساتھی دھنا سنگھ تھا۔ چکردھر کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ شرماتے ہوئے بولے۔ کیا تمھارا گھر اسی گاؤں میں ہے دھنا سنگھ!

دھنا سنگھ۔ ہاں اسی گاؤں میں۔ وہ آدمی جسے آپ ٹھوکریں مار رہے ہیں۔ میرا سگا بھائی ہے۔ کھانا کھا رہا تھا۔ جب تک اُٹھوں اُٹھوں تم گرم ہو گئے۔ تم اتنے غصہ ور کب سے ہو گئے۔ جیل میں تو تم دیا اور دھرم کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ کیا وہ دکھانے کے دانت تھے؟ نکلا تو کچھ اور ہی سوچ کر تھا۔ مگر تم اپنے پرانے ساتھی نکلے۔ کہاں تو دروگا کو بچانے کے لیے اپنی چھاتی پر سنگین روک لی تھی۔ کہاں آج ذرا سی بات پر اتنے جامہ سے باہر ہو گئے۔

چکردھر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکے۔ ان کی زندگی کی ساری کمائی جو انھوں نے نہ جانے کتنی قربانیوں کے بعد جمع کی تھی۔ یہاں لٹ گئی۔ ایک طرف ان کا جوش انصاف پامال ہو کر کسی بے کس بچے کی طرح دامن میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ دوسری طرف خفت کسی دیونی کی طرح ان کے سینے پر سوار تھی۔

دھنا نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ تو وہ زور زور سے ہائے ہائے کر کے چلا اٹھا۔ چکردھر سے دھنا سنگھ کو جو رہا سہا حسن ظن تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ ان کی طرف سرخ آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ کیا کہیں پرانے ساتھی اور اپنے دروازے پر آئے ہو۔ نہیں تو اس وقت تم زندہ نہ لوٹتے۔ تم اتنے بدل کیسے گئے۔ اگر آنکھوں

سے نہ دیکھتا تو مجھے کبھی اس بات کا یقین نہ آتا۔ ضرور تمھیں کوئی عہدہ یا جائداد مل گئی ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ہم بیکس ہیں۔ ابھی جاکر مہراج کے ڈیوڑھی پر فریاد کریں تو تم کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ۔ بابو چکردھر سنگھ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ اب کسی سرکاری آدمی کی مجال نہیں کہ بیگار لے سکے۔ تم بے چارے کس گنتی میں ہو۔ عہدہ پاکر اپنے دن بھول نہ جانا چاہیے۔ تمھیں میں اپنا گرو اور دیوتا سمجھتا تھا۔ مجھے تو تم نے وہ سبق دیا اور آپ لگے غریبوں کو کچلنے۔ منا سنگھ نے تو اتنا ہی تو کہا تھا کہ رات کو یہیں ٹھہیر جاؤ۔ اس میں کیا برائی تھی۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا۔ تو کہہ دیتا تمھارا غلام نہیں ہوں۔ جیسے چاہو اپنی موٹر لے جاؤ۔ مجھ سے مطلب نہیں۔ اس نے تو تمھارے ساتھ شرافت کی اور تم اُسے مارنے لگے۔ اب بتاؤ۔ اس کے ہاتھ کی کیا دوا کی جائے۔ سچ ہے رتبہ پاکر آنکھیں پھر جاتی ہیں۔

چکردھر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ دھنا سنگھ! مجھے معاف کرو۔ جو سزا چاہے دو۔ سر جھکائے ہوئے کھڑا ہوں۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالوں گا۔

دھنا سنگھ رقت آمیز لہجہ میں بولا۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ بھگت جی، غصہ میں آدمی کے منہ سے برا بھلا نکل ہی جاتا ہے۔ اس کا خیال نہ کرو۔ بھیا! بھائی کا ناطہ بڑا گہرا ہوتا ہے بھائی چاہے اپنا دشمن بھی ہو۔ لیکن کون آدمی ہے جو بھائی کو ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر اپنا غصہ روک سکے۔ کہاں ہے موٹر چلو۔ میں اٹھائے دیتا ہوں۔

چکردھر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جب تک ان کا ہاتھ اچھا نہ ہوجائے گا۔ میں کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں کوئی آدمی ایسا ملے جو یہاں سے جگدیش پور جاسکے تو اُسے میری یہ چٹھی دے دو۔

دھنا سنگھ۔ جگدیش پور میں تمھارا کون ہے بھیا؟ کیا ریاست میں نوکر ہوگئے ہو؟

چکردھر۔ نوکر نہیں ہوں۔ میں منشی بجردھر کا لڑکا ہوں۔

دھنا سنگھ نے مرعوب ہوکر کہا۔ تب تو آپ ہمارے مالک ہی ہیں۔ دھنیہ بھاگ کہ آج آپ کے درشن ہوئے۔

وہ دوڑ کر گھر میں گیا اور ایک چارپائی لاکر دروازے پر ڈال دی۔ پھر لپک کر

گاؤں میں خبر دے آیا۔ ایک لمحہ میں گاؤں کے سارے آدمی جمع ہوگئے۔ اور چکردھر کو نذریں گذارنے لگے۔ ہر ایک زبان پر ان کی تعریف تھی۔ جب سے سرکار آئے ہیں۔ ہمارے دن پھر گئے ہیں۔ آپ کے شیل سو بھاؤ کی جتنی تعریف سنتے تھے۔ اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔

دھنا سنگھ نے کہا۔ میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔ غصہ میں نہ جانے کیا کیا بک گیا۔

دوسرا ٹھاکر بولا۔ سرکار اپنا نام بتادیتے۔ توہم موٹر کو کندھے پر لاد کر لے چلتے۔ آپ کے لیے تو جان حاضر ہے۔ منا سنگھ مردے آدمی! ہاتھ جھک کر اٹھ کھڑے ہو۔ تمھارے تو نصیب کھل گئے۔

منا سنگھ نے درد سے کراہ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سرکار دیکھنے میں تو دُبلے پتلے ہیں۔ پر آپ کے ہاتھ پاؤں لوہے کے ہیں۔ میں نے سرکار سے بھڑنا چاہا پر آپ نے ایک ہی اڑنگے میں دے ٹپکا۔

دھنا سنگھ۔ بھیا! بھاگوان کے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں ہوتی اقبال میں طاقت ہوتی ہے۔

چکردھر کے ان تمطق سازیوں میں ذرا بھی لطف نہ آیا۔ انھیں اس خیال سے ان لوگوں پر رحم آیا کہ جس نے ان کے ساتھ اتنی بے انصافی کی۔ اسی کی تعریفوں کے پُل باندھ رہے ہیں۔ ذلت کو پی جانا اخلاقی پستی کی آخری حد ہے اور یہی خوشامد سن کر ہم لٹو ہو جاتے ہیں۔ چکردھر کو اب تعجب ہورہاتھا کہ مجھے اتنا غصہ آیا کیوں؟ سال بھر پہلے شاید وہ منا سنگھ کے پاس آکر امداد کے لیے منت سماجت کرتے۔ اگر رات بھر رہنے کی ضرورت پڑتی تو رہ جاتے۔ شاید دیہاتوں میں ایک رات کاٹنے کا موقعہ پاکر خوشی ہوتی آج انھیں تجربہ ہوا کہ ثروت کی بو کتنے مستور اور نامعلوم طریقے سے ان کے اندر سرایت کرتی جاتی ہے۔ کتنے مستور اور نا معلوم طریقے سے ان کی انسانیت کا اخلاق کا اور اصولوں کا خون ہورہا ہے۔

دفعتاً سڑک کی طرف روشنی دکھائی دی۔ ذرادیر میں وہ موٹریں سڑک پر سے جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ یکایک دونوں اسی موقعہ پر پہنچ کر رُک گئیں۔ جہاں چکردھر کی موٹر ٹوٹی پڑی تھی۔ پھر کئی آدمی موٹروں سے اُترتے دکھائی دیے۔ چکردھر سمجھ گئے

کہ میری تلاش ہورہی ہے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے لوگ بھی چلے۔ قریب آکر دیکھا کہ رانی منورما پانچ مسلح سپاہیوں کے ساتھ چلی آرہی ہیں۔ چکردھر لپک کر آگے بڑھے۔ رانی انھیں دیکھتے ہی ٹھٹھک گئی۔ اور گھبرا کر بولی۔ بابو جی! آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ میری تو جیسے روح فنا ہورہی تھی۔ اب میں آپ کو تنہا کبھی نہ گھومنے دیا کروں گی!

(34)

دیوپریا کو اس غار میں رہتے کئی مہینے گذر گئے۔ وہ دل وجان سے شوہر کی خدمت میں مصروف رہتی۔ بڑے سویرے نیچے جاکر ندی سے پانی لاتی۔ پہاڑی درختوں سے لکڑیاں توڑتی اور جنگلی پھولوں کو اُبالتی۔ کبھی کبھی مہندر کمار کئی کئی دن کے لیے غائب ہوجاتے۔ دیوپریا اکیلی غار میں بیٹھی ان کی راہ دیکھا کرتی۔ مگر مہندر کو صحرا نوردی سے اتنی مہلت نہ ملتی کہ دوچار لمحہ کے لیے بھی تو اس کے پاس جا بیٹھیں۔ رات کو وہ یوگا بھیاس کرتے۔ نہ جانے کب کہاں چلے جاتے۔ نہ جانے کب کیسے چلے آتے۔ دیوپریا کو اُس کی خبر نہ ہوتی تھی۔ ان کی زندگی کا معمہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس غار میں بھی انھوں نے بہت سے نظریاتی آلے جمع کررکھے تھے۔ اور دن کو اکثر انھیں آلات سے کوئی نہ کوئی تجربہ کرتے رہتے۔ ہر ایک کام کے لیے تو ان کے پاس وقت تھا اگر وقت نہ تھا تو محض دیوپریا کی دلجوئی کے لیے۔ دیوپریا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ اتنے سردمہر کیوں ہوگئے۔ وہ شورا شوری کہاں گئی۔ وہ عاشقانہ سرگرمی کہاں غائب ہوگئی۔

وہ جنگل کے پرندوں کے ساتھ چہکتے ہرنوں کے ساتھ کھیلتے۔ سانپوں کو نچاتے ندی میں جل بہار کرتے۔ مگر محبت کے اس لازوال امتیاز میں اس کے لیے ایک مٹھی بھی نہیں۔ اس سے کیا خطا ہوئی ہے؟

حسن میں وہ لاثانی تھی۔ اس نے ایک سے ایک زاید فریب حسینوں کو دیکھا تھا۔ مگر اپنے سامنے کوئی اس کی نگاہ میں جچتی تھی۔ وہ جنگلی پھولوں کے گہنے بنابنا کر پہنتی۔ نازو ادا، شوخی وشرارت۔ عشوے وغمزے سب کچھ کرتی۔ مگر شوہر کے دل

تک رسائی نہ ہوتی۔ تب وہ جھنجھلا پڑتی کہ اگر یوں ہی جلانا تھا۔ تو میری یہ کایا پلٹ کیوں کی۔ یہ حسن وشباب کی بلائیں میرے سر ڈالی۔ حسن وشباب کو پاکر ایک دن اس نے اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھا تھا۔ اسی شباب سے اب اس کا جی جلتا تھا۔

ایک دن دیوپریا نے مہندر سے کہا۔ تم نے میرا ظاہر تو بدل دیا پر باطن کیوں نہ بدلا۔

مہندر نے بے نیازی کی شان سے کہا۔ جب تک پچھلی فرد گذاشتوں کا کفارہ نہ ہو جائے۔ دل کی کیفیت نہیں تبدیل ہو سکتی۔

ان الفاظ میں چاہے جو معنی پوشیدہ ہو۔ مگر دیوپریا کی سمجھ میں یہی آیا کہ یہ میری پچھلی فرد گذاشتوں کے باعث مجھ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس کا حسرت نصیب دل تڑپ اٹھا۔ آہ! یہ اتنے بے رحم ہیں۔ انھیں عفو کا حس تک نہیں تو کیا انھوں نے ان فردگذاشتوں کی سزا دینے ہی کے لیے میری یہ کایا پلٹ کی۔ کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ اس وقت میرے لیے کتنی ترغیبات تھیں۔ کیا انھیں میرے ساتھ اتنی ہمدردی بھی نہیں۔ یہ الفاظ اس کے دل میں تیروں کی طرح چبھنے لگے۔ زندگی سے دل بیزار ہوگیا جس نعمت کا لطف اٹھانے کے لیے اس نے اپنی ریاست ترک کردی تھی۔ بھکارن بن کر جنگل کی پتیاں چنتی تھی۔ وہ اس کے لیے اب بھی ممنوع تھی۔ اپنے پچھلے کارناموں پر اُسے ندامت تھی۔ افسوس تھا لیکن شوہر کے منہ سے یہ بے رحمانہ الفاظ نہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ کیوں نہ یہاں سے چلی جاؤں۔ شوہر سے دور رہ کر شاید وہ زیادہ خوش رہ سکتی تھی۔ دکھتی ہوئی آنکھوں سے تو پھوٹی آنکھیں ہی اچھی!

رات کا وقت تھا۔ مہندر غار کے باہر ایک چٹان پر پڑے ہوئے تھے۔ دیوپریا آکر بولی اب سو رہے ہیں کیا؟

مہندر اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے نہیں۔ سو تو نہیں رہا ہوں۔ میں ایک ایسا آلہ ایجاد کرنا چاہتا ہوں جس سے انسان اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکے۔

دیوپریا۔ میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں جب آپ مجھے ترک کر دینا چاہتے ہیں تو کیوں

ہرش پور یا کہیں اور نہیں بھیج دیتے؟

مہندر نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ میری جان! میں تمھیں ترک نہیں کرنا چاہتا۔ تم ہمیشہ سے میری رفیق زندگی ہو اور ہمیشہ رہوگی۔ تم اپنی حقیقت سے اتنی آگاہ نہیں ہو جتنا میں ہوں۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہو۔ جتنی پہلے تھیں۔ محبت کی بادشاہت میں کوئی چیز ترک کے قابل نہیں، نہ کہ تم۔ جس نے میری زندگی کو منور کردیا ہے۔

دیوپریا یہ محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ سن کر وجد میں آگئی۔ اس کا سارا رنج۔ سارا غصہ اور سارا درد غائب ہوگیا۔ وہ اسی چٹان پر بیٹھ گئی اور مہندر کے گلے میں باہیں ڈل کر بولی۔ تو آپ مجھ سے بولتے کیوں نہیں۔ کیوں مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ شوہر کی الفت ہی عورت کی زندگی کا سہارا ہے۔ اس سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

مہندر نے دردناک لہجہ میں کہا۔ دیوی! بہت اچھا ہوتا کہ تم نے مجھ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا۔ میں جو کچھ کہوں گا۔ اس سے تمھارے دل کو اور بھی صدمہ ہوگا۔ میرے اندر کی آگ باہر نہیں نکلتی۔ اس سے یہ نہ سمجھو کہ وہ جلانا نہیں جانتی۔ آہ! اس لازوال محبت کی یادگاریں ابھی میرے دل میں تازہ ہیں۔ جن کا لطف اٹھانے کا حسن اتفاق مجھے بہت تھوڑے دنوں کے لیے ہوا تھا۔ اسی مسرت کی تمنا مجھے تمھارے دروازہ کا گداگر بناکر لے گئی تھی۔ مگر کیا جانتا تھا کہ زمانہ میرے ارادوں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ جس وقت میں تمھاری طرف آرزو مند نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ تو میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی ہے۔ جب میں تمھیں طلوع سحر کے وقت آنچل میں پھول بھرے روشنی کی بارش کرتے ہوئے آتے دیکھتا ہوں۔ تو میرے دل میں جو ہیجان ہوتا ہے۔ اس کا تم اندازہ بھی نہیں کرسکتیں۔ تمھیں یاد ہے۔ ایک دن میں نے تمھارا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جلتے توے پر ہاتھ پڑگیا۔ اس کا کیا سبب ہے۔ کیوں تقدیر ہم میں جدائی کا پردہ ڈال رہی ہے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ پر میرے دل میں کوئی غیب کی صدا آئی ہے کہ یہ میری ہوس پروری کی صدا ہے۔

عورتوں کی فراست مشہور ہے۔ مہندر کی سمجھ میں جو بات نہ آئی تھی وہ دیوپریا

سمجھ گئی۔ اس دن سے وہ تپسونی بن گئی۔ شوہر کے سایہ سے بھی احتراز کرتی۔ اگر وہ اس کے کمرے میں آجاتے۔ تو ان کی طرف آنکھیں اٹھاکر بھی نہ دیکھتی۔ پر وہ اس حالت میں بھی خوش تھی۔ عورت کا دل خدمت کے لطیف ذروں سے مرکب ہوتا ہے۔ اس کی محبت بھی خدمت ہے۔ اس کی خدمت بھی خدمت ہے۔ یہاں تک کہ اس کا غصہ بھی خدمت ہے۔ دیوپریا نے اپنے دل کے سارے جذبات خدمت کے قربان گاہ پر نثار کردیے۔ اس کی خدمت میں حدوہیں تک تھی۔ جہاں محبت کا آغاز ہوتا ہے اور وہ قسم کھانے کو تیار تھی کہ اس نے شوہر کی محبت کا اتنا ہی لطف اٹھایا ہے جتنا ایک بیوہ اٹھاسکتی ہے۔

ایک دن مہندر نے آکر کہا۔ دیوی چلو آج تمھیں عالم بالا کی سیر کرالاؤں۔ آج میرا ہوائی جہاز تیار ہوگیا۔

مہندر نے یہ جہاز سات برس کی متواتر کوشش سے تیار کیاتھا۔ اس میں یہ صفت تھی کہ باد اور باراں میں بھی مستقل انداز سے اڑا جاتا تھا۔ گویا فطرت کی طاقتوں پر فتح کا نقارہ بجارہا ہو۔ اس پر بیٹھ کر دنیا کی ہر ایک شے کو اس کی حقیقی صورت میں دیکھ سکتے تھے۔ اب تک مہندر نے کبھی دیوپریا سے اس پر بیٹھنے کا اصرار نہ کیا تھا۔ ان کے منہ سے جہاز کے اوصاف سن سن کر اس کا جی تو چاہتا تھاکہ ایک بار اس میں بیٹھ کر سیر کروں۔ پر وہ غلط کر جاتی تھی۔ آج بھی اس نے اپنے اشتیاق کو گویا پتھر کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ آپ جاکر عالم بالا کی سیر کیجیے۔ میں اپنے گوشۂ عافیت میں ہی مگن ہوں۔

مہندر۔ انسانی عقل نے اب تک جتنی ایجادیں کی ہیں۔ کامل ظہور نظر آئے گا۔

دیوپریا۔ آپ جایئے! میں نہیں جاتی۔

مہندر۔ میں آج تمھیں زبردستی لے چلوں گا۔

یہ کہہ کر انھوں نے دیوپریا کا ہاتھ پکڑلیا اور اپنی طرف کھینچا۔ دیوپریا کا دل ڈانواڈول ہوگیا۔ غار کے باہر سونے کی بارش ہورہی تھی آسمان اور زمین پر سنہرا جادو چھایا ہوا تھا۔ جہاز ایک لمحہ میں دونوں سواروں کو لے کر آسمان کی طرف اڑا۔ وہ سیدھا چاند کی طرف چلا جاتا تھا۔ اوپر! اوپر! اور بھی اوپر! یہاں تک کہ چاند کی وسعت اور

آنکھوں کو خیر کردینے والی روشنی دیکھ کر دیو پریا خائف ہوگئی۔
یکایک ایک نغمہ کی صدائے شیریں سن کر چونک پڑی اور بولی۔ یہاں کون گا رہا ہے۔؟۔
مہندر نے مسکرا کر کہا۔ ہمارے سوامی جی ایشور کے حمد کے گیت گارہے ہیں!
جہاز اور بھی اُوپر اڑتا چلا جاتا تھا۔ جو تارے زمین پر سے ٹمٹاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ اب چند رماں کی طرح نورانی ہوگئے تھے اور چندرما اپنی وسعت سے دس گنا بڑا نظر آتا تھا۔ کائنات پر کامل سکون چھایا ہوا تھا۔ صرف دیوپریا کے سینے میں دھڑکن ہورہی تھی۔ وہ کسی نامعلوم خوف سے کانپ رہی تھی۔
تب مہندر نے بینا اٹھائی اور دیوپریا سے بولے۔ پیاری! تمھارا جادو بھرا گانا سنے ہوئے ایک مدت گذر گئی۔ یاد ہے تم نے کب گایا تھا؟ وہی گیت آج پھر گاؤ۔ دیکھو تارے کان لگائے بیٹھے ہیں۔
دیوپریا شوہر کی فرمائش کو نہ ٹال سکی۔ اسے کچھ ایسا گمان ہوا کہ یہ اُن کی آخری فرمائش ہے۔ ان کانوں سے وہ پھر ان کی باتیں نہ سنیں گی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بینا آٹھائی اور ٹھہرائی ہوئی آواز میں گانے لگی۔

پریا ملن ہے کٹھن باوری

حسرت، درد اور یاس میں ڈوبی ہوئی یہ متوالی راگنی سنتے ہی مہندر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ان چند لفظوں میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ان پر بے خودی کا عالم طاری ہوگیا۔ ان کے دل میں ایک بیتاب کن خواہش جس میں جنون کی شدت تھی۔ بیدار ہوگئی۔ وفور شوق سے بیتاب دل نے کہا کہ یہ پابندیاں کب تک، یہ انتظار کب تک، یہ ضبط کب تک، اس زندگی کا بھروسہ ہی کیا۔ نہ جانے کب اس کا خاتمہ ہوجائے اور یہ خون دل سے پلی ہوئی تمنائیں خاک میں مل جائیں!
ایک ہیبت ناک خموشی چھائی ہوئی تھی اور جہاز ہر لحہ اوپر اور اوپر چڑھتا جاتا تھا۔ مہندر نے دیوپریا کا نازک ہاتھ پکڑلیا اور بولے۔ جان من! آج ہمارے فراق کا خاتمہ ہے۔
دیوپریا کے ہاتھوں سے بینا چھوٹ کر گر پڑی۔ اس نے دیکھا مہندر کے بھڑکتے

ہوئے ہونٹ اس کے رخساروں کے پاس آگئے ہیں۔ ان کے تنفس میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کے دونوں ہاتھ مستی سے بھرے ہوئے اُسے آغوش میں لینے کے لیے بڑھے آرہے ہیں۔ دیوپریا ایک لحہ کے لیے صرف ایک لحہ کے لیے سب کچھ بھول گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ مہندر کے گلے میں جاپڑے۔

یکایک دھماکے کی آواز آئی۔ دیوپریا کا کلیجہ دہل اٹھا۔ اُسے معلوم ہوا جہاز تباہ کن سرعت سے نیچے چلاجارہا ہے۔ اس نے اپنے کو مہندر کے آغوش سے علیحدہ کرلیا۔ اور وحشت کی حالت میں بولی۔ پران ناتھ ! پران ناتھ ! کیا ہم تباہی کی طرف جارہے ہیں؟

مہندر نے کچھ جواب نہ دیا۔

دیوپریا نے پھر کہا۔ ایشور کے لیے روکیے۔ میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔

مہندر نے کرب کی حالت میں کہا۔ دیوی! اب اسے روکنا میری قدرت کے باہر ہے۔ میرے جسم میں ایک جمود سا دوڑتا ہوامعلوم ہوتا ہے۔ شاید یہ میری حیات کے آخری لمحے ہیں۔ آہ! میں گرا جارہا ہوں۔

دیوپریا انھیں سنبھالنے چلی تھی کہ مہندر گرپڑے۔ اس نزع کی حالت میں یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے۔ دیوی! ہم اور تم پھر ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ یہ آرزو یہ تشنہ آرزو مجھے پھر تمھارے پاس کھینچ لائے گی۔ غیب کے بے درد ہاتھ بھی اسے نہیں روک سکتے!

دیوپریا کھڑی رورہی تھی۔ اور جہاز تیزی سے نیچے گررہا تھا۔

(35)

چکردھر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ زندگی میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ انھوں نے ایک بیکس کو ایذا پہنچائی تھی۔ جس کی ساری زندگی بیکسوں کی حمایت میں گذری ہے۔ اس میں یہ کایا پلٹ اخلاقی تباہی سے کم نہ تھی۔ اب انھیں محسوس ہوا کہ ثروت نے بالآخر ان کی انسانیت پر فتح پائی۔

وہ تو اس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور اہلیا اپنے آراستہ خواب گاہ میں مخملی

گدے پر لیٹی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اتنے میں شنکدھر لڑکھتا ہوا آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اہلیا نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ بیٹا! ذرا میری گود میں آجاؤ۔

شنکدھر نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ہم نہیں آتے۔

اہلیا۔ دیکھو میں تمھاری اماں ہوں۔

شنکدھر۔ تم اماں نہیں۔ اماں لائی ہے۔

اہلیا۔ کیا میں رانی نہیں ہوں؟

شنکدھر نے اُسے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ تم رانی نہیں۔ اماں لانی ہے۔

اہلیا نے چاہا کہ لڑکے کو پکڑے پر وہ تم لانی نہیں، تم لانی نہیں، کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ بات کچھ نہ تھی۔ لیکن اہلیا نے اس میں کچھ اور ہی معنی بٹھائے۔ اس کی دانست میں یہ بھی منورما کی ایک چال تھی کہ چکردھر نے کمرے میں قدم رکھا۔ انھیں دیکھتے ہی اہلیا ٹھٹھک گئی اور تیوریاں چڑھا کر بولی۔ اب تو رات رات بھر آپ کے درشن نہیں ہوتے۔

چکردھر۔ تمھیں کچھ خبر بھی ہے۔ آدھ گھنٹہ تک جگاتا رہا۔ جب تم نہ جاگیں تو چلا گیا۔ یہاں آکر تم سونے میں مشتاق ہو گئیں۔

اہلیا۔ باتیں بناتے ہو۔ میں بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ اب مجھے ایک اور فکر پیدا ہوئی۔

چکردھر۔ اب تک جتنی فکریں ہیں۔ تب تو تمھاری نیند کا یہ حال ہے۔ یہ نئی فکر پیدا ہوئی۔ تو شاید تمھاری آنکھیں ہی نہ کھلیں۔

اہلیا۔ کیا میں سچ مچ بہت سوتی ہوں؟

چکردھر۔ اچھا ابھی تمھیں اس میں شک بھی ہے؟ گھڑی میں دیکھو آٹھ بج گئے ہیں تم پانچ بجے اٹھ کر کام دھندا کرنے لگتی تھیں۔

اہلیا۔ تب کی باتیں جانے دو۔ اب اتنے سویرے اُٹھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

چکردھر۔ تو کیا تم عمر بھر یہاں مہمان رہو گی؟

اہلیا نے تعجب میں آکر پوچھا۔ اس کا کیا مطلب؟

چکردھر۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں یہاں آئے بہت دن گذر گئے۔ اب اپنے گھر چلنا چاہیے۔

اہلیا۔ اپنا گھر کہاں ہے؟
چکردھر۔ اپنا گھر وہی ہے۔ جہاں اپنے ہاتھوں کی کمائی ہو۔
اہلیا نے کچھ سوچ کر کہا۔ للو کہاں رہے گا؟
چکردھر۔ للو کو یہیں چھوڑ سکتی ہو۔ وہ رانی منورما سے خوب مل گیا ہے۔ تمھاری تو شاید اسے یاد بھی نہ آئے۔
اہلیا۔ اچھا تو اب سمجھ میں آیا۔ اس لیے رانی اُسے اتنا پیار کرتی ہیں۔ یہ بات تم نے خود سوچی ہے یا رانی نے کچھ کہا ہے؟
چکردھر۔ بھلا وہ کیا کہیں گی۔ میں خود یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ تمھارا گھر ہے۔ تم رہ سکتی ہو۔ لیکن میں نے تو یہاں سے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔
اہلیا نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ تم نہ رہوگے۔ تو یہاں رہ کر مجھے کیا لینا ہے۔ جب چاہے چلو! ہاں داداجی سے پوچھ لو۔ مگر اتنا سوچ لو کہ ہم لوگوں کے جاتے ہی یہاں کا سارا انتظام خراب ہوجائے گا۔ رانی منورما کا حال دیکھ ہی رہے ہو۔ روپے کو ٹھیکری سمجھتی ہیں۔ تھوڑے دنوں میں ریاست برباد ہوجائے گی۔ اور ایک دن بچارے للو کو پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔
اہلیا کا دلی منشا ان الفاظ سے صاف ٹپک رہا تھا۔ چکردھر سمجھ گئے کہ اگر میں اصرار کروں تو یہ میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہوجائے گی۔ جب ثروت اور وفا دونوں کا مقابلہ ہوگا تو وہ کس طرف مائل ہوگی۔ اس میں شمہ برابر بھی شک نہ تھا۔ لیکن وہ اُسے سخت آزمائش میں ڈالنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ شنکدھر کو اس سے جدا کردینا اتنا بڑا ستم تھا۔ جو وہ اس پر روانہ رکھتے تھے۔
منورما اس وقت شنکدھر کو لیے باغیچہ کی طرف جاتی ہوئی ادھر سے نکلی۔ چکردھر کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور بولی رات کو سوئے نہیں کیا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔
چکردھر۔ نیند ہی نہیں آئی۔ اسی ادھیڑ بن میں پڑا تھا کہ رہوں یا جاؤں۔
منورما نے متفکر ہوکر پوچھا۔ کب تک لوٹئے گا؟
چکردھر۔ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جلد لوٹنے کاارادہ نہیں ہے۔

رانی نے مسکرا کر کہا۔ مجھے بھی لیتے چلیے۔

چکردھر نے حسرت سے کہا۔ یہ تو ہونا ہی نہیں تھا۔ منورما رانی! تم پہلے بھی میرے لیے دیوی تھیں۔ اب بھی دیوی ہو۔

منورما۔ باتیں نہ بناؤ بابو جی! تم مجھے ہمیشہ دھوکا دیتے آئے ہو اور اب بھی وہی رسم نبھا رہے ہو۔ سچ کہتی ہوں۔ مجھے بھی لیتے چلو۔ اچھا اگر میں راجہ صاحب کو راضی کرلوں۔ تب تو تمھیں کوئی عذر نہ ہوگا۔

چکردھر۔ غیر ممکن۔

منورما۔ کیوں؟

چکردھر۔ بہت سی باتوں کا مطلب بغیر تشریح کے بھی واضح ہوجاتا ہے۔

منورما۔ شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں یہ عیش چھوڑ کر نہ جاسکوں گی۔ اگر ایسا ہے تو آپ نے اب بھی مجھے نہیں سمجھا۔ میں ثروت کے مزے اٹھانے کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔ میں ایشور کو درمیان دے کر کہتی ہوں۔ میں نے کبھی عیش کی غلامی نہیں کی۔ دولت مجھے عزیز ہے لیکن اسی لیے کہ میں اس سے کچھ خدمت کرسکتی ہوں یا خدمت کرنے والوں کی کچھ مدد کرسکتی ہوں۔ سچ کہا ہے۔ مرد کتنا ہی عالم۔ عقلمند اور تجربہ کار ہو۔ عورت کو سمجھنے میں ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔ اہلیا نے کیا فیصلہ کیا؟

چکردھر۔ وہ تو میرے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔

منورما۔ کون۔ اہلیا؟ وہ آپ کے ساتھ نہیں جاسکتیں اور آپ لے گئے تو آج کے تیسرے دن یہاں پہنچانا پڑے گا۔ میں وہی ہوں جو تھی۔ وہ اپنے دن بھول گئیں۔

یہ کہتے ہوئے منورما نے بچے کو گود میں میں اٹھالیا اور خراماں خراماں بغیچہ کی طرف چلی گئی۔ چکردھر کھڑے سوچ رہے تھے۔ کیا واقعی میں نے اُسے نہیں سمجھا۔ دفعتاً انھیں ایک بات یاد آگئی۔ لپک کر منورما کے پاس جاپہنچے۔ اور بولے میں آپ سے ایک عرض کرنے آیا ہوں۔ دھنا سنگھ کے ساتھ میں نے جو بے رحمی کی ہے۔ اس کا کچھ کفارہ کرنا چاہتا ہوں۔

منورما نے مسکرا کر کہا۔ بہت دیر میں اس کی سدھ آئی۔ میں نے اس کی کل جوت معافی کردی ہے۔

چکردھر نے حیرت میں آکر کہا۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی پرستش کردوں تو میں جاکر اُسے اطلاع دے دوں۔

منورما۔ اس ذرا سی بات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ تو آپ نے کب جانے کا فیصلہ کیا ؟

چکردھر۔ آج ہی رات کو۔

منورما نے طنز آمیز تبسم سے کہا۔ ہاں ! اس وقت اہلیا دیوی سوتی بھی ہوں گی۔

ایک لمحہ کے بعد وہ پھر بولی۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو سب کچھ چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلتی۔

یہ کہتے کہتے منورما کا چہرہ شرم کی سرخی سے گلنار ہوگیا۔ جو بات وہ دھیان میں بھی نہ لانا چاہتی تھی۔ وہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہ تیزی سے باغ کی طرف چلی گئی۔ شاید ڈرتی تھی کہ اس کے منہ سے کوئی اور بے موقع بات نہ نکل جائے۔

جیوں جیوں شام قریب آتی تھی۔ چکردھر کا دل تشویش سے دبا جاتا تھا پہلے کہیں باہر جانے میں جو سرگرمی ہوتی تھی۔ اب اس کا نام بھی نہ تھا۔ جانتے تھے کہ چھلکے ہوئے دودھ پر آنسو بہانا بیکار ہے۔ مگر اس وقت بار بار جسودا نندن مرحوم پر غصہ آرہا تھا۔ اگر انھوں نے اس کے گلے میں یہ پھندانہ ڈالا ہوتا تو آج اس کی کیوں یہ حالت ہوتی۔ وہ تو کسی راجہ کی لڑکی سے شادی کرنے کا آرزومند نہ تھا۔ قدرت کو اسی کے ساتھ یہ قاتل مذاق کرنا تھا۔

شام کو وہ راجہ صاحب سے اجازت لینے گئے۔ راجہ صاحب نے چشم پُر آب سے پوچھا۔ آپ دھن کے پکے آدمی ہیں۔ میری کیوں سننے لگے۔ مگر میں اتنا کہہ دیتا ہوں کہ اہلیا رورو کر جان دے دے گی۔ اور اگر آپ شنکدھر کو بھی لے لیے تو میری سونے کی لنکا خاک میں مل جائے گی۔ پھر اس راج کو کون سنبھالے گا۔

چکردھر۔ حکومت میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ پھر تو آپ تو ہیں ہی۔

راجہ۔ تم سمجھتے ہو میں بہت دن جیوں گا۔ سکھی آدمی بہت دن نہیں جیتے۔ مجھے ایسا معلوم ہورہا ہے کہ اب چلنے کے دن قریب ہیں۔ وہ لو۔ شنکدھر تلوار لیے دوڑ آرہا ہے۔ کیوں بیٹا! تلوار کیوں لائے ہو؟

شنکدھر۔ تم کو مان لیں گے۔

راجہ۔ کیوں بھائی! میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟

شنکدھر۔ اماں لانی لوتی ہیں۔ تم نے ان کو مارا ہے۔

راجہ۔ لو صاحب! یہ ایک نیا الزام میرے سر مڑھا جارہا ہے چلو ذرا دیکھوں۔ تمھاری لانی اماں کو کس نے مارا ہے۔

شنکدھر۔ بلی ویل سے لوتی ہے۔

راجہ صاحب فوراً اندر چلے گئے۔ دیکھا تو منورما سچ مچ رورہی ہے۔ بیتاب ہوکر پوچھا۔ کیا بات ہے نورا کیسا جی ہے؟

منورما نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اچھی تو ہوں۔

راجہ۔ تو آنکھیں کیوں لال ہیں؟

منورما۔ اہلیا بابو جی کے ساتھ جارہی ہیں۔ للو کو بھی لے جائیں گے۔

راجہ۔ اہلیا نہیں جاسکتی۔

منورما۔ آپ بابو جی کو کیوں نہیں سمجھاتے۔

راجہ۔ وہ میرے سمجھانے سے نہ مانیں گے۔ انھیں جانے دو۔ مجھے تو بشواس ہے۔ وہ بہت دن باہر نہ رہیں گے۔

منورما کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ بولی۔ وہ اب یہاں نہ آئیں گے۔ آپ انھیں نہیں جانتے۔

ادھر چکردھر نے سوچا۔ اس طرح تو شاید میں یہاں مرکر بھی فرصت نہ پاسکوں۔ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا۔ جب تنہا ہی جانا ہے تو کیا غم۔ اپنے کمرے میں جاکر دو چار کپڑے اور کچھ کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔ کل اتنا ہی سامان تھا۔ جو ایک آدمی آسانی سے ہاتھ میں لٹکائے لیے جاسکے۔

آج انھیں کھانے میں ذرا بھی مزا نہ آیا۔ وہ اہلیا سے بھی نہ ملنا چاہتے تھے

لیکن پھر دل کو سمجھایا۔ میرا اس سے روٹھنا انصاف سے بعید ہے۔ وہ اگر اپنے لڑکے کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کرتی۔ ایسے فاسد خیالات کو دل میں جگہ دینا ہی انھیں شرمناک معلوم ہوا۔

سفر کی تیاری کر کے اور اپنے دل کو سمجھا کر چکردھر نے اپنے خواب گاہ میں آرام کیا۔ تاکہ شبہ بے دست پا ہو جائے۔

اہلیا نے کہا۔ دادا جی تو راضی نہ ہوئے۔

چکردھر نے بات بنائی۔ انھیں ناراض ۔ا تو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اہلیا خوش ہوکر بولی۔ میں شنکدھر کو لے کر چلی جاتی، تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہوجاتا۔

چکردھر نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ نیند کا بہانہ کرنے لگے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلیا سو جائے تو اپنا بقچہ اٹھاؤں اور لمبا ہوجاؤں۔ مگر آج اہلیا کی آنکھوں سے بھی نیند کوسوں دور تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی ذکر چھیڑ کر باتیں کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب آدھی رات سے زیادہ گزر گئی تو چکردھر نے کہا۔ بھائی اب مجھے سونے دو۔ آج تمھاری نیند کہاں بھاگ گئی۔

گرمی کے دن تھے۔ کمروں میں پنکھے چل رہے تھے۔ پھر بھی گرمی معلوم ہوتی تھی۔ روز کواڑ کھلے رہتے تھے۔ آج اہلیا نہ جانے کیوں بہت محتاط ہوگئی تھی۔ سمجھی نہیں جانے والے کو کون روک سکتا ہے؟

رات بھیگ چکی تھی۔ ذرا دیر میں اہلیا سرمست خواب ہوگئی۔ چکردھر کا مہرپذیر دل اہلیا کے اس احتیاط پر بے تاب ہوگیا۔ اس خیال سے ان کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا کہ جب صبح اہلیا انھیں نہ پائے گی، تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ ادھر کچھ دنوں سے اہلیا کو ثروت کے مزے اٹھاتے دیکھ کر چکردھر کو گمان ہونے لگا تھا کہ اس کی محبت میں گرمی باقی نہیں رہی۔ مگر آج اس کا اضطراب دیکھ کر ان کے وہ شبہات فنا ہوگئے۔ جب کوئی چیز ہمارے ہاتھ سے جانے لگتی ہے تب ہمیں اس کی قدر ہوتی ہے۔ اطمینان کی حالت میں ہم عزیز ترین چیزوں کی طرف سے بھی غافل ہوجاتے ہیں۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چکردھر نے اٹھ کر دروازوں کو ٹٹولنا شروع کیا

مگر سمتوں کا اندازہ اتنا خطا کر رہا تھا کہ کبھی سپاٹ دیوار ہاتھ میں آتی، کبھی کوئی کھڑکی، کبھی کوئی میز۔ حافظہ پر زور ڈال رہے تھے کہ میں کس طرف منہ کر کے سویا تھا۔ لیکن عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ آخر انھوں نے دیواروں کو ٹٹول بجلی کا بٹن ڈھونڈ نکالا اور بتی جلادی۔ دیکھا۔ اہلیا خواب نوشیں کے مزے لے رہی ہے۔ کیا حسن تھا۔ جس میں نیند نے اور بھی لطافت اور تازگی بھردی تھی۔

چکردھر کے دل میں آیا کہ اہلیا کو جگادیں اور خوشی خوشی رخصت ہوں۔ چوروں کی طرح جاتے ہوئے انھیں صدمہ ہورہا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ انھیں اگر نکل بھاگنے ہی کی دھن ہوتی تو اس کا کافی موقعہ تھا۔ لیکن اس وقت تعلقات کی زنجیریں سخت پڑتی جارہی تھیں۔ شنکدھر کو ایک بار پیار کرلینے کی خواہش نے انھیں بے تاب کردیا۔ وہ زینے کی طرف چلے۔ اہلیا سوئی تو تھی مگر اسے کھٹکالگا ہوا تھا۔ یہ آہٹ پاتے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا، کہاں بھاگے جارہے ہو؟

چکردھر نے یہ آواز سنی، تو خون سرد ہوگیا۔ اوپر نہ جاکر کمرے میں آگئے اور دلجویانہ انداز سے بولے۔ کیا تمھاری نیند کھل گئی؟

اہلیا۔ میں سوتی کب تھی؟ میں جانتی تھی۔ تم آج جاؤگے۔ تمھارا چہرہ کہے دیتا تھا کہ تم آج مجھ سے دغا کروگے۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں۔ یوں مجھے فریب دے کر تمھیں پچھتانا پڑے گا۔ مجھے راج کی پرواہ نہیں ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ تم اتنے بے رحم ہو۔ مجھے نہ معلوم تھا۔ یہ بدیاتم نے کب سے سیکھی۔ مجھے چھوڑ کر جاتے ہوئے تمھیں ذرا بھی درد نہیں آتا۔

چکردھر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ میرے ساتھ تمھیں بہت تکلیف ہوگی اہلیا! ایشور نے چاہا تو میں جلد ہی لوٹوں گا۔

اہلیا نے درد ناک لہجہ میں کہا۔ میں نے تمھارے ساتھ کون سی تکلیفیں نہیں جھیلیں۔ اور ایسی کون سی مصیبت ہے جو میں نے برداشت نہیں کی۔ میں ثروت کی لونڈی نہیں ہوں کہ ایشور نے جو چیز دی ہے اُسے کیوں چھوڑوں۔

چکردھر۔ اور شنکدھر؟

اہلیا۔ اسے بھی لے چلوں گی۔

چکردھر۔ رانی اُسے جانے دیں گی؟ جانتی ہو۔ راجہ صاحب کا کیا حال ہوگا۔

اہلیا۔ یہ سب تو تم بھی جانتے ہو۔

چکردھر۔ خلاصہ یہ کہ تم مجھے نہ جانے دوگی۔

اہلیا۔ ہاں تو مجھے چھوڑ کر تم نہیں جاسکتے اور نہ میں ہی للو کو چھوڑ سکتی ہوں۔

اوپر کے کمرے منورما کے تھے۔ ان باتوں کی کچھ بھنک ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ بھی ابھی تک نہ سوئی تھی۔ اس نے دربان کو تاکید کردی تھی کہ رات کو چکردھر جانے لگیں تو مجھے اطلاع دینا۔ وہ اپنے من کی دوچار باتیں چکردھر سے کہنا چاہتی تھی۔ وہ نیچے اتری تو اہلیا کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں پڑگئے۔ اس نے دیکھا۔ چکردھر نفس دیوار بنے کھڑے ہیں۔ اُسے خوف ہوا کہ ان ترغیبوں میں پڑکر کہیں وہ اپنے مسلک سے ہٹ نہ جائیں۔ وہ چکردھر کو ایثار کا دیوتا سمجھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ چکردھر کو ثروت کی رتی برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہاں رہنا ان کے لیے مشکل ہے۔ اس نے طے کیا کہ شنکدھر کی محبت میں پڑکر وہ ان کی آزادی میں مخل نہ ہوگی۔ جس لڑکے سے نام کا رشتہ ہونے پر اُسے اتنی محبت ہے۔ اس سے انھیں کتنی محبت ہوگی۔ وہ شنکدھر کے لیے روئے گی تڑپے گی لیکن چکردھر کو بیٹے کی جدائی کے عذاب میں نہ ڈالے گی۔ وہ ان کے چراغ سے اپنا گھر روشن نہ کرے گی۔ دم زدن میں اس نے یہ فیصلہ کیا اور نیچے آکر بولی۔ بابو جی آپ میرا خیال نہ کیجیے۔ للو کو لیتے جائیے۔ آخر آپ کا دل کیسے لگے گا۔ مجھے کون، جیسے پہلے رہتی تھی ویسے ہی پھر رہوں گی۔ ہاں اتنا خیال رکھئے گا کہ کبھی کبھی اسے لاکر مجھے دکھا دیجیے گا۔

یہ کہتے کہتے منورما کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چکردھر نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ وہ بھلا آپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ کیوں جانے لگا۔

منورما۔ یہ میں کیسے کہوں۔ ماں باپ لڑکے کے ساتھ جتنی محبت کرسکتے ہیں اتنی اور کون کرسکتا ہے؟۔

اہلیا تلملا اٹھی۔ شوہر کو روکنے کے لیے اس کے پاس یہی ایک بہانہ تھا۔ وہ نہ جانا چاہتی تھی۔ نہ چکردھر کو جانے دینا چاہتی تھی۔ لیکن جب رانی نے یہ آلہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا تو اسے اندیشہ ہوا کہ اس میں کچھ نہ کچھ راز ضرور ہے۔ ترش ہوکر بولی۔ تو کیا یہ سب دکھاوے کی محبت تھی۔ آپ تو کہتی تھیں یہ میری جان ہے۔ میرالخت جگر ہے۔ کیا ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے سارا سوانگ رچا تھا۔ اب ہم لوگوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر راج کرنا چاہتی ہیں۔ یہ نہ ہوگا۔ داداکو آپ کوئی دوسرا منتر نہ پڑھا سکیں گی۔ اگر آپ نے سمجھ رکھا ہے کہ ان سبھوں کو پھٹکار کر اپنے کسی بھائی بھتیجہ کو یہاں لابٹھاؤں گی تو وہ سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔

یہ کہہ کر اسی طیش کی حالت میں اہلیا راجہ صاحب کے خواب گاہ کی طرف چلی منورما مفلوج سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اہلیا کے ان کلمات سخت نے منورما سے زیادہ چکردھر کو صدمہ پہنچایا۔ منورما دو ایک بار پہلے ہی اہلیا کے منہ سے ایسی باتیں سن چکی تھی اور اس کی عادت سے واقف ہوگئی تھی۔ چکردھر کو ایسی باتیں سننے کا یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔ وہی اہلیا جسے وہ انکسار شرافت اور شرم وحیا کی دیوی سمجھتے تھے۔ دیونی بنی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انھیں اتنا ملال ہوا کہ اسی وقت زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ نہ اس کا منہ دیکھوں اور نہ اپنا دکھاؤں۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ میرے منہ میں کالکھ لگی ہوئی ہے۔ منورما ابھی سر جھکائے کھڑی ہی تھی کہ چکردھر چپکے سے باہر کمرے میں آئے۔ اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور باہر نکلے۔

دربان نے پوچھا۔ سرکار! اس وقت کہاں جارہے ہیں؟

چکردھر نے لاپرواہی سے کہا۔ ذرا میدان کی ہوا کھانا چاہتا ہوں۔ بھیتر بڑی گرمی ہے۔ نیند نہیں آتی۔

دربان۔ میں بھی سرکار کے ساتھ چلوں؟

چکردھر۔ نہیں کوئی ضرورت نہیں۔

باہر آکر چکردھر نے محل کی طرف نظر ڈالی۔ بے شمار کھڑکیوں اور دریچوں

سے بجلی کی شفاف روشنی جھانک رہی تھی۔ انھیں وہ محل ہزاروں آنکھوں والے دیو کی طرح معلوم ہوا کہ وہ ان کی طرف دیکھ کر ہنس رہاہے اور کہہ رہا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارے چلے جانے سے یہاں کسی کو رنج ہوگا۔ یہاں یہی بہار رہے گی۔ یوں ہی چین کی بنسی بجے گی۔ تمھارے لیے کوئی دو بوبند آنسو بھی نہ بہائے گا۔ جو لوگ میرے سایہ میں آتے ہیں۔ ان کی اندرونی آنکھیں اس روشنی میں بے نور ہو جاتی ہیں اور ان کا ضمیر فنا ہو جاتا ہے۔

(36)

پانچ سال گزر گئے۔ پر چکردھر کا کچھ پتہ نہیں۔ پھر وہی گرمی کے دن ہیں۔ دن کو لو چلتی ہے۔ رات کو انگارے برستے ہیں۔ مگر اہلیا کو اب نہ پنکھے کی ضرورت ہے نہ خس کی ٹیٹوں کی۔ اس دکھیا کو اب رونے کے سوا دوسرا کام نہیں ہے۔ تکلف کی کسی چیز سے اُسے رغبت نہیں۔ منورما سے اب اس کا وہ برتاؤ نہیں رہا۔ منورما ہی کیوں، لونڈیوں سے بھی وہ انسانیت سے پیش آتی ہے اور شنکدھر کے بغیر تو اب وہ لمحہ بھر نہیں رہ سکتی۔

شنکدھر اس سے پوچھتا رہتا ہے۔ ماں! بابو جی کب آئیں گے؟ وہ کیوں چلے گئے۔؟ آتے کیوں نہیں؟تم نے ان کو کیوں جانے دیا؟ تم نے مجھے ان کے ساتھ کیوں نہیں جانے دیا۔ تم ان کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئیں؟ اماں! بتاؤ۔ بیچارے وہاں اکیلے پڑے ہوں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ جنگلوں میں گھومتا۔ اماں! انھوں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں؟ رانی اماں کہتی ہیں۔ وہ آدمی نہیں دیوتا ہیں۔ تب تو لوگ ان کی پوجا کرتے ہوں گے۔

اہلیا کے پاس ان سوالات کا جواب رونے کے سوا اور کیا تھا۔ شنکدھر کبھی کبھی بیٹھ کر روتا ہے اور سوچتا ہے۔ بابو جی کے پاس کیسے جاؤں۔ باپ کا ذکر خیر سنتے ہی اس کی طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ وہ روز اپنی دادی کے پاس جاتا ہے اور وہاں ان کی گود میں بیٹھا ہوا چکردھر کا ذکر کر سکتا ہے۔ چکردھر کی کتابوں کو وہ روز الٹتا پلٹتا ہے۔ اور چاہتا ہے، میں بھی بڑا ہو جاؤں اور یہی کتابیں پڑھنے لگوں۔ نرملا دن بھر اس کی

راہ دیکھا کرتی ہے۔ مگر الملیا کے نام سے بھی اُسے نفرت ہوگئی ہے۔ کہتی ہے اسی نے میرے لال کو گھر سے نکالا۔ میرا بھولا بھالا غریب لڑکا اس شوقین عورت کے پنجے میں پھنس کر کہیں کا نہ رہا۔ منشی بجردھر اس سے باربار کہتے ہیں کہ چل جگدیش پور رہو۔ پر اس سے وہ اپنا چھوٹا سا گھر نہیں چھوڑا جاتا۔

منشی جی کو اب ریاست سے ایک ہزار روپیہ وثیقہ ملتا ہے۔ راجہ صاحب نے انھیں ریاست کے کاموں سے سبکدوش کردیا ہے۔ اس لیے اب وہ زیادہ تر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ ذوق شراب تو ثروت کے ساتھ نہیں بڑھا۔ بلکہ اور کم ہوگیاہے لیکن نغمہ سے دلچسپی اور بھی ہوگئی ہے۔ محلّہ میں اب کوئی غریب نہیں رہا۔ منشی جی نے سب کو کچھ نہ کچھ ماہوار باندھ دیا ہے۔ ان کے ہاتھ میں پیسہ کبھی نہیں لٹکا۔ لیکن وہ خیرات سمجھ کر نہیں دیتے۔ یہ اس لیے دیتے ہیں کہ عاقبت میں ثواب ہوگا۔ وہ اس لیے دیتے ہیں کہ عادت ہے یہ بھی ان کا ایک شوق ہے۔ اور اس میں انھیں لطف آتا ہے۔ اس لیے جو کچھ دیتے ہیں، چھپا کر دیتے ہیں۔ وہ اب بھی خالی ہاتھ رہتے ہیں اور روپوں کے لیے منورما کی جان کھاتے رہتے ہیں۔ بگڑ بگڑ کر شکایت نامہ لکھتے ہیں۔ جاکر کھوٹی کھری سنا آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لے ہی آتے ہیں۔ منورما کو بھی شاید ان کی کڑوی باتیں میٹھی لگتی ہیں۔ وہ ان کی فرمائش پوری توکرتی ہے مگر چار باتیں سن کر اتنے پر بھی منشی جی کو قرض لینا پڑتا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے مبارک موقعہ وہ ہوتا ہے۔ جب وہ شنکدھر کو گود میں لیے محلے بھر کے لڑکوں کو مٹھائیاں اور پیسے تقسیم کرتے ہیں۔

ایک دن شنکدھر نو بجے ہی آپہنچا۔ گروسیوک سنگھ بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ حضرت ریاست کے تسلے تھے۔ جس وقت جو کام ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اسی کام پر تعینات کردیے جاتے تھے۔ نرملا اس وقت تلسی کو پانی چڑھا رہی تھی۔ جب وہ پوجا کرکے آئی تو شنکدھر نے پوچھا۔ دادی جی! تم پوجا کیوں کرتی ہو؟

نرملا نے شنکدھر کو گود میں لے کر کہا۔ بیٹا! بھگوان سے مناتی ہوں کہ میری مرادیں پوری کریں۔

شنکدھر۔ بھگوان سب کے دل کی باتیں جانتے ہیں؟

نرملا۔ ہاں بیٹا! بھگوان سب کچھ جانتے ہیں۔

شنکدھر۔ تو تم بھگوان سے کیوں نہیں کہتیں کہ بابو جی کو گھر لے آئیں۔

نرملا۔ بہت کہتی ہوں بیٹا! پر وہ نہیں سنتے۔

دوسرے دن شنکدھر نے بڑے سویرے اشنان کیا۔ لیکن اشنان کر کے وہ ناشتہ کرنے نہ گیا۔ گروسیوک سنگھ کے پاس پڑھنے بھی نہ گیا۔ اہلیا ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کہاں چلا گیا۔ منورما کے پاس آکر دیکھا۔وہاں بھی نہ تھا۔ دونوں گھبرائیں کہ لڑکا نہاکر کہاں چلا گیا۔ چاروں طرف تلاش ہونے گی۔ دونوں بغیچہ کی طرف دوڑی گئیں۔ وہاں پلے سرے پر ایک گوشہ میں اس کی جھلک دکھائی دی۔ دونوں دبے پاؤں وہاں گئیں۔ اور ایک دخت کی آڑ میں کھڑی ہوکر اسے دیکھنے لگیں۔ شنکدھر تلسی کے چبوترے کے سامنے آسن مارے آنکھیں بند کیے دھیان لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کچھ پھول پڑے تھے۔ ایک لمحہ میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ کئی بار چبوترے کا طواف کیا اور گھر کی طرف چلا۔ دونوں عورتیں آڑ سے نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ شنکدھر انھیں دیکھ کر کچھ لجایا۔

منورما نے پوچھا۔ یہاں کیاکرتے تھے بیٹا!

شنکدھر۔ کچھ تو نہیں یوں ہی گھومتا تھا۔

منورما۔ نہیں! کچھ تو کررہے تھے۔

شنکدھر۔ جایئے! آپ سے کیا مطلب؟

اہلیا۔ تمھیں نہ بتادے گا۔ میں تو اس کی اماں ہوں۔ مجھے بتائے گا میرے کان میں کہہ دو بیٹا! میں کسی سے نہ کہوں گی۔

شنکدھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ میں بھگوان سے مناتا تھا کہ بابو جی جلد آجائیں۔

بھولے بچے کی یہ فرزندانہ سعادت مندی دیکھ کر دونوں دیویاں رونے لگیں۔

(37)

ادھر کچھ دنوں سے لونگی تیرتھ کرنے چلی گئی تھی۔ گروسیوک سنگھ اس مذہبی

عقیدت کے باعث تھے۔ اس یاترا کے ثواب میں وہ بھی شریک ہوں گے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تو مشکل ہے۔ پر ان کے والد کو حصہ ملنا یقینی تھا۔ جب سے وہ گئی تھی۔ دیوان صاحب کی نگہداشت کے لیے لونگی کا گھر میں رہنا ضروری ہے۔ ان کا ذوق مے نوشی روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ کھانا وہ بہت ہی کم کھاتے تھے۔ لونگی ان کا خورش کا معقول انتظام کرتی رہتی تھی۔ فرائض زوجیت کا وہ زریں اصول جو چالیس سال کی عمر کے بعد شوہر کی شکم پروری کا حامی ہے، ہمیشہ اس کے پیش نظر رتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی گھوڑے اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ صرف انھیں راتب ملنا چاہیے۔ ٹھاکر صاحب کو اب لونگی کے نام سے بھی نفرت ہے۔ اسے خطوں میں لکھا کرتے ہیں۔ تم نے میری زندگی خراب کردی۔ میری دنیا اور آخرت دونوں ہی گذاردی۔ شاید لونگی کو جلانے ہی کے لیے ٹھاکر صاحب سبھی کام لونگی کی مرضی کے خلاف کرتے تھے۔ اور اسے اس کی اطلاع بھی دے دیتے تھے۔ آخر یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ اب تمھارے یہاں آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری بہو تم سے کہیں اچھی خدمت کرتی ہے۔ ہر ایک خط میں وہ اپنی صحت کا چرچہ ضرور کرتے تھے۔ ان کا ہاضمہ اب صحیح ہوگیا تھا۔ خون کے بڑھ جانے سے جتنے امراض بڑھ جاتے ہیں ان کا اب کوئی اندیشہ نہ تھا۔

دیوان صاحب کا ہاضمہ صحیح ہوگیاہو۔ پر عقل ضرور کمزور ہوگئی تھی۔ وہ اب ایسی ایسی غلطیاں کرتے تھے کہ راجہ صاحب کوان کا بہت لحاظ کرنے پر بھی بار بار تنبیہ کرنی پڑتی تھی۔ وہ مستعدی، وہ دانائی، وہ معاملہ فہمی جس نے انھیں چپراسی سے دیوان بنایا تھا۔ اب ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ گروسیوک سنگھ کو بھی شاید اب معلوم ہونے لگا ہے کہ والد کی آڑ میں کوئی دوسری ہی طاقت ریاست کا انتظام کرتی تھی۔

ایک دن انھوں نے دیوان صاحب سے پوچھا۔ لونگی کب تک آویں گی؟

دیوان صاحب نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ اس کے یہاں آنے کی توکوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اسی دن بھائی بہن میں بھی اس معاملہ پر گفتگوہوئی۔ منورما نے کہا۔ بھیا! کیا تم نے لونگی اماں کو بلا نہیں لیا۔ بابوجی کی حالت دیکھ رہے ہو کہ نہیں۔

گروسیوک۔ کھانا تو کھاتے نہیں۔ کوئی کیا کرے۔ جب دیکھو۔ شراب۔ جب دیکھو شراب۔

منورما۔ اس کی روک تھام لونگی ہی کر سکتی ہے۔ اس کو بلانا ہوگا اور بہت جلد۔

گروسیوک۔ تو میرا کیا اختیار ہے۔ بار بار کہتا ہوں بلالیجیے۔ مگر سنتے ہی نہیں اُلٹے اسے چڑھانے کو اور لکھ دیتے ہیں۔ یہاں تمھارے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک ضدن ہے۔ اس طرح کیوں آنے لگی۔

منورما۔ نہیں بھیا! وہ لاکھ ضدن ہو۔ لیکن دادا پر جان دیتی ہے۔ وہ صرف تمھارے خوف سے نہیں آرہی ہے۔ تیرتھ یاترا پر اس کا اعتقاد کبھی نہ تھا وہاں رورو کر اس کے دن کٹ رہے ہوں گے۔

گروسیوک۔ نورا میں سچ کہتا ہوں۔ میں دل سے چاہتا ہوں وہ آجائے۔ مگر سوچتا ہوں۔ جب دادا جی اُسے منع کرتے ہیں۔ تو میرے بلانے سے کیوں آنے لگی۔

منورما۔ تم سمجھتے ہو دادا جی اسے منع کرتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر بھی ایسا کہتے ہو۔ جب سے اماں جی کا انتقال ہوا۔ لونگی نے دادا پر حکومت کی ہے۔ میں نے کسی بیاہتا عورت میں یہ شوہر پروری نہیں دیکھی۔ اگر دادا کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو جاکر لونگی اماں کو اپنے ساتھ لاؤ۔

گروسیوک۔ میرا جانا تو بہت مشکل ہے نورا!

منورما۔ کیوں۔ کیا اس میں آپ کی توہین ہوگی؟

گروسیوک۔ وہ سمجھے گی آخر انھیں کو غرض پڑی۔ آکر اور سر چڑھ جائے گی۔

منورما۔ بھیا! ایسی اوچھی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ لونگی دیوی ہے۔ تمھاری یہ بدگمانی دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔

گروسیوک۔ میں اب اس سے کبھی نہ بولوں گا۔ اس کی کسی بات میں بھول کر بھی دخل نہ دوں گا۔ لیکن اسے بلانے نہ جاؤں گا۔

منورما۔ اچھی بات ہے۔ تم نہ جاؤ۔ لیکن میرے جانے میں تو تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟

گروسیوک۔ تم جاؤ گی؟

منورما۔ کیوں میں کیاہوں؟ کیا میں بھول گئی ہوں کہ لونگی اماں ہی نے مجھے اپنا دودھ
پلاکر پالا ہے۔ اگر وہ اس گھر میں آکر رہتی۔ تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے
پیر دھوتی، اور چرنا مت آنکھوں سے لگاتی۔
گروسیوک شرمندہ ہوگئے۔ گھر جاکر انھوں نے دیکھا کہ دیوان صاحب لحاف
اوڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا۔ آپ کی کسی طبیعت ہے؟
دیوان صاحب کی لال آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولے کچھ نہیں جی۔ ذرا
سردی لگ رہی تھی۔
گروسیوک۔ آپ کی منشا ہو۔ تو میں جاکر لونگی کو بلالاؤں۔
ہری سیوک۔ تم! نہیں تم اُسے بلانے کیا جاؤگے۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ایسی کہاں کی
امیر زادی ہے۔
گروسیوک۔ نورا آج بہت ناراض ہورہی تھی۔ وہ خود اُسے بلانے جارہی ہے۔
ہری سیوک آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔ نورا جانے کو کہتی ہے؟ نہیں میں
اُسے نہ جانے دوں گا۔ لونگی کو بلانے نورا نہیں جاسکتی۔
گروسیوک کیا جانتے تھے۔ ان الفاظ میں کیا معنی چھپے ہوئے ہیں۔ وہاں سے چلے
گئے۔
دوسرے دن دیوان صاحب کو بخار ہو گیا۔ بخار اتنی شدت کا تھا کہ گروسیوک
نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلایا۔ منورما بھی خبر پاتے ہی دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے آتے ہی
آتے گروسیوک سے کہا۔ میں نے آپ سے کل ہی کہا تھا۔ جاکر لونگی اماں کو بلا
لائیے۔ لیکن آپ نہ گئے۔
گروسیوک۔ میں تو جانے کو تیار تھا۔ لیکن جب کوئی جانے بھی دے۔ دادا سے پوچھا۔
تو وہ مجھی کو بے وقوف بنانے لگے۔
منورما۔ تمھیں ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کی حالت کیا دیکھ نہیں رہے
ہو۔ اب بھی موقعہ ہے۔ تم اسی گاڑی سے چلے جاؤ اور اُسے ساتھ لاؤ۔
دیوان صاحب منورما کو دیکھ کر بولے۔ آؤ نورا مجھے آج بخار آگیا۔ گروسیوک
کہہ رہا تھا کہ تم لونگی کو بلانے جارہی ہے۔ بیٹی!اس میں تمھاری توہین ہے۔ بھلا تم

اسے بلانے جاؤگی تو دنیا کیا کہے گی۔
منورما۔ دنیا جو چاہے کہے۔ میں نے بھیا کو بھیج دیا۔
ہری سیوک۔ سچ؟ یہ تم نے کیا کیا؟ لونگی کبھی نہ آئے گی۔
منورما۔ آئے گی کیوں نہیں۔ نہ آئے گی تو میں جاکر اُسے مناؤں گی۔

ہری سیوک کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اُٹھا۔ بجھی ہوئی آنکھیں جگمگا اُٹھیں۔ خوش ہو کر بولے۔ نورا سچ مچ رحم کی پتلی ہو۔ دیکھو اگر لونگی آئے اور میں نہ رہوں تو اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس نے میری بڑی خدمتیں کی ہیں۔ میں کبھی اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ میں چاہوں تو اپنی ساری جائداد اس کے نام لکھ سکتا ہوں۔ یہ سب جائداد میری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔ لیکن وہ چڑیل میری جائداد کا ایک تنکا بھی نہ چھوئے گی۔ وہ صرف عزت کی بھوکی ہے۔ کوئی اس سے عزت کے ساتھ بولے اور لوٹ لے۔ وہ اس گھر کی مالکن بن کر بھوکوں مرجانا پسند کرے گی لیکن خادمہ بن کر سونے کا لقمہ بھی نہ کھائے گی۔ گروسیوک نے آج تک اُسے نہ پہچانا۔ نورا جس دن سے وہ گئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے جسم کی روح ہی غائب ہوگئی۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی بھروسہ نہیں رہا۔ تمھیں اپنے بچپن کی یاد آتی ہے۔
منورما۔ بہت پہلے کی باتیں تو یاد نہیں ہیں۔ لیکن اپنے بیماری کی یاد ہے۔

ہری سیوک نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ اس سے پہلے کا ذکر ہے نورا۔ جب گروسیوک تین سال کا تھا اور تمھاری اماں تمھیں سال بھر کی چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں۔ اس حالت میں اسی لونگی نے میری جان بچائی۔ میں اس کے حسن اور شباب پر فریفتہ نہ تھا۔ تمھاری ماں کے بعد کس کا حسن مجھے فریفتہ کرسکتا تھا۔ مجھے لونگی کی بے غرض خدمت اور جاں نثاری نے موہ لیا۔ تمھاری ماں بھی تم دونوں بھائی بہن کی پرورش اتنے دل وجان سے نہ کرسکتی۔ گروسیوک کی بیماری کی یاد تمھیں کیا آئے گی۔ خون کے دست آتے تھے اور تل تل پر۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ روتا تو اس طرح گویا کراہ رہا ہو۔ یہ لونگی ہی تھی۔ جس نے اُسے موت کے منہ سے نکال لیا۔ کوئی ماں اپنے بچے پر اس

طرح جان نہ دیتی اور آج گروسیوک اُسے گھر سے نکال رہا ہے سمجھتا ہے کہ لونگی کسی
لالچ سے مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ احمق یہ نہیں سوچتا کہ جس وقت لونگی اس کی ہڈیاں
لے کر رویا کرتی تھی تو دولت کہاں تھی۔ سچ پوچھ تو یہاں لکشمی بھی لونگی کے ساتھ
ہی آئی۔ بلکہ لکشمی لونگی ہی کے شکل میں آئی۔ کیوں نورا میرے سرہانے کون کھڑا
ہے۔ کوئی باہری آدمی ہے۔ کہہ دو یہاں سے چلا جائے۔

منورما۔ یہاں تو میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

ہری سیوک۔ طبیعت گھبرا رہی ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کہیں درد نہیں، بس ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ چراغ میں تیل نہیں رہا۔ گروسیوک شام تک پہنچ جائے گا۔

منورما۔ ہاں کچھ رات جاتے جاتے پہنچ جائیں گے۔

ہری سیوک۔ کوئی تیز موٹر ہو تو میں شام تک پہنچ جاؤں۔

منورما۔ اس حالت میں اتنا لمبا سفر آپ کیسے کرسکتے ہیں؟

ہری سیوک۔ ہاں ! یہ ٹھیک کہتی ہو بیٹی! لیکن میری دوا لونگی ہی کے پاس ہے۔ اس
ستی کا کیسا اقبال تھا۔ جب تک وہ رہی ہے۔ میرے سر میں کبھی درد نہیں ہوا۔
میری حماقت دیکھو کہ جب اس نے تیرتھ جاترا کی خواہش ظاہر کی تو میرے
منہ سے ایک بار بھی نہ نکلا۔ مجھے کس پر چھوڑ جاتی ہو۔ اگر میں یہ کہہ سکتا تو
وہ کبھی نہ جاتی۔ ایک بار بھی نہیں روکا۔

یہ کہتے کہتے دیوان صاحب پھر چونک پڑے اور دروازے کی طرف خوف
آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ یہ کون اندر آگیا نورا! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیٹا ہوا
مزے سے باتیں کررہا ہوں۔

منورما نے امنڈنے والے آنسوؤں کو نگل کر پوچھا۔ کیا آپ کا جی پھر گھبرا
رہاہے؟

ہری سیوک۔ وہ کچھ نہیں تھا نورا! میں نے اپنی زندگی میں اچھے کام بہت کم کیے اور
برے کام بہت۔ اچھے کام جتنے کیے وہ لونگی نے کیے۔ برے کام جتنے کیے وہ
میرے ہیں۔ ان کی سزا کا سزاوار میں ہوں۔ لونگی کے کہنے پر چلتا تو آج فرشتہ
ہوتا۔ ایک بات تم سے پوچھوں نورا بتاؤ گی؟ تم اپنے مقدر سے خوش ہو؟

منورما۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ کیا میں نے آپ سے کبھی شکایت کی ہے؟
ہری سیوک۔ نہیں نورا! تم نے کبھی شکایت نہیں کی اور نہ کروگی۔ لیکن میں نے تمھارے اوپر جو ستم کیا ہے۔ اس کا صدمہ آج میرے دل کو بے تاب کررہا ہے۔ میں نے تمھیں اپنے حرص کا شکار بنایا۔ لونگی نے کتنی مخالفت کی۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ ہوس نے مجھے اندھا بنادیا تھا۔ پھر جی ڈوبا جاتا ہے۔ شاید اس دیوی کے درشن نہ ہوں گے۔ تم اس سے کہہ دینا نورا کہ یہ خود غرض کمینہ بے وقوف آدمی آخر دم تک اس کی یاد میں تڑپتا رہا۔

منورما نے رو کر کہا۔ دادا! آپ ایسی باتیں کررہے ہیں؟ لونگی اماں کل شام تک آجائے گی۔

ہری سیوک ہنسے۔ وہ بولے، رونق ہنسی جو ساری زندگی کی آرزوؤں اور تمناؤں کو حقیر سمجھتی ہے۔ پھر مشتبہ انداز سے بولے۔ کل شام تک؟ شاید!

منورما آنسوؤں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھی۔ اس کو اس بچپن کے گھر میں بھی آج ایک دہشت سی معلوم ہورہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب کی روشنی زرد ہوگئی ہے۔ گویا فطرت کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔

دیوان صاحب چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے۔ گویا ان کی آنکھیں اسباب کے اس پار پہنچ جانا چاہتی ہیں۔ یکایک انھوں نے کہا۔ ذرا قلم دوات لے کر میرے قریب آجاؤ۔ نورا! کوئی اور تو یہاں نہیں ہے؟ میری وصیت لکھ لو۔ گروسیوک کی لونگی سے نہ بنے گی۔ میرے بعد وہ اُسے ستائے گا۔ میں اپنی سب جائداد لونگی کو دیے جاتا ہوں۔ جائداد کے لالچ سے گروسیوک اس سے دبے گا۔ یہ وصیت تم اپنے پاس رکھنا۔ ضرورت پڑنے پر اس سے کام لینا۔

منورما اندر جاکر رونے لگی۔ اس کی بھابی اُسے روتے دیکھ کر گھبرائی ہوئی آکر دیوان صاحب کے آگے کھڑی ہوگئی۔ کمرے میں وہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جس کی تفسیر ہوا میں لکھی ہوتی ہے۔ اس نے دیوان صاحب کے پیروں پر سر رکھ دیا اور رونے لگی۔ دیوان صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیٹی! یہ میرا آخری وقت ہے گروسیوک کے آنے تک کیا ہوگا، نہیں جانتا۔ میرے بعد لونگی بہت دن زندہ رہے

گی۔ اس کا دل نہ دکھانا۔ میری تم سے یہی درخواست ہے جو کچھ کرنا اس کی صلاح سے کرنا۔ وہ اسی میں خوش ہوگی۔

یہ کہتے کہتے دیوان صاحب کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ کئی منٹ کے بعد وہ چونک پڑے اور منتظر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔ ابھی نہیں آئی۔ اب ملاقات نہ ہوگی۔

منورما نے روکر کہا۔ دادا جی مجھے بھی کچھ کہتے جایئے۔ میں کیا کروں؟

دیوان صاحب نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا۔ لونگی کو دیکھو!

تھوڑی دیر میں راجہ صاحب آپہنچے۔ اہلیا بھی ان کے ساتھ تھی۔ منشی بجردھر کو بھی اڑتی ہوئی خبر ملی۔ دوڑے آئے۔ ریاست کے صدہا ملازم جمع ہوگئے مگر دیوان صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔

شام ہوگئی تھی۔ سب لوگ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ درودیوار پر موت کا رعب چھایا ہوا تھا۔ سبھی کو تعجب ہورہا تھا کہ اتنی جلدی یہ کیاہوگیا۔ ابھی کل شام تک تو بھلے چنگے تھے۔ دیوان صاحب بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ مگر آنسوؤں کی دھاریں بہہ بہہ کر رخساروں کو ترکررہی تھیں۔ اس حسرت کاکون اندازہ کرسکتا ہے۔

یکایک دروازے پر ایک بگھی آکر رُکی۔ اور اس میں سے ایک عورت اُتر کر گھر میں داخل ہوئی۔ شور مچ گیا۔ آگئی! آگئی! یہ لونگی تھی۔ اتنے آدمیوں کو جمع دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی اور لوگ ہٹ گئے۔ صرف منورما، اس کی بھابی اور اہلیا رہ گئی۔ لونگی نے دیوان صاحب کے سر پر ہاتھ رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پران ناتھ! کیا مجھے اکیلے چھوڑ جاؤگے؟

دیوان صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان آنکھوں میں درد اور محبت کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کرکہا۔ اور پہلے کیوں نہ آئیں۔

لونگی نے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں اپنا سر رکھ دیا اور اس ہیجان قریب المرگ ہستی کے آغوش میں اسے اس روحانی تقویت، اعتماد اور آسودگی کا احساس ہوا جس سے اب تک وہ ناآشنا تھی۔ اس لذت درد میں وہ اپنا غم بھول گئی۔ ۲۵ سال کے سہاگ میں اُسے کبھی راحت نہ حاصل ہوئی تھی۔ اسے ہمیشہ بدگمانیوں کا شکار بنتا

پڑتا تھا۔ ہمیشہ یہ اندیشہ ہوتا رہتا تھا کہ دیکھیں یہ ڈونگی پار لگتی ہے یا منجدھار میں ڈوب جاتی ہے۔ ہوا کا ایک بلولہ سا جھونکا، موجوں کا ہلکا سا تلاطم، کشتی کی ہلکی سی لرزش اس کی روح فنا کر دیتی تھی۔ آج اس سارے کوفت اور خلش کا خاتمہ ہوگیا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ جس کے قدموں پر میں نے اپنے کو نثار کیا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں میں نے اپنی تقدیر سونپی تھی۔ وہ آخر دم تک میرا رہا۔ یہ غمناک تسکین بھی کتنی حیات بخش اور کتنی سکون انگیز تھی۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ لاش ابھی تک گروسیوک کے انتظار میں پڑی ہوئی تھی۔ رونے والے رو دھو کر چپ ہوگئے تھے۔ لونگی اس کے سرہانے اس طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا اس کے جاگ اٹھنے کی منتظر ہو۔ اور منورما بیٹھی دیوان صاحب کے آخری لفظوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ لونگی کو دیکھو!

(38)

جگدیش پور کے ٹھاکر دوارے میں اکثر سادھو مہاتما آتے رہتے تھے۔ شنکدھر ان کے پاس جا بیٹھتا۔ اور ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا۔ اس کے پاس چکردھر کی جو تصویر تھی۔ اس سے ان کی صورت کا مقابلہ کرتا۔ پر اس شکل کا کوئی سادھو اُسے نہ دکھائی دیتا تھا۔

ایک دن منورما کے ساتھ شنکدھر بھی لونگی کے پاس گیا۔ لونگی بڑی دیر تک اپنی تیرتھ یاترا کا سرگذشت سناتی رہی۔ شنکدھر نے اس کی باتیں غور سے سننے کے بعد پوچھا۔ کیوں دائی تمھیں سادھو سنیاسی بہت سے ملے ہوں گے؟ لونگی نے کہا۔ ہاں بیٹا! ملے کیوں نہیں۔ ایک مہاتما تو ایسے ملے کہ تمھارے بابو جی سے ہو بہو صورت ملتی تھی۔

شنکدھر نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔ جٹا بڑی بڑی تھی؟

لونگی۔ نہیں۔ جٹا وٹا تو نہ تھی۔ کپڑے وہی گیروے رنگ کے تھے۔ ہاں! کمنڈل لیے ہوئے تھے۔ جتنے دنوں میں جگن ناتھ پوری میں رہی وہ ایک بار روز میرے پاس آکر پوچھ جاتے۔ کیوں ماتا جی! آپ کو کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے؟ اور یاتریوں

سے بھی وہ یہی سوال پوچھتے تھے۔ جس دھرم شالہ میں میں ٹھہری تھی۔ اسی میں ایک دن ایک یاتری کو ہیضہ ہوگیا۔ سنیاسی جی اُسے اٹھواکر ہسپتال لے گئے اور اس کی دوا دارو کروائی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی امیر آدمی ہے۔ جس یاتریوں کے پاس کرایہ کے روپے نہ ہوتے۔ ان کی مدد کرتے تھے۔ نورا! تم سے کیا کہوں، بابو جی سے بالکل صورت ملتی تھی۔ میں نے نام پوچھا۔ تو سیوانند بتایا۔ مکان پوچھا۔ تو مسکراکر بولے۔ سیوانگر۔ ایک دن میں نے ان کی دعوت کی۔ جب وہ کھانے بیٹھے تو میں نے یہاں کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان باتوں سے ان کے دِل میں کیا اثر ہوتا ہے۔ مگر انھوں نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ چپ چاپ کھاکر چلے گئے۔ اس دن سے وہاں پھر نہ دکھائی دیے۔ اوروں سے پوچھا تو معلوم ہوا۔ رامیشور چلے گئے۔

شنکدھر نے پوچھا۔ تم نے یہاں تار کیوں نہ دے دیا؟ ہم لوگ وہاں پہنچ جاتے۔

لونگی۔ ارے تو کوئی بات بھی ہو بیٹا! بغیر جانے بوجھے کیا تار دیتی؟

منورما۔ مان لو وہی ہوتے تو کیا تم سمجھتے ہو وہ ہمارے ساتھ آتے، کبھی نہیں۔ آنا ہوتا تو جاتے ہی کیوں۔

شنکدھر۔ کس بات پر ناراض ہوکر چلے گئے رانی اماں! کوئی نہ کوئی بات تو ہوئی ہوگی۔ اماں سے پوچھتاہوں تو رونے لگتی ہیں۔ تم سے پوچھتا ہوں تو تم بتائی ہی نہیں۔

منورما۔ میں کسی کے دل کی بات کیاجانوں بیٹا! کسی سے کچھ کہا سنا تھوڑا ہی۔

شنکدھر۔ اچھا دائی تمھارے خیال میں سنیاسی جی کی عمر کیا رہی ہوگی؟

لونگی۔ میں تو سمجھتی ہوں۔ ان کی عمر ۴۰ برس کی ہوگی!

شنکدھر نے کچھ حساب کرکے کہا۔ یہی تو بابو جی کی بھی عمر ہوگی۔

منورما نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ ہاں۔ ہاں! وہی سنیاسی تمھارے بابو جی ہیں۔ اب مانا۔ ابھی ان کی عمر ۴۰ برس کیسے ہوجائے گی۔

شنکدھر سمجھ گیا کہ منورما کو یہ ذکر برا لگتاہے۔ اس کے متعلق پھر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ لیکن وہاں رہنا اب اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ رامیشور کاحال تو اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ لیکن اس کی کتابی واقفیت سے اسے اطمینان نہ ہوا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ رامیشور کو کون ریل جاتی ہے۔ وہاں لوگ جاکر ٹھہرتے کہاں ہیں۔ گھر

کے کتب خانے میں شاید ایسی کوئی کتاب مل جائے۔ یہ سوچ کر وہ باہر آیا اور شوفر سے بولا۔ مجھے گھر پہنچا دو۔ شوفر نے پہلے تو بہانہ کیا۔ لیکن جب شنکدھر نے اصرار کیا تو مجبور ہوگیا۔

گھر آکر وہ کتب خانہ میں جا ہی رہا تھا کہ گروسیوک سنگھ مل گئے! آج کل یہ حضرت دیوانی کی منصب کے لیے زور لگا رہے تھے۔ ہر ایک کام بڑی مستعدی سے کرتے۔ مگر معلوم نہیں کیوں راجہ صاحب ان سے بدظن تھے۔ منورما کہہ چکی۔ اہلیا نے بھی سفارش کی۔ مگر راجہ صاحب ابھی تک ٹالتے جاتے تھے۔ شنکدھر انھیں دیکھتے ہی بولا۔ ماسٹر صاحب! مہربانی کرکے مجھے کتب خانہ سے کوئی ایسی کتاب نکال دیجیے جس میں تیرتھ استھانوں کا پورا پورا حال ہو۔

گروسیوک نے کہا۔ ایسی تو کوئی کتاب کتب خانہ میں نہیں ہے۔

شنکدھر وہیں سے لوٹ پڑا اور ایک موٹر تیار کراکر شہر جا پہنچا۔ ابھی اس کا تیرھواں ہی سال تھا۔ لیکن اس کے اطوار میں اتنا استحکام تھا کہ جو بات دل میں ٹھان لیتا اُسے پورا کرکے ہی چھوڑتا۔ شہر جاکر اس نے انگریزی کتابوں کی کئی دکانوں میں کئی کتابیں خریدیں اور گھر چلا، تو کتابوں کا ایک گٹھڑا اس کے ساتھ تھا۔

راجہ صاحب خاصے پر بیٹھے تو شنکدھر وہاں نہ تھا۔ اہلیا نے جاکر دیکھا تو وہ کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ بولی چل کر کھانا کھالو۔ دادا جی بلا رہے ہیں۔

شنکدھر نے بھوک کا بہانہ کیا۔ اہلیا سمجھ گئی۔ کسی کتاب میں اس کا جی لگا ہوا ہے آکر اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب اٹھالی اور دو چار سطریں پڑھ کر بولی۔ اس میں تو تیرتھوں کا حال لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب کہاں سے لائے؟

شنکدھر نے کہا۔ آج ہی تو بازار سے لایا ہوں۔ دائی کہتی تھیں کہ بابو جی کی صورت کا کوئی سنیاسی انھیں جگن ناتھ پوری میں ملا تھا۔ اور وہاں سے رامشور چلا گیا۔

لڑکے کی یہ فرزندانہ محبت دیکھ کر اہلیا کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ آہ میرے لال! تونے باپ کی صورت بھی تو نہیں دیکھی۔ تجھے تو اتنا بھی یاد نہیں کہ کب ان کی گود میں بیٹھا تھا۔ کب ان کے منہ سے پیار کی باتیں سنی تھیں۔ پھر بھی تجھے ان سے اتنی محبت ہے۔ اور وہ اتنے سنگ دل ہیں کہ سدھ ہی نہیں لیتے۔ اگر مجھ

سے ناراض ہیں تو تو نے کون سی خطا کی ہے۔ کیا میرے کارن تو بھی ان کی نظروں سے گر گیا۔ پران ناتھ! تمھیں کیا معلوم کہ جس بیٹے کی طرف سے تم نے دل پتھر کرلیا ہے وہ تمھارے نام کی مالا پھیر رہاہے۔ تمھاری مورتی کی پوجا کرتا ہے۔

اہلیا نے شنکدھر کو سینے سے لگالیا اور آنسوؤں کی یورش کو روکتی ہوئی بولی۔ یہ کتاب پھر دیکھنا۔ اس وقت چل کر کچھ کھالو!

شنکدھر۔ اچھا کھالوں گا اماں! کسی سے بھجوادو۔ تم کیوں آؤ گی۔

اہلیا ایک لمحہ میں ایک چھوٹی سی تھالی میں اس کا کھانا لے کر آئی اور شنکدھر کے سامنے بیٹھ گئی۔

شنکدھر کو بھوک تو تھی۔ پر آج جب اُسے معلوم ہوگیا کہ چکردھر سنیاسی ہوگئے ہیں تو یہ پر تکلف کھانا کیسے کھاتا۔ اب تک اُسے تحقیق طور پر ان کا حال نہ معلوم تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کسی دوسری جگہ آرام سے ہوں گے۔ آج لونگی کی باتوں نے اس کے دل میں ایک تشویش پیدا کردی تھی۔ ایسی حالت میں یہاں کے عیش وآرام کا لطف اٹھانا وہ فرزندانہ سعادت مندی کے خلاف سمجھنے لگا۔ اس لیے اس نے اہلیا سے کہا تھا کہ کھانا کسی کے ہاتھ بھجوادینا۔ تم نہ آنا۔ اب یہ تھالی دیکھ کر وہ مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ اگر نہیں کھاتا، تو اہلیا کو رنج ہوتا ہے۔ کھاتا ہے تو لقمہ منہ میں نہیں جاتا۔ اسے خیال آیا۔ میں یہاں چاندی کے تھال میں انواع واقسام کی نعمتیں کھانے بیٹھا ہوں۔ اور بابوجی پر اس وقت نہ جانے کیا گذر رہی ہوگی۔ بے چارے کسی درخت کے نیچے پڑے ہوں گے۔ نہ جانے آج کچھ کھایا بھی یا نہیں۔ وہ تھالی پر بیٹھا لیکن لقمہ اٹھاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اہلیا اس کے دل کی کیفیت سمجھ گئی۔ اور خود بھی رونے لگی۔ کون کسے سمجھاتا۔

آج سے اہلیا کو ہمیشہ یہی اندیشہ رہنے لگا کہ شنکدھر کہیں باپ کی تلاش میں کہیں بھاگ نہ جائے۔ وہ اسے تنہا گھر سے نہ جانے دیتی۔ اس کا بازار آنا جانا بھی بند کردیا۔ گھر کے سبھی آدمیوں سے تاکید کردی کہ شنکدھر کے سامنے اس کے باپ کا ذکر نہ کریں۔ یہ خوف کسی ہیبت ناک جانور کی طرح ہمیشہ اس کے سامنے گھورا کرتا کہ کہیں شنکدھر کو باپ کے ترک وطن کا حقیقی سبب معلوم ہوجائے۔ نہیں تو پھر

اُسے کون روکے گا۔

اسے اب ہردم یہی پچھتاوا ہوتا رہتا کہ وہ شنگدھر کو کیوں نہ شوہر کے ساتھ لے کر چلی گئی۔ ثروت کی ہوس میں شوہر کو پہلے ہی کھو بیٹھی تھی۔ کہیں بیٹے کو بھی نہ کھو بیٹھے۔

(39)

ٹھاکر ہری سیوک سنگھ کے آخری مراسم سے فرصت پانے کے بعد ایک دن لونگی نے اپنے کپڑے لتے باندھنے شروع کیے۔ اس کے پاس روپے پیسے جو کچھ تھے سب گروسیوک کو سونپ کر بولی۔ بھیا! میں اب کسی گاؤں میں جاکر رہوں گی۔ یہاں مجھ سے نہیں رہا جاتا۔

فی الواقعہ لونگی سے اب اس گھر میں نہ رہا جاتا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز اُسے کاٹنے دوڑتی تھی۔ 25 برس تک اس راج کی رانی رہنے کے بعد اب وہ کسی کی دستِ نظر نہ بن سکتی تھی۔ سب کچھ اسی کے ہاتھوں کا کیا ہوا تھا۔ مگر اب اس کا نہ تھا۔ بیوگی کے رنج کے ساتھ یہ خیال کہ میں کسی دوسرے کے روٹیوں پر پڑی ہوں۔ اس کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ حالانکہ گروسیوک اب پہلے سے کہیں زیادہ اس کالحاظ کرتے تھے۔ اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دیتے تھے، جس سے اُسے رنج ہو۔ پھر بھی کبھی ایسی باتیں ہوہی جاتی تھیں۔ جو اس کے بے کسی کی یاد دلادیتی تھیں۔ کوئی نوکر اب اس سے اپنی تنخواہ مانگنے نہ آتا تھا۔ ریاست کے عہدے دار اب اس کی خوشامد کرنے نہ آتے تھے۔ گروسیوک اور ان کی بیوی کے برتاؤ میں تو کوئی امتیاز نہ تھا۔ لونگی کو ان لوگوں سے جیسی امید تھی۔ اس سے کہیں اچھی طرح وہ پیش آتے تھے۔ لیکن مہریاں اب کھڑی جس کا منہ تاکتی ہیں۔ وہ کوئی اور ہے۔ نوکرچاکر جس کا حکم سن کر دوڑے آتے ہیں وہ بھی اور ہی کوئی ہے۔ دیہات کے اسامی نذرانے یا لگان کے روپے اب اس کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ شہر کے دکانوں کے کرایہ دار بھی اب اُسے کرایہ نہیں دینے آتے۔ گروسیوک نے اپنے منہ سے کسی سے کچھ نہیں کہا ہے۔ زمانہ نے سارا نظام آپ ہی آپ الٹ پلٹ دیا ہے۔ مگر یہی باتیں ہیں۔ جن سے اس کے

دل پُردرد کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور اس کی شیریں یادگاروں میں ایک لمحہ کے لیے تلخی آجاتی ہے۔ اس لیے اب وہ یہاں سے جاکر اسی دیہات میں رہنا چاہتی ہے۔ آخر جب ٹھاکر صاحب نے اس کے نام کچھ نہیں لکھا۔ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا۔ تو وہ یہاں کیوں دوسروں کی دستِ نظر ہوکر پڑی رہے۔ اُسے اب ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اور ایک ٹکڑے روٹی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے لیے وہ محنت کرسکتی ہے۔ جہاں رہے گی وہیں اپنے گذر بھر کو کمائے گی وہ اپنی جھونپڑی میں پڑی رہتی تو آج کیوں اس کی بے عزتی اور بے قدرتی ہوتی۔ جھونپڑی چھوڑ کر محل میں سکھ بھوگنے کی یہی سزا ہے۔

گروسیوک نے کہا۔ آخر سنیں تو۔ کہاں جانے کا ارادہ کررہی ہو؟

لونگی۔ جہاں بھگوان لے جائیں گے، وہاں چلی جاؤں گی۔ کوئی میکا یا سسرال ہے جس کا نام بتادوں۔

گروسیوک۔ مگر یہ بھی سوچتی ہو۔ تمھارے چلی جانے سے ہماری کتنی بدنامی ہوگی؟ دنیایہی کہے گی کہ ان سے ایک بیوہ کی پرورش نہ ہوسکی۔ نکال باہر کیا۔ میرے لیے کہیں منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ تمھیں اس گھر میں جو شکایت ہو مجھ سے کہو۔ اگر میری طرف سے اس کے دور کرنے میں ذرا بھی غفلت ہو۔ تو پھر تمھیں اختیار ہے جو چاہنا کرنا۔

لونگی۔ کیا باندھ کر رکھوگے؟

گروسیوک۔ ہاں باندھ کر رکھوں گا۔

اگر عمر بھر میں لونگی کو گروسیوک کی کوئی بات پسند نہ آئی۔ تو ان کی یہ بے جا ضد تھی۔ لونگی کا دل مسرت سے کھل گیا۔ اس نے ذرا تیز ہوکر کہا۔ باندھ کر کیوں رکھوگے؟ کیا تمھاری زرخرید ہوں؟

گروسیوک۔ ہاں زرخرید ہو۔ میں نے نہیں خریدا ہے تو میرے باپ نے تو خریدا ہے۔ زرخرید نہ ہوتیں تو تم ۳۰ سال یہاں رہتیں کیسے؟ کوئی اور آکر کیوں نہ رہ گئی۔ دادا جی چاہتے تو ایک درجن شادیاں کرسکتے تھے۔ انھوں نے یہ کیوں نہیں کیا۔ جس وقت اماں کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی جوانی کی عمر تھی۔ مگر

ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ انھوں نے کجروی اختیار کی۔ یہ تمھارے ہی محبت کی زنجیر تھی۔ جس نے انھیں باندھ رکھا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر تم نے گھر سے باہر قدم نکالا۔ تو چاہے دنیا مجھے بدنام ہی کیوں نہ کرے میں تمھارے پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا۔ تمھارے نام کے ساتھ میری اور میرے باپ کی عزت بندھی ہوئی ہے۔

لونگی کے جی میں آیا کہ گروسیوک کے قدموں پر سر رکھ کر روؤں اور سینے سے لگا کر کہوں۔ بیٹا! میں نے تو تجھے گود میں کھلایا ہے۔ تجھے چھوڑ کر میں بھلا کہیں جاسکتی ہوں لیکن اس نے مصنوعی غصے کے ساتھ کہا۔ یہ تو اچھی دل لگی ہوئی۔ یہ تو مجھے باندھ کر رکھیں گے۔

گروسیوک تو جھلائے ہوئے باہر چلے گئے اور لونگی اپنے کمرے میں جاکر خوب روئی۔ کیا گروسیوک کسی مہری سے کہہ سکتے تھے۔ ہم تمھیں باندھ کر رکھیں گے۔ کبھی نہیں۔

آج کئی مہینے کے بعد لونگی نے مہری سے سر میں تیل ڈالنے کو کہا۔ ادھر اُسے کسی نوکر سے کچھ کہتے ہوئے حجاب ہوتا تھا کہ کہیں یہ ٹال نہ جائے۔ نوکروں کو اس سے اب بھی وہی عقیدت تھی۔ لونگی نے خود ان سے کام لینا چھوڑ دیا تھا۔ آج کے جھگڑے کی بھنک بھی نوکروں کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ انھوں نے قیاس کیا تھا کہ گروسیوک نے لونگی کو کسی بات پر ڈانٹا ہے۔ اس لیے فطرتاً ان کی ہمدردی لونگی کے ساتھ ہوگئی تھی۔ وہ آپس میں اس معاملے پر من مانی رائے زنی کررہے تھے۔ مہری اس کا حکم سنتے ہی تیل لاکر اس کے سر دبانے لگی۔ اور اس کی دلجوئی کرنے کے لیے بولی۔ آج چھوٹے بابو جی کس بات پر بگڑ رہے تھے ملکن؟ کمرے کے باہر سنائی دے رہا تھا۔ تم یہاں سے چلی گئیں تو ایک نوکر بھی نہ رہے گا۔

لونگی نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ نصیب ہی کھوٹا ہے۔ نہیں تو کیوں کسی کی جھڑکیاں سنی پڑتیں۔

مہری۔ نہیں ملکن! نصیبے کو کھوٹا نہ کہو۔ نصیبے تو جیسا تمھارا ہے۔ ویسا کسی کا کیا ہوگا ٹھاکر صاحب مرتے دم تک تمھارا ہی نام رٹا کیے۔ کسی کی مجال ہے کہ تمھیں

کچھ کہہ سکے۔ یہ ساری ملکیت تمھاری پیدا کی ہوئی ہے۔ اسے کون چھین سکتا ہے۔

دفعتاً منورما نے کمرے میں قدم رکھا اور لونگی کو سر میں تیل ڈلواتے دیکھ کر بولی۔ کیسی طبیعت ہے اماں! کیا سر میں درد ہے؟

لونگی۔ نہیں بٹی! جی تو اچھا ہے۔ آؤ بیٹھو۔

منورما نے مہری سے کہا۔ تم جاؤ۔ تیل میں ڈالے دیتی ہوں۔ دروازے پر کھڑی ہوکر سننا نہیں۔ دور چلی جانا۔

مہری اس وقت یہاں کی باتیں سننے کے لیے اپنا سب کچھ نثار کرسکتی تھی۔ یہ حکم سن کر منورما کو کوستی ہوئی چلی گئی۔

منورما سر دبانے بیٹھی تو لونگی نے ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے بولی۔ نہیں بیٹا! تم رہنے دو۔ درد نہیں ہے۔ نہیں میں نہ مانوں گی۔ مجھے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی دیکھے تو کہے۔ بڑھیا پاگل ہوگئی ہے۔ رانی سے سر دبواتی ہے۔

منورما نے سر دباتے ہوئے کہا۔ رانی جہاں ہوں وہاں ہوں۔ یہاں تو تمھاری گود کی کھلائی ہوئی نورا ہوں۔ آج بھیا یہاں سے جاکر تمھارے اوپر بہت بگڑ رہے تھے۔ اس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ گردن کاٹ لوں گا۔ کتنا پوچھا کچھ بتاؤ، بات کیا ہے۔ مگر غصے میں کچھ سناہی نہیں۔ مجھ سے ان کی یہ زیادتیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ سمجھتے ہوں گے کہ اس گھر کا مالک میں ہوں۔ دادا جی سب کچھ میرے نام چھوڑ گئے ہیں۔ مگر دادا ان کی نیت کو پہلے ہی تاڑ گئے تھے۔ میں نے آج تک تم سے نہیں کہا۔ اماں جی! کچھ تو موقعہ نہ ملا، اور کچھ بھیا کا لحاظ تھا۔ مگر آج ان کی بدزبانیاں سن کر کہتی ہوں کہ وہ ساری جائداد تمھارے نام لکھ گئے ہیں۔

لونگی پر اس مژدہ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کے چہرے پر خوشی یا غرور کا نشان تک نہ تھا۔

منورما نے پھر کہا۔ میرے پاس ان کی لکھی ہوئی وصیت رکھی ہوئی ہے۔ اور میں ہی اس کی گواہ ہوں۔ جب یہ حضرت وصیت دیکھیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔

لونگی نے ذمہ دارانہ لہجہ میں کہا۔ بٹی ! تم یہ وصیت نامہ لے جاکر انھیں کو

دے دو۔ تمھارے دادا نے ناحق یہ وصیت لکھی ہے۔ میں ان کے جائداد کی بھو کی نہیں تھی۔ ان کے پریم کی بھوکی تھی۔ اور ایشور کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ میری جیسی تقدیر بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں ان کے پریم کی دولت پاکر ہی خوش ہوں۔ گروسیوک کو میں نے گود میں کھلایا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ وہ میرے مالک کا بیٹا ہے۔ اس کے سامنے کی تھالی میں نہیں کھینچ سکتی۔ یہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دو۔ گروسیوک اگر اپنے باپ کا بیٹا ہے تو میری بے قدری نہ کرے گا۔ وہ مجھے مانے نہ مانے میں اسے اپنا ہی سمجھتی ہوں۔ تم سرہانے بیٹھی میرا سر دبارہی ہو۔ دولت سے کبھی اتنا سکھ مل سکتا ہے ؟ گروسیوک کے منہ سے 'اماں' سن کر مجھے وہ خوشی ہوگی جو سنسار کی رانی بن کر نہیں ہوسکتی۔

یہ کہتے کہتے لونگی کی آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ منورما اس کی طرف عقیدت۔ غرور، تعجب اور احترام کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گویا کوئی دیوی ہے

(40)

رانی بسومتی تو بہت دنوں سے پوجاپاٹ میں مصروف رہتی تھیں۔ بہت تھوڑا کھائیں اور وہ بھی صرف ایک بار۔ آرائش اور نفاست سے بھی انھیں اب نفرت ہو گئی تھی۔ رانی رام پریا کی حالت سابق دستور تھی۔ سب سے الگ اپنے گوشہ عافیت میں بیٹھی ہوئی گانے بجانے کی مشق کیا کرتی۔ پرانے سکے۔ دیگر ممالک کے ٹکٹ اور اسی طرح نایاب چیزیں جمع کرنے کی انھیں دھن تھی۔ ان کا کمرہ چھوٹا سا ایک عجائب خانہ تھا۔ انھوں نے شروع ہی سے اپنے کو دنیا کے جھمیلوں سے آزاد رکھا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے رانی روہنی کا دل بھی بھگتی کی جانب مائل تھا۔ وہی عورت جو پہلے حسد کی آگ میں جلا کرتی تھی۔ اب رحم اور عفو کی دیوی بن گئی تھی۔ اہلیا سے وہ بہت مانوس ہوگئی تھی۔ شنکدھر بھی اس سے بہت ہل گیا تھا۔ راجہ صاحب تو اس کے غلام تھے۔ جو شنکدھر کو پیار کرے روہنی نے شنکدھر کو گود میں کھلا کھلا کر اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کرلیا۔ لیکن منورما ابھی تک روہنی سے چونکتی رہتی تھی۔ مگر شنکدھر کا روہنی کے پاس آنا جانا اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔

جس دن منورما دیوان صاحب کا وصیت نامہ لے کر لونگی کے پاس گئی تھی۔ اسی دن کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ راجہ صاحب پائیں باغ میں حوض کے کنارے بیٹھے مچھلیوں کو آٹے کی گولیاں کھلا رہے تھے۔ یکایک پاؤں کی آہٹ پاکر سر اٹھایا۔ تو دیکھا روہنی آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ آج اسے دیکھ کر راجہ صاحب کو رقت آگئی۔ وہ یاس اور غم کی زندہ تصویر نظر آتی تھی۔ گویا فریاد کررہی ہو کہ تم نے مجھے کیوں یہ سزا دے رکھی ہے۔

راجہ صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔ کیسے چلیں روہنی! آؤ یہاں بیٹھو۔

روہنی نے دردناک لہجہ میں کہا۔ آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا چلی آئی۔ میرا آنا ناگوار گذرتا ہو تو چلی جاؤں!

راجہ صاحب نے ہمدردی کے ساتھ کہا۔ کیوں شرمندہ کرتی ہو روہنی! میں تو خود ہی نادم ہوں۔ میں نے تمھارے اوپر بڑا ستم کیا ہے، اور نہیں جانتا مجھے اس سے کیا سزا ملے گی۔

روہنی نے خشک ہنسی کے ساتھ کہا۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ آپ نے وہی کیا جو اور سبھی مرد کرتے ہیں اور لوگ چھپے چھپے کرتے ہیں۔ آپ نے علانیہ کیا۔ عورت کبھی مرد کا کھلونا ہے، کبھی اس کے پاؤں کی جوتی، انھیں دوحالتوں میں اس کی عمر ختم ہوجاتی ہے۔ یہ آپ کی خطا نہیں۔ ہم عورتوں کو ایشور نے اس لیے بنایا ہے۔ ہمیں سب کچھ بے عذر جھیلنا چاہیے۔ شکوہ فریاد کی اجازت نہیں اور اپنی بے کسی کا اظہار کرنا تو زندگی کو برباد کرنا ہے۔

یہ طنز نہ تھا۔ روہنی کے حالات کی سچی بے لاگ تنقید تھی۔ راجہ صاحب سر جھکائے سنتے رہے۔

روہنی پھر بولی۔ آج سولہ برس ہوئے۔ جب میں ایک بار ناراض ہوکر گھر سے نکلی تھی۔ بابو چکر دھر کے اصرار سے لوٹ آئی تھی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ کبھی آپ نے بھول کر بھی پوچھا کہ تو مرتی ہے یا جیتی۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ آپ نے مجھے چلے جانے دیا ہوتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ میں رسوائی کے راستے پر جاتی؟ گنگا کی گود کے سوا میرے لیے اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ لیکن امید تھی جو مجھے لوٹا

لائی، اور اسی نے مجھے سبز باغ دکھاکر ایک زمانہ گذار دیا۔ لیکن آپ کو کبھی مجھ پر درد نہ آیا۔ آپ کو کچھ خبر ہے۔ یہ زمانہ میں نے کس طرح کاٹا۔ کسی کو گانے بجانے میں مزا آتا ہے، مجھے نہیں آتا۔ کسی کو پوجاپاٹ میں راحت ملتی ہے، مجھے نہیں ملتی۔ میں مایوسی کی اس حد تک نہیں پہنچی۔ میں شوہر کے رہتے لئے ہوئے سہاگ کا روپ نہیں بھر سکتی۔ انسان کا دل تو ایک معمہ ہے۔ وہی اذیتیں جو ایک بال بدھوا سہتی ہے اور سینے میں اپنی عزت سمجھتی ہے۔ وہی اذیتیں نظروں سے گری ہوئی عورت کے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے۔ میں راجپوت کی بیٹی ہوں۔ مرنا جانتی ہوں۔ میں نے کئی بار خودکشی کرنے کاا رادہ کیا۔ یہ آپ نہ جانیں گے۔ لیکن یہی سوچ کر رُک گئی کہ میرے مرنے سے تو آپ اور خوش ہوں گے۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ میری لاش پر آکر آنسو کی چار بوندیں گرادیں گے۔ تو شاید اب تک میں رخصت ہوگئی ہوتی۔ میں اتنی پاک نفس نہیں ہوں۔ لیکن اپنے سیتاؤں کی بے حرمتی اور بے عزتی نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ نہیں تو اب تک میں نہ جانے کیاکر بیٹھتی ـــ سوزِ پنہاں عورت سے جو کچھ کراسکتا ہے۔ اس کا آپ گمان نہیں کرسکتے۔ اگر سیتا بھی اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتیں۔ جو آج میں سولہ برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔ تو آج سیتا نہ رہتیں۔ سیتا بنانے کے لیے رام جیسا پرش چاہیے۔

راجہ صاحب نے پوچھا۔ کیاساری ذمہ داری میرے ہی سر ہے؟

روہنی۔ نہیں۔ آپ کی کوئی خطا نہیں۔ وہ عورت سچ مچ بدنصیب ہے۔ جو اپنے شوہر کی برائی سوچے۔ مجھے آپ کی برائی سوچتے ہوئے سولہ سال ہوگئے۔ میری دلی تمنا یہی رہی کہ آپ کو کوئی صدمہ ہو اور میں دیکھوں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ آپ کو مصیبت میں دیکھ کرمجھے خوشی ہوتی۔ نہیں۔ ابھی میرا اتنا اخلاقی زوال نہیں ہواہے۔ میں آپ کی برائی صرف اس لیے چاہتی تھی کہ آپ کی آنکھیں کھلیں۔ آپ کھرے کھوٹے کو پہچانیں۔ شاید تب آپ کو میری یاد آتی۔ شاید تب مجھے اپنی کھوئی ہوئی جگہ پانے کاموقعہ تھا۔ تب میں ثابت کردیتی کہ آپ مجھے جتنی کمینہ سمجھ رہے ہیں۔ اتنی کمینہ نہیں ہوں۔ میں آپ کو اپنی خدمت سے شرمندہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ موقع بھی نہ ملا۔

راجہ صاحب کو کسی عورت کی جذبات کی تہ تک پہنچنے کا ایسا موقعہ کبھی نہ ملا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اگر میں مر بھی جاؤں تو روہنی کے آنکھوں میں آنسو نہ آئیں گے۔ وہ اپنے دل سے اس کے دل کو تولتے تھے۔ وہ اگر مرجاتی تو لاریب اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ پر آج روہنی کے دل گداز اور حسرت سے بھری ہوئی باتیں سن کر وہ پتھر بھی موم ہوگیا۔ ہائے اس انتقام میں بھی کتنا ایثار ہے۔

اہلیا کو آتے دیکھ کر روہنی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ذرا دیر وہاں کھڑی رہ کر دوسری اور چلی گئی۔ راجہ صاحب کے دل پر ایک بوجھ سا اٹھ گیا۔ انھیں اپنی بے دردی پر افسوس ہورہا تھا۔ آج انھیں معلوم ہوا کہ روہنی کامزاج سمجھنے میں ان سے کیسی سخت غلطی ہوئی۔ جی یہی چاہتا تھا کہ چل کر روہنی سے اپنے خطا معاف کراؤں۔ یہی باتیں اگر اس نے اور پہلے کہی ہوتیں تو دونوں کے دلوں میں کیوں یہ کدورت پیدا ہوتی۔ اگر وہ ان سے ایک بار بھی ہنس کر ہم کلام ہوئی ہوتی۔ ایک بار بھی ان کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔ میں تمھیں نہ چھوڑوں گی۔ تو وہ اس سے یہ بے اعتنائی نہ کرسکتے۔ لیکن دل نے پھر کہا۔ خود داری عورت کا ایک خاص وصف ہے۔ وہ ان کی خوشامد کیوں کرتی۔ انھوں نے خود اپنی خطا تسلیم کی۔

یکایک ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا۔ آج روہنی نے کیوں مجھ سے یہ باتیں کیں۔ جو کام کرنے کو وہ اپنے لیے ۲۰ سال راضی نہ کرسکی۔ وہ آج کیوں کر بیٹھی۔ اس سوال نے راجہ صاحب کے دل کو دہشت نے مغلوب کردیا۔ آج روہنی کے چہرے پر کیسی حسرت چھائی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے وقت اس کی آنکھیں پھڑپھڑاتی تھیں۔ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنی بے کسی کبھی نظر نہ آتی تھی۔ وہاں تو غرور کی سرخی جھلکتی رہتی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی وہ غرور سے گردن اٹھاکر منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ آج یہ تفسیر کیوں ہوا۔

راجہ صاحب جیوں جیوں اس معاملے پر غور کرتے ان کی دہشت بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی رات سے زیادہ گذر گئی تھی۔ نواس میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مگر ان کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ ان کا دل اس خوف سے بے تاب ہورہا تھا۔ آخر ان سے ضبط نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ روہنی کے کمرے کی اُور چلے۔ اس کی ڈیوڑھی پر چوکیدارنی

سے ملاقات ہوئی۔ انھیں اس وقت یہاں دیکھ کر وہ سکتہ میں آگئی۔ جس مکان میں انھوں نے بیس برس تک قدم نہیں رکھا۔ادھر آج کیسے بھول پڑے۔

راجہ صاحب نے پوچھا۔ چھوٹی رانی کیا کررہی ہیں؟

چوکیدارنی نے کہا۔ اس وقت تو سرکار سورہی ہوں گی۔ مہاراج کاکوئی پیغام ہو تو پہنچادوں!

راجہ صاحب نے کہا۔ نہیں میں خود جارہا ہوں۔ تو یہیں رہ!

راجہ صاحب نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر اندر کی طرف جھانکا۔ روہنی مسہری کے اندر چادر اوڑھے سورہی تھی۔ وہ اندر قدم رکھتے جھجکے۔ اندیشہ ہوا کہیں روہنی اٹھ کر کہہ نہ بیٹھے۔ آپ یہاں کیوں آئے۔ وہ اسی دبدے میں آدھ گھنٹے تک کھڑے رہے۔ کئی بار آہستہ آہستہ پکارا بھی پر روہنی نہ سنگی۔ اتنی دیر میں اس نے ایک بار بھی کروٹ نہ لی۔ یہاں تک کہ اس کی سانس بھی نہ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ کمر کیے پڑی ہے۔ اور دیکھ رہی ہے کہ راجہ صاحب کیا کرتے ہیں۔ شاید امتحان لے رہی ہے۔ کیا اب بھی ان کا دل صاف ہوا یا نہیں۔ نیند میں غافل پڑے ہوئے آدمی کا تنفس اتنا خاموش نہیں .رسکتا۔ ضرور دم سادھے پڑی ہوئی ہے۔ سمجھے شاید میری آہٹ پاکر چادر اوڑھ لی ہوگی۔ اس کے مزاج میں ظرافت بھی تو بہت ہے۔ پہلے بھی تو اسی طرح کی نقلیں کیا کرتی تھی۔ اس کی ظرافت اور تمسخر کی صدہا روایتیں یاد آگئیں۔ انھوں نے ہمت کرکے کمرے میں قدم رکھا۔ پر اب بھی کسی طرح کی آواز نہ سن کر انھیں خیال آیا۔ کہیں رانی نے جھوٹ موٹ تو چادر نہیں تان دی ہے۔ انھیں ایک پرانا واقعہ یاد آیا۔ جب روہنی نے ان کے ساتھ اس طرح کی دل لگی کی تھی اور یہ کہہ کر انھیں خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ آپ کی بیوی تو وہ ہے۔ جسے آپ نے جگایا ہے۔ جایئے! انھیں سے ہنسئے بولیے۔ آج بھی شاید وہ وہی نقل کررہی ہے۔ اس موقعہ کے لیے کوئی چبھتا ہوا فقرہ سوچ رکھا ہوگا۔ راجہ صاحب کا ساٹھواں سال تھا۔ لیکن اس وقت اس راز ونیاز میں انھیں شباب کا سا لطف آرہا تھا۔ وہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ اس کی چال تاڑگئے۔ وہ انھیں دھوکا نہ دے سکی۔ لیکن جب آدھ گھنٹے تک کھڑے رہنے پر بھی کوئی آواز یا آہٹ نہ ملی تو انھوں نے چاروں

طرف چوکنی آنکھ سے دیکھ کر آہستہ سے چادر ہٹادی۔ روہنی سوئی ہوئی تھی۔ لیکن جب جھک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ روہنی نہ تھی۔ روہنی کی لاش تھی۔ بیس برس کی فکر، غم، حسد اور مایوسی نے اس کے خستہ جسم کو گلا ڈالا تھا۔ اُن بے جان ساکن اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اب بھی ایک آرزوئے تشنہ جھلک رہی تھی۔ دونوں بے نور آنکھیں اس کی حسرت ناک زندگی کی دوشرحیں تھیں۔ زندگی کی ساری ناکامیاں، ساری حسرتیں، گویا وہاں ماتم کررہی تھیں۔ دو دلدوز تیروں کی طرح راجہ صاحب کے دل میں چبھی جارہی تھیں۔ گویا کہہ رہی تھیں۔ اب تو تمھارا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ اب میٹھی نیند سوؤ۔ مجھے تمھاری پرواہ نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے دونوں آنکھیں بند کرلیں، اور رونے لگے۔ ان کا ضمیر اس انسانیت سوز بے رحمی پر ان کی ملامت کررہا تھا۔ کسی آدمی کے ساتھ اپنے فرض کا خیال ہمیں اس کے مرنے کے بعد ہی آتا ہے۔ ہائے! ہم نے اس کے ساتھ کچھ نہ کیا۔ یہ وہی رانی تھی۔ جس پر ایک دن وہ اپنی جان نثار کرتے تھے اور آج وہ اس بے کسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہیں۔ کوئی تشفی دینے والا بھی نہیں۔ راجہ صاحب کو اب روہنی کی باتوں کا راز سمجھ میں آیا۔ وہ انھیں آگاہ کررہی تھیں۔ لیکن ان کی عقل پر ایسا پردہ پڑ گیا تھا کہ وہ اس وقت بھی کچھ نہ سمجھے۔ اس وقت بھی اگر انھوں نے ایک بار خلوص دل سے کہا ہوتا۔ میری جان! میری خطائیں معاف کردو۔ تو شاید اس دکھیا کے آنسو بجھ جاتے۔ وہ آخر وقت میں ان کے پاس عفو کا پیغام لے کر گئی تھی۔ پروہ کچھ نہ سمجھے۔ امید کی آخری تحریک اسے اُن کے پاس لے گئی۔ مگر افسوس!......

یکایک راجہ صاحب کو خیال آیا۔ شاید ابھی اس کی جان بچ جائے۔ انھوں نے چوکیدارنی کو پکارا اور بولے۔ ذرا جاکر دربان سے کہہ دے۔ جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلالائے۔ یہ بڑھیا رانی دیوپریا کے زمانہ کی عورت تھی۔ روہنی کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ڈاکٹر کو بلاکر کیا کروگے؟ رانی اس لوک میں چلی گئیں۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ ابھاگنی مرجاد ڈھوتی رہ گئی۔ اس کے اوپر کیا کیا گذری۔ تم کیا جانوگے۔ تم تو بڑھاپے میں شادی کرکے عقل اور حیا دونوں ہی کھو بیٹھے۔ اس کے

اوپر جو کچھ گذری۔ وہ میں جانتی ہوں۔ ہائے! خون کے آنسو رو کر بے چاری مر گئی۔ اور تمھیں درد نہ آیا۔ کیا سمجھتے ہو کہ اس نے زہر کھالیا؟ اس ڈھانچے سے جان کو نکالنے کے لیے زہر کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے مرنے کا تعجب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ وہ اتنے دن زندہ کیسے رہی۔ جو دل جوئی تم آج کر رہے ہو اگر وہ پہلے کی ہوتی تو اس کے لیے وہ امرت ہو جاتی۔

دم زدن میں رنواس میں شور مچ گیا۔ رانی روہنی نے انتقال کیا۔ سبھی رانیاں باندھیاں آکر جمع ہو گئیں۔ مگر منورما نہ آئی۔

(41)

روہنی کی وفات کے بعد راجہ صاحب جگدیش پور نہ رہ سکے۔ منورما کا جی بھی وہاں گھبرانے لگا۔ وہ اس خیال کو دل سے نہ نکال سکتی تھی کہ میں ہی روہنی کے بے وقت موت کا سبب ہوئی۔ راجہ صاحب کی نگاہ بھی اب اس کی طرف سے پھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب خزانچی اتنے مستعدی سے اس کی فرمائش نہیں پوری کرتا۔ راجہ صاحب بھی اب اس کے پاس بہت کم آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گروسیوک کو جواب دے دیا گیا ہے اور رنواس میں آنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ روہنی نے اپنے کو قربان کرکے منورما پر فتح پائی ہے۔ اب بسومتی اور رام پریا پر راجہ صاحب کی کچھ خاص نظر عنایت ہے۔ ریاست میں اب اندھیر بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔ منورما کے کھولے ہوئے مدرسے بند ہوتے جارہے ہیں۔ کسانوں پر بھی کچھ زیادہ سختی ہونے لگی ہے۔ منورما سب دیکھتی اور سمجھتی ہے، مگر منہ نہیں کھول سکتی۔ اس کا ستارۂ اقبال زوال پر ہے۔ وہی راجہ صاحب جو اس کے بغیر کہیں سیر کرنے بھی نہ جاتے تھے۔ اب ہفتوں اس کی طرف جھانکتے تک نہیں۔ نوکروں پر بھی اب اس کا رعب نہیں رہا۔ ان گنواروں کو ہوا کا رُخ پہچانتے دیر نہیں لگتی۔ روہنی کی قربانی رایگاں نہیں ہوئی۔

شنکدھر کو اب ایک نئی فکر ہوگئی ہے۔ راجہ صاحب کے روٹھنے سے چھوٹی نانی مر گئیں۔ بابو جی کے روٹھنے سے اماں کو بھی یہی حال ہوگا۔ وہ دیکھتا ہے۔ اہلیا روز

بروز گھٹتی جاتی ہے۔ اس سے اُسے بڑی تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا نام اسکول میں لکھا دیا گیا ہے۔ اسکول سے چھٹی پاکر وہ سیدھے لونگی کے پاس جاتا ہے اور اس سے تیرتھ یاترا کی باتیں پوچھتا ہے۔ یاتری کیا کھاتے ہیں۔ کہاں ٹھیرتے ہیں۔ جہاں یہ ریلیں نہیں ہیں۔وہاں لوگ کیسے جاتے ہیں۔ راستے میں چور تو نہیں ملتے؟۔ لونگی اس کے دل کی کیفیت سمجھتی ہے۔ لیکن خواہش نہ ہونے پر بھی اسے ساری باتیں بتانی پڑتی ہیں۔ وہ جھنجھلاتی ہے، کھڑک بیٹھی ہے، لیکن جب وہ بھولا بھالا لڑکا زبردستی اس کی گود میں بیٹھ جاتا ہے تو اسے رحم آجاتا ہے۔ چھٹیوں کے دن شنکدھر اپنے باپ کے گھر کا درشن کرنے ضرور جاتا۔ وہ گھر اس کے لیے ایک متبرک مقام ہے۔ جب تک وہ وہاں رہتا ہے۔ اس پر بھگتی کا نشہ چھایا رہتاہے۔ نرملا کی آنکھیں اس کی دیدار سے سیر ہی نہیں ہوتیں۔ اس کے گھر میں آتے ہی روشنی سی پھیل جاتی ہے دادا اور دادی دونوں اس کی طفلانہ سرگرمی سے بھری باتیں سن کر مست ہوجاتے ہیں۔ انھیں ایسامعلوم ہوتا ہے کہ چکردھر ہی اس شکل میں اس کا غم غلط کرنے آتا ہے۔

ایک دن نرملا نے کہا۔ بیٹا! تم یہیں آکے کیوں نہیں رہتے۔ تم چلے جاتے ہو تو یہ گھر کاٹنے دوڑتا ہے۔

شنکھدھر نے کچھ سوچ کر متانت سے کہا۔ اماں تو آتی ہی نہیں۔ وہ یہاں کیوں نہیں آتیں دادی جی!

نرملا۔ اب یہ تو وہی جانیں۔ تم کبھی پوچھتے نہیں؟ آج پوچھنا۔ دیکھو کیا کہتی ہیں۔

شنکھدھر۔ نہیں دادی وہ رونے لگیں گی۔ جب تھوڑے دنوں میں میں گدی پر بیٹھوں گا۔ تو یہی گھر میرا شاہی محل ہوگا۔ تبھی اماں جی آویں گی۔

نرملا۔ جلدی سے بیٹھو بیٹا! ہم بھی دیکھ لیں۔

شنکھدھر۔ میں بابو جی کے نام سے ایک اسکول کھولوں گا۔ دیکھ لینا اس میں کسی لڑکے سے فیس نہ لی جائے گی۔

بجردھر۔ اور ہمارے لیے کیا کرو گے بیٹا!

شنکھ دھر۔آپ کے لیے اچھے اچھے ستاریئے بلواؤں گا۔ آپ ان کا گانا سنا کیجیے گا۔ آپ کو یہ فن کس نے سکھایا؟

بجر دھر۔ میں نے یہ فن ایک مہاتما سے سیکھا۔ برسوں ان کی خدمت کی، تب جاکر خوش ہوئے۔ انھوں نے مجھے ایسی دعادی کہ تھوڑے ہی دنوں میں میں اس فن میں مشاق ہوگیا۔ تم بھی سیکھ لو بیٹا! میں بڑے شوق سے سکھاؤں گا۔ اصل میں یہ فن راجوں مہاراجوں کے لیے تو ہے ہی۔ وہی تو اہل کمال کی قدر کرسکتے ہیں۔ جسے یہ علم آگیا۔ اسے زندگی میں کسی بات کی کمی نہ رہے گی۔ وہ جہاں رہے گا لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ میں نے تو اسی علم کی بدولت بدری ناتھ کی یاترا کی تھی۔ جس گاؤں میں شام ہوجاتی کسی بھلے آدمی کے دروازے پر چلا جاتا اور دو چار چیزیں سنادیتا۔

شنکھ دھر نے حیرت میں آکر پوچھا۔ سچ ؟ تب تو میں ضرور سیکھوں گا۔

بجر دھر۔ ضرور سیکھ لو۔ لاؤ میں آج ہی سے شروع کردوں۔

شنکھ دھر کو گانے اور بجانے کا خاص ذوق تھا۔ ٹھاکر دوارے میں جب کیرتن ہوتا تو وہ بڑے شوق سے سنتا تھا۔ خود بھی تنہائی میں بیٹھا گنگنایا کرتا تھا۔ ایک بار بھی کوئی راگ سن لیتا تو وہ پتھر کی لکیر ہوجاتی۔ جوگیوں کے کتنے ہی گیت اُسے یاد تھے۔ کھنجری بجابجا کر وہ سور، کبیر، میرا وغیرہ باکمالوں کے پدگایا کرتا تھا۔ اس وقت جو اس نے کبیر کا ایک پدگایا۔ تو منشی جی لٹو ہوگئے۔ بیٹا! تمھیں تو میں تھوڑے دنوں میں ایسا بنادوں گا کہ اچھے اچھے استاد کانوں پر ہاتھ دھریں۔ بس تم میرے نام پر ایک موسیقی کا اسکول کھول دینا۔

شنکھ دھر۔ جی ہاں! اس میں گانے کی تعلیم دی جائے گی۔

نرملا۔ اور اپنی بڑھیا دادی کے لیے کیا کروگے بیٹا!

شنکھ دھر۔ تمھارے لیے ایک ڈولی بنوادوں گا۔ اسی پر بیٹھ کر تم روز گنگا اشنان کرنے جانا۔

نرملا۔ میں ڈولی پر نہ بیٹھوں گی۔ لوگ ہنسیں گے۔

اس طرح دونوں آدمیوں کا دل بہلا کر جب شنکھ دھر چلنے لگا تو نرملا دروازے تک اس کے پیچھے آئی۔

یکایک شنکھ دھر ڈیوڑھی پر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ دادی جی ! آپ سے کچھ مانگنا

چاہتا ہوں۔

نرملا نے پوچھا۔ کیامانگتے ہو بیٹا؟

شنکھ دھر۔ آپ مجھے دعا دیجیے کہ میری دلی مراد بر آئے۔

نرملا نے اُسے گلے سے لگاکر کہا۔ بھیا! میرا تو رویا رویاں تمھیں دعا دیا کرتا ہے۔ ایشور تمھاری ساری مرادیں پوری کرے۔

شنکھ دھر نے اس کے چرنوں پر سر جھکایا اور موٹر پر جا بیٹھا۔ نرملا چوکھٹ پر کھڑی موٹر کی طرف تاکتی رہی۔ موٹر پر جاتے ہی موٹر تو اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ مگر نرملا اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹی۔ جب تک اس کی آواز کانوں میں آتی رہی۔

شنکھ دھر گھر پہنچا تو اہلیا نے پوچھا۔ آج اتنی دیر کہاں لگائی بیٹا! میں کب سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔

شنکھ دھر۔ ابھی تو ایسی بہت دیر نہیں ہوئی۔ اماں! ذرا دادی کے پاس چلا گیا تھا۔ انھوں نے آج مجھے ایک پیغام کہلا بھیجا ہے۔

اہلیا۔ کیا پیغام ہے سنوں؟

شنکھ دھر۔ یہی کہ تم کبھی کبھی وہاں کیوں نہیں چلی جاتیں؟

اہلیا۔ کیا کچھ کہتی تھیں؟

شنکھ دھر۔ کہتی تو نہیں تھیں۔ پر ان کی خواہش ایسی ہی معلوم ہوتی تھی۔ کیا اس میں کچھ ہرج ہے۔؟

اہلیا نے اوپری دل سے یہ تو کہہ دیا۔ ہرج کچھ نہیں۔ گھر تو میرا وہی ہے۔ یہاں تو مہمان ہوں۔ لیکن اس کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ وہاں جانا مناسب نہیں سمجھتی۔ خیر وہ کہہ سکتی تو کہتی۔ وہاں سے تو ایک بار نکال دی گئی۔ اب کون منہ لے کر جاؤں۔ کیا اب میں کوئی دوسری ہوگئی ہوں۔

اہلیا طشتریوں میں میوے اور مٹھائیاں لائی اور بولی۔ وہاں تو کچھ کھایا نہ ہوگا۔ آج اتنے اداس کیوں ہوں؟

شنکھ دھر نے طشتری کی طرف ذرا دیکھتے ہی کہا۔ اس وقت تو کھانے کو جی

نہیں چاہتا اماں!

ایک لمحہ کے بعد اس نے کہا۔ کیوں اماں! بابو جی کو ہم لوگوں کی یاد بھی کبھی آتی ہوگی؟

اہلیا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ کیا جانیں بیٹا! یاد ہی آتی تو کالے کوسوں کیوں بیٹھے رہتے؟

شنکھ دھر۔ کیا انھیں ہم لوگوں کی محبت نہیں آتی؟

اہلیا رو رہی تھی۔ کچھ نہ بول سکی۔

شنکھ دھر۔ مجھے دیکھیں تو پہچان جائیں کہ نہیں؟

اہلیا پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اس کی آواز آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی جارہی تھی۔

شنکھ دھر نے پھر کہا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہی نرموہی ہیں۔ اسی سے تو انھیں ہم لوگوں کی یاد نہیں آتی۔ مجھے ایک دفعہ مل جاتے تب تو میں انھیں قائل کردیتا۔ آپ نہ جانے کہاں بیٹھے ہیں۔ کسی کی سدھ ہی نہیں۔ میرا تو کبھی کبھی ایسا جی چاہتا ہے کہ میں تو صاف کہہ دوں۔ آپ میرے ہوتے کون ہیں۔ آپ ہی نے تو ہم لوگوں کو بھلا رکھا ہے۔

اب اہلیا چپ نہ رہ سکی۔ رقت آمیز لہجہ میں بولی۔ انھوں نے ہمیں بھلا نہیں دیا ہے۔ وہاں ان کی جو حالت ہوگی۔ وہ میں جانتی ہوں۔

شنکھ دھر نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ کیوں اماں! مجھے دیکھیں تو پہچان جائیں یا نہیں؟

اہلیا۔ میں تو سمجھتی ہوں نہ پہچان سکیں۔ تب تم بالکل ذرا سے تھے۔ آج ان کو گئے دسواں سال ہے۔ میں تو تمھیں دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ وہ کس کو دیکھ کر دل کو تسکین دیتے ہوں گے؟

شنکھ دھر اپنی ہی دُھن میں مست تھا۔ بولا۔ لیکن میں تو انھیں دیکھ کر فوراً پہچان جاؤں!

اہلیا۔ نہیں بھیا تم بھی انھیں نہ پہچان سکوگے۔ تم نے ان کی تصویریں ہی تو

دیکھی ہیں۔ وہ تصویریں بارہ سال پہلے کی ہیں۔

شنکھ دھر نے کچھ جواب نہ دیا۔ باغیچہ میں جا کر پھول توڑنے لگا۔ پھر اپنے کمرے میں آیا اور چپ چاپ بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کیا میں ایسا بہت چھوٹا ہوں۔ میرا تیرہواں سال ہے۔ چھوٹا نہیں ہوں۔ اس عمر میں کتنے ہی آدمیوں نے بڑے بڑے کام کر ڈالے ہیں۔ مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ دن بھر گلیوں میں گھومنا اور شام کو کہیں پڑ رہنا۔ یہاں لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ اس کی اسے فکر نہ تھی۔ راجہ صاحب پاگل ہوجائیں گے۔ منورما روتی روتی اندھی ہوجائے گی۔ اہلیا شاید جان ہی دے دے۔ مگر اس کی اُسے بالکل فکر نہ تھی۔ وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کو بے قرار ہورہا تھا۔

یکایک اُسے خیال آیا۔ ایسا نہ ہو یہ لوگ میری تلاش میں نکلیں۔ تھانے میں حلیہ لکھائیں، خود بھی پریشان ہوں، مجھے بھی پریشان کریں۔ اس لیے انھیں اتنا بتلادینا چاہیے کہ میں کہاں اور کس کام کے لیے جارہا ہوں۔ اگر کسی نے مجھے زبردستی لانا چاہا، تو اچھا نہ ہوگا۔ ہماری خوشی ہے جب چاہیں گے آئیں گے۔ ہمارا راج تو کوئی نہ اٹھالے جائے گا۔ اس نے کاغذ پر ایک خط لکھا اوراپنے بستر پر رکھ دیا۔

میں آج اپنی خوشی سے بابوجی کی تلاش میں جاتا ہوں۔ آپ لوگ میرے لیے ذرا بھی فکر نہ کیجیے گا۔ نہ مجھے تلاش کرنے کے لیے آیئے گا۔ کیوں کہ میں کسی حالت میں بابوجی کا پتہ لگائے بغیر نہ آؤں گا۔ جب تک ایک بار ان کے درشن نہ کرلوں اور پوچھ نہ لوں کہ مجھے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے۔ تب تک میرا جینا بیکار ہے۔ میں یا تو بابو جی کو ساتھ لے کر لوٹوں گا یا اسی کوشش میں جان دے دوں گا۔ اگر میری تقدیر میں راج کرنا لکھا ہے تو راج کروں گا۔ بھیک مانگنا لکھا ہے تو بھیک مانگوں گا۔ لیکن بابو جی کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائے اور ان کی کچھ خدمت کیے بغیر میں گھر نہ آؤں گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے واپس لانے کی کوئی فکر نہ کریں۔ نہیں تو میں جان دے دوں گا۔ میرے لیے یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ بابوجی تو چاروں طرف مارے مارے پھریں اور میں گھر میں چین سے بیٹھا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں برداشت ہوتا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں۔ بھول بھٹک جاؤں گا۔ میں نے یہ ساری باتیں اچھی طرح سوچ لی ہیں۔ روپے پیسے کی بھی مجھے ضرورت نہیں۔

اماں! میری آپ سے یہی التجا ہے کہ آپ دادی کی خدمت کیجیے گا اور انھیں سمجھایئے گا کہ میرے لیے فکر نہ کریں۔ رانی اماں اور بابو کو پرنام!

آدھی رات گذر چکی تھی۔ شنکھ دھر ایک کرتہ پہنے گھر سے نکلا بغل کے کمرے میں راجہ صاحب آرام کررہے تھے۔ وہ عقب کی طرف باغ میں گیا اور امرود کے درخت پر چڑھ کر باہر کی طرف کود پڑا۔ اب اس کے سر پر تاروں سے جگمگاتا ہوا آسمان تھا۔ سامنے وسیع میدان۔ اور سینے میں امید، خوف اور آرزوؤں سے تڑپتا ہوا دل۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا۔ کچھ نہیں معلوم کدھر جارہا ہے۔ تقدیر کہاں لیے جارہی ہے۔

ایسی ہی اندھیری رات تھی۔ جب چکردھر نے اس گھر سے منہ موڑا تھا۔ آج بھی وہی اندھیری رات ہے۔ اور بھاگنے والا چکردھر کا بیٹا ہے۔ کون جانتا ہے چکردھر پر کیا بیتی۔ شنکھ دھر پر کیا بیتے گی، اسے بھی کون جان سکتا ہے۔ اس گھر میں انھیں کون سی آسائش نہیں تھی۔ کیا ایسی بھی کوئی چیز ہے۔ جو اس ثروت اور آسائش راج پاٹ سے زیادہ پیاری ہے۔

بدنصیب اہلیا تو پڑی سورہی ہے۔ ایک بار تم نے اپنا شوہر کھویا اور ابھی تک تیری آنکھوں سے آنسو نہیں تھمے۔ آج پھر اپنا پیارا بیٹا، اپنا لخت جگر، کھوئے دیتی ہے۔ جس ثروت کے لیے تو اپنے شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ وہی ثروت کیا آج تجھے اجیر ہورہی ہے؟

(42)

پانچ سال گذر گئے۔ مگر نہ کہیں شنکھ دھر کا پتہ چلا۔ نہ چکردھر کا۔ راجہ بشال سنگھ نے رحم اور انصاف کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اور خوب دل کھول کر ظلم کررہے ہیں۔ رحم اور انصاف سے جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ حاصل کرلینے کے بعد وہ اب یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سختی اور ظلم سے کیا ہوتا ہے۔ ریاست میں ثواب کے جتنے کام ہوتے تھے۔ وہ سب بند کردیے گئے ہیں۔ مندروں میں چراغ نہیں جلتے۔ سادھو سنت دروازے سے کھڑے کھڑے نکال دیے جاتے ہیں۔ غریب رعایا کی فریاد کوئی نہیں

سنتا۔ راجہ صاحب کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اب کیا رہ گیا ہے جس کے لیے وہ نیکی اور حق کا دامن پکڑیں۔ وہ لاڈلا اب کہاں ہے۔ جس کے ایثار سے ہی آنکھوں کو سرور ہوتا تھا۔ وہ زندگی اور موت کی سبھی آرزوؤں کا مرکز کہاں چلا گیا۔ اگر ایشور نے ان کے اوپر یہ ستم ڈھائے ہیں تو وہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اتنے آدمیوں میں صرف منورما ہے جس نے ابھی تک صبر اور توکل کا دامن نہیں چھوڑا لیکن اس کی اب کوئی نہیں سنتا۔ راجہ صاحب اب اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ اسی کو ان ساری مصیبتوں کا باعث سمجھتے ہیں۔ وہی منورما جو ان کے دل کی رانی تھی جس کے اشارے پر ریاست چلتی تھی۔ اب کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔

شام ہوگئی ہے۔ روشنی کا دیوتا پہاڑوں کے دامن میں چھپ گیا۔ عورتیں پانی بھرنے کو پنگھٹ پر جمع ہوگئی ہیں۔ اسی وقت ایک نوجوان ہاتھ میں کھنجڑی لیے آکر کنویں کے جگت پر بیٹھ گیا۔ یہی شنکھ دھر ہے۔ اس کے رنگ روپ اور خط وخال میں اتنا تغیر ہوگیا ہے کہ شاید اہلیا بھی اسے دیکھ کر چونک پڑتی۔ اس کے چہرے پر ایسی نقاہت ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جان نکلنے کے لیے بے قرار ہورہی ہے۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تمنااور انتظار کی جگہ مایوسی کا سکون ہے۔ اس مایوسی کا جس کا کوئی علاج نہیں۔ گویا کوئی گھر سے یتیم یاسزائے بے کس ہو۔ پانچ سال کی سخت کشمکش حیات نے اسے اتنا دل شکستہ کردیا ہے کہ شاید اپنے مطلوب کو سامنے دیکھ کر بھی اسے آنکھوں پر یقین نہ آتا۔

ایک حسینہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کہاں سے آئے ہو۔ پردیسی بیمار معلوم ہوتے ہو۔

شنکھ دھر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ بیمار تو نہیں ہوں۔ درد سے آتے آتے تھک گیا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی کھنجڑی اٹھالی اور اس پر یہ گیت گانے لگا:

مست مۓ وحدت ہوں کعبہ ہو کہ بت خانہ
ہر جانظر آتا ہے وہ جلوۂ جانا نا
ساقی میں بہک اٹھوں کم ظرف نہیں ایسا
اور دیے جاؤ تو ساغر ہو کہ پیمانہ

کعبہ کی طرف جاؤں کیا اس کی ضرورت ہے
کافی ہے کیے سجدہ مجھ کو درمے خانہ
ہاں ساقئے کوثر کا دیدار میسر ہو
لبریز ہو اے ساقی جب عمر کا پیمانہ
یوں چور ہو اے باسط تو بادۂ عرفاں سے
بن جائے تیری رہبر ہر لغزش مستانہ

اس خستہ حال نوجوان کے گلے میں اتنا لوچ تھا۔ آواز اتنی دلکش اور لہجہ اتنا مستی میں ڈوبا ہوا کہ وہ نازنینیں محویت کے عالم میں کھڑی رہ گئیں۔ کوئی کنوئیں میں کلشا ڈالے ہوئے اسے کھینچنا بھول گئی۔ کوئی کلشے میں رسی کا پھندا لگائے ہوئے اُسے کنویں میں ڈالنا بھول گئیں۔ اور کوئی کولھے پر کلشا رکھے آگے بڑھنا بھول گئی!

ایک حسینہ نے پوچھا۔ بابا جی! اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔ یہیں ٹھیر جاؤنا آگے تو بہت دور تک کوئی گاؤں نہیں ہے۔

شنکھ دھر۔آپ کی مرضی ہے ماتا جی تو یہیں ٹھیر جاؤں گا۔ یہاں مہاتما تو نہیں رہتے؟

عورت نے کہا۔ نہیں۔ یہاں تو کوئی سادھو سنت نہیں ہیں۔ ہاں مندر ہے۔

دوسری بولی۔ ابھی کئی دن ہوئے۔ ایک مہاتما آکر ٹکے تھے۔ مگر کل چلے گئے۔

ایک بڑھیا نے کہا۔ سادھو سنت تو بہت دیکھے۔ مگر ایسا اپکاری آدمی نہیں دیکھا۔ تمھارا گھر کہاں ہے بیٹا؟

شنکھ دھر۔ کہاں بتاؤں ماتا! یوں ہی گھومتا پھرتا ہوں۔

بڑھیا۔ تمھارے ماں باپ تو ہوں گے؟

شنکھ دھر۔ کچھ معلوم نہیں۔ پانچ سال ہوئے۔ باپ کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ تب سے ان کا حال بھی نہیں معلوم۔

بڑھیا۔ تمھارے باپ کیوں چلے گئے؟

شنکھ دھر۔ دنیا کے جھگڑوں میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے اور کیا؟ پانچ سال سے تلاش کررہا ہوں پر کہیں پتہ نہیں چلا۔

ایک جوان عورت نے اپنی سہیلی کے کندھے سے منہ چھپا کر کہا۔ ان کا بیاہ تو ہو گیا ہو گا؟

سہیلی شنکھ دھر کے منہ کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ یکایک وہ ضعیفہ سے بولی۔ اماں ! ان کی صورت مہاتما سے ملتی ہے کہ نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا ہے۔

بڑھیا۔ ہاں! کچھ کچھ معلوم تو ہوتا ہے۔ کیوں بیٹا! تمھارے باپ کی عمر کیا ہے۔

شنکھ دھر۔ یہی کوئی 40 سال کی ہوگی۔

بڑھیا۔ آنکھیں خوب بڑی بڑی ہیں؟

شنکھ دھر۔ ہاں ماتا جی! اتنی بڑی آنکھیں تو میں نے کسی کی دیکھی ہی نہیں!

بڑھیا۔ لمبے لمبے گورے آدمی ہیں؟

شنکھ دھر کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ بولا۔ ہاں ماتا جی! ٹھیک ایسے ہی ہیں۔

بڑھیا۔ اچھا۔ داہنی طرف ماتھے پر کسی چوٹ کا داغ ہے؟

شنکھ دھر۔ ہو سکتا ہے ماتا جی۔ میں نے تو صرف ان کی تصویر دیکھی ہے۔ تب تو میں کل دو تین سال تھا۔ کچھ بتا سکتی ہو۔ وہ مہاتما کدھر گئے؟

بڑھیا۔ یہ تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ پر وہ اُتر کی طرف گئے ہیں۔ تم سے کیا کہوں بیٹا! مجھے تو انھوں نے موت کے منہ سے نکال لیا۔ ندی میں نہانے گئی تھی۔ پیر پھسل گیا۔ مہاتما جی کنارے بیٹھے دھیان کر رہے تھے۔ مجھے ڈبکیاں کھاتے دیکھا تو جھٹ پانی میں کود پڑے اور مجھے نکال لیا۔

ایک حسینہ نے کہا۔ یہاں ان کی ایک تصویر بھی رکھی ہوئی ہے۔

بڑھیا۔ ہاں۔ اس کی تو مجھے یاد ہی نہ رہی تھی۔ اس گاؤں کا ایک آدمی بمبئی میں تصویر بناتا ہے۔ اسی نے اس کی تصویر اتارلی۔ نہ جانے اس کے پاس کیسی ڈبیا ہے کہ جس کے سامنے کھولو۔ اس کی تصویر کھینچ جاتی ہے۔

شنکھ دھر نے بے تاب ہوکر کہا۔ ذرا وہ تصویر مجھے دکھادیجیے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

حسینہ لپکی ہوئی گھر گئی اور ایک لمحہ میں تصویر لے کر لوٹ آئی۔ شنکھ دھر کی اس وقت عجیب حالت تھی۔ اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تصویر دیکھے۔ کہیں یہ

چکردھر کی تصویر نہ ہو۔ تو اُسے کتنا صدمہ ہوگا۔ اگر انھیں کی تصویر ہوئی تو وہ کیا کرے گا؟ وہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے گا۔ اسے غش تو نہ آجائے گا؟ اگر یہ چکردھر کی تصویر ہوئی۔ تو شنکھ دھر کو ایک نئی فکر پیدا ہوجائے گی۔ کیا وہ چکردھر کے پاس جائے گا؟ جاکر کیا کہے گا؟اسے وہ پہچان بھی سکیں گے؟ اسے دیکھ کر وہ خوش ہوں گے یا دھتکار دیں گے؟ اس طرح سے سینکڑوں سوالات اس کے دل میں پیدا ہونے لگے۔ بڑھیا نے جب وہ تصویر اس کے ہاتھ میں دی۔ تو اس نے دل کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر تصویر پر ایک سہمی ہوئی نگاہ ڈالی اور فوراً پہچان گیا۔ ہاں یہ چکردھر ہی کی تصویر تھی۔ شنکھ دھر کے اعضاء جیسے شل ہوگئے۔ دل کی حرکت جیسے بند ہوگئی۔ امید اور بیم فکر اور پریشانی سے مغلوب ہوکر وہ سکتہ کے عالم میں کھڑا ہوگیا۔

بڑھیا نے پوچھا۔ بیٹا! کچھ پہچان رہے ہو؟

شنکھ دھر نے کوئی جواب نہ دیا۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں!

دفعتاً اس نے نیند سے جاگے ہوئے آدمی کی طرح پوچھا۔ آپ نے کہا۔ وہ اُتر کی طرف گئے ہیں۔ آگے کوئی گاؤں پڑے گا۔

بڑھیا۔ ہاں بیٹا! پانچ کوس پر ایک گاؤں ہے "سائیں گنج"۔ لیکن آج تو تم یہیں ٹھیرو گے؟

شنکھ دھر نے صرف اتنا ہی کہا۔ نہیں ماتا جی! اب اجازت دیجیے۔ اور کھنجری اٹھاکر چل کھڑا ہوا۔ عورتیں تاکتی ہی رہ گئیں۔

-(43)

رات کی اس عمیق اور شدید تاریکی میں شنکھ دھر بھاگا چلا جارہا تھا۔ پاؤں پتھر کے ٹکڑوں سے چھلنی ہوگئے تھے۔ سارا جسم غلبہ ماندگی سے چور چور ہوگیا تھا۔ بھوک کے مارے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا جاتا تھا۔ اور پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ پیر کہیں رکھتا تھا۔ کہیں پڑتے تھے۔ پر گرتا پڑتا بھاگتا چلا جاتا تھا۔ اگر وہ طلوع سحر تک سائیں گنج نہ پہنچا۔ تو ممکن ہے چکردھر کہیں اور چلے جائیں اور اس بیکس کی پانچ سال کی پریشانی اور دوادوش خاک میں مل جائے۔

خونخوار درندوں کی مہیب صدائیں کان میں آتی تھیں اور اس کا خون سرد ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں گڈھا اور ٹیلے میں تمیز نہ ہوتی تھی۔ پر وہ جان ہتھیلی پر لیے ہوئے تھا۔ دُھن تو یہ کہ سورج دیوتا کے درشن سائیں گنج میں ہوں۔

افق مشرق میں سرخی چھا گئی۔ تارے کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح آنکھیں بند کر کے آرام کرنے لگے۔ چڑیاں شاخوں پر چہکنے لگیں۔ پر سائیں گنج کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دفعتاً ایک بہت دور کی پہاڑی پر چند چھوٹے چھوٹے مکان لڑکیوں کے گھروندوں کی طرح نظر آئے۔ وہ سائیں گنج آگیا۔ شنکھ دھر کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے نیم جان جسم میں غیر معمولی چستی پیدا ہوگئی۔ اس نے اور تیزی سے قدم اٹھائے اور آگے بڑھا۔ وہ سامنے مسافر کی منزل ہے۔ پہاڑی کی چڑھائی دشوار تھی۔ نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا کہ اس سے راستہ پوچھے۔ مگر وہ کمر بند باندھ کر اُوپر چلا جارہا تھا۔

ایک آدمی نے اوپر سے آواز دی۔ ادھر سے کہاں آتے ہو بھائی؟ راستہ پچھم کی طرف سے ہے۔ کہیں پاؤں پھسل جائے تو دو سو ہاتھ نیچے جاؤ۔

لیکن شنکھ دھر کو ان باتوں کے سننے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ اتنی تیزی سے اوپر چڑھ رہا تھا کہ اس آدمی کو حیرت ہوئی۔ اس نے سمجھا ضرور کوئی اجنبی آدمی ہے۔ شنکھ دھر اوپر پہنچ گیا تو اس نے کہا۔ دیکھنے میں تو ایک ہڈی کے آدمی ہو۔ پر ہو ہمتی۔ کہاں گھر ہے؟

شنکھ دھر نے دم لے کر کہا۔ باوا بھگوان داس ابھی یہاں ہیں؟

کسان۔ کون بابا بھگوان داس؟ یہاں تو کبھی نہیں آئے۔ تم کہاں سے آئے ہو؟

شنکھ دھر۔ بابا بھگوان کو نہیں جانتے۔ وہ اسی گاؤں میں تو آئے ہیں۔ سائیں گنج یہی ہے نا؟

کسان۔ سائیں گنج۔ ارے ارے سائیں گنج تو تم پورب چھوڑ آئے۔ اس گاؤں کا نام تو بندو ہے۔

شنکھ دھر نے مایوس ہو کر کہا کہ سائیں گنج یہاں سے کتنی دور ہے؟

کسان۔ سائیں گنج پڑے گا یہاں سے پانچ کوس۔ مگر راستہ بیہڑ ہے۔

شنکھ دھر کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ پانچ کوس کی منزل اس پر راستہ بیہڑ۔ اس نے آسمان کی طرف ایک بار حسرت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اگر اس موقعہ پر ان کے درشن نہ ہوئے۔ تو پھر شاید کبھی نہ ہوں۔ ساری زندگی تلاش ہی میں گذر جائے گی۔ دم لینے کا موقعہ نہ ہیں۔ آج یا تو اس تپسیا کا خاتمہ ہو جائے گا، یا اس زندگی کا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کسان نے پوچھا۔ کیا چل دیے بھائی۔ چلم ولم تو پی لو۔

لیکن شنکھ دھر اس کے پہلے ہی چل چکا تھا۔ وہ کچھ نہیں دیکھتا۔ کچھ نہیں سنتا۔ کسی اندھی طاقت کی طرح خاموش چلا جارہا ہے۔ بسنت کے ٹھنڈے فرحت بخش جھونکے کسی مہربان ماں کی طرح درختوں کے ہنڈولے میں جھلا رہے ہیں۔ نوزائیدہ کونپلیں اس کی گود میں بیٹھی مسکرارہی ہیں۔ چڑیاں انھیں گاگا کر لوریاں سنارہی ہیں۔ آفتاب کی سنہری کرنیں ان کے بوسے لے رہی ہیں۔ ساری فطرت ماما کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ صرف ایک بدنصیب ہے جس پر اس کا کوئی اثر نہیں اور وہ شنکھ دھر ہے۔

شنکھ دھر سوچ رہا ہے۔ اب کے پھر کہیں راستہ بھولا تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اچھا ان کے درشن ہوگئے تو ان کے سامنے وہ جا بھی سکے گا یا نہیں۔ وہ اسے دیکھ کر ناراض تو ہوں گے۔ وہ ان سے کہے گا کیا۔ وہ اسے گھر واپس جانے کی ترغیب دیں گے۔ شاید گھر والوں کی انھیں یاد بھی نہ ہو۔ لیکن کیا اماں کی حالتِ زار پر انھیں مطلق رحم نہ آئے گا کیا۔ جب وہ سنیں گے کہ رانی اماں سوکھ کر کانٹا ہورہی ہیں۔ نانا روتے روتے اندھے ہوگئے۔ ان کا نہ پسیجے گا وہ دل جو غیروں کے درد سے لبریز ہے۔ کیا اپنوں کا درد اسے بالکل نہ ہوگا۔

انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا شنکھ دھر دھاوا مارے چلا جا رہا تھا۔ آخر دوپہر ہوتے ہوتے اُسے دور سے ایک مندر کا کلس نظر آیا۔ ایک چرواہے سے پوچھا۔ کون گاؤں ہے؟ اس نے کہا۔ سائیں گنج۔ سائیں گنج آگیا۔ وہ مقام جہاں اس کی قسمت کا

فیصلہ ہونے والا تھا۔ جہاں اس بات کا فیصلہ ہونے والا تھا کہ وہ راجہ بن کر راج کرے گا یا فقیر بن کر بھیک مانگے گا۔

لیکن جوں جوں گاؤں قریب آتا تھا۔ شنکھ دھر کے پاؤں سست پڑتے جاتے تھے۔ اُسے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ یہاں سے بھی نہ چلے گئے ہوں۔ وہ اس خیال کو کتنا ہی دل سے نکالنا چاہتا تھا۔ پر وہ اپنا آسن نہ چھوڑتا تھا۔ اچھا بالفرض ان سے یہاں ملاقات نہ ہوئی تو وہ اور آگے جاسکے گا۔ نہیں اب اس میں ایک قدم چلنے کی بھی قوت نہیں ہے۔ اگر ملاقات ہوگی تو یہیں ہوگی۔ ورنہ پھر کوئی امید نہیں۔ اچھا اگر ملاقات ہوتے ہی انھوں نے اسے پہچان لیا تو شاید اس کی طرف سے منہ پھیر لیں۔ تب وہ کیا کرے گا۔ کیا اس کی حالت میں بھی وہ ان کے قدموں کو بوسہ دے سکے گا۔ انھیں اپنا قصۂ غم سنا سکے گا۔ ہرگز نہیں۔ تب تو اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔ آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گرے گی۔ مگر کیا وہ اتنے بے رحم، اتنے سنگ دل ہوجائیں گے۔ ایسا ممکن نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے فرض کا جو اونچا معیار اپنے سامنے رکھا ہے اور جس بے غرض خدمت کے لیے انھوں نے راج پاٹ ترک کردیا ہے وہ ان کے جذبات کو زبان تک نہ آنے دے۔ اپنے پیارے لڑکے کو سینے سے لگانے کے لیے بے تاب ہوکر بھی وہ چھاتی پر پتھر کی سل رکھ کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیں۔ کچھ بھی ہو۔ اتنی دور آکر اب ان کی زیارت کیے بغیر نہ لوٹے گا۔

سائیں گنج سامنے دکھائی دینے لگا۔ کھیتوں میں زن ومرد اناج کاٹتے نظر آنے لگے۔ اب وہ گاؤں کے ڈانوں پر پہنچ گیا۔ کئی آدمی اس کے سامنے سے ہوکر نکل بھی گئے۔ پر اس نے کسی سے پوچھا نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ بابا جی نہیں ہیں۔تو وہ کیا کرے گا۔ اگر یہی کہہ دیا کہ بابا جی ہیں۔ تب وہ کیا کرے گا۔ اس حیص بیص میں پڑاہوا وہ اس منزل کے پاس جاکر ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ زبان پر سکوت کی مہر لگی ہوئی تھی۔

یکایک ایک آدمی کو مندر سے نکلتے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ پھر اٹھا کہ اس کے پیروں پر گر پڑے۔ مگر پیر تھرا گئے۔ معلوہوا کہ کوئی ندی اس طرف بہتی چلی آتی

ہے وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

یہ آدمی کون تھا؟ وہی جس کی تصویر اس کے دل پر نقش تھی۔

(44)

بدنصیب اہلیا کے لیے سنسار سُونا ہوگیا۔ شوہر کو پہلے ہی کھوچکی تھی۔ زندگی کا سہارا ایک لڑکا تھا، اسے بھی کھو بیٹھی۔ اب وہ کس کامنہ دیکھ کر جئے۔ وہ راج اس کے لیے کسی فقیر کی بددعا ہوگئی۔ شوہر اور بیٹے کو پاکر اب وہ ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں بھی کتنے سکھ سے رہے گی۔

اہلیا کو اب وہ قصر شاہی پھاڑے کھاتا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ کوئی گلا سڑا جھونپڑا کسی درخت کا سایہ، کسی پہاڑ کا غار، کسی ندی کا کنارا، کسی جنگل کا دامن اس کے لیے اس محل سے کہیں زیادہ سکون بخش ہوتا۔ وہ دن کتنے مبارک تھے جب وہ اپنے سوامی کے ساتھ اپنے لخت جگر کو سینہ سے لگائے ایک چھوٹے سے شکستہ حال گھر میں رہتی تھی۔ کیاوہ دن پھر نہ آویں گے؟ وہ منحوس گھڑی تھی۔ جب اس نے اس گھر میں قدم رکھا۔ آہ! جب اس کا شوہر اس سے رخصت ہونے لگا۔ وہ اس کے ساتھ ہی کیوں نہ چلی گئی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ جس بیٹے کے لیے اس نے شوہر کو چھوڑا۔ وہ بھی اسے چھوڑ کر چلاجائے گا۔

وہ ایوان شاہی اب بھوتوں کا ڈیرا ہوگیا ہے۔ گویا اس کا نگران نہیں رہا۔ راجہ صاحب مہینوں نہیں آتے۔ وہ بیشتر علاقہ ہی میں گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے مظالم کی داستانیں سن کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ساری ریاست میں طوفان سا برپا ہے۔ کہیں کسی موضع میں آگ لگائی جاتی ہے۔ کہیں کسی گانوں کے کنوئیں ناپاک کیے جاتے ہیں۔ راجہ صاحب کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ ان کے سارے نازک احساسات شنکھ دھر کے ساتھ چلے گئے۔ مشیت نے بے وجہ ان پر یہ قہر ڈھایا ہے۔ جب ان کے حالِ زار پر اسے رحم نہیں آتا، جو رحیم اور کریم مشہور ہے۔ تو وہ کیوں کسی پر رحم کریں۔ اگر دست غیب نے ان کے گھر میں آگ لگائی ہے۔ تو وہ بھی دوسروں کے گھر میں آگ لگائیں گے۔ اگر اس نے انھیں رلایا ہے تو وہ بھی دوسروں کو

رلائیں گے۔ جس کا گھر بالکل اجڑ گیا۔ اُسے کس کا خوف؟

اب راجہ صاحب کے پاس جانے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہوتا۔ منورما کو دیکھ کر وہ جل اٹھتے ہیں۔ اہلیا بھی ان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے تھر تھر کانپتی ہے۔ اپنے پیاروں کی تلاش کے لیے وہ طرح طرح کے منصوبے باندھا کرتی ہے۔ مگر کہے کس سے؟ اب اُسے بار بار خیال آتا ہے کہ اگر وہ ثروت کی ہوس میں شوہر سے بے اعتنائی نہ کرتی، تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ سوچتی ہے۔ اگر میں اپنے گھر چلی جاؤں تو شاید ایشور میری خطا معاف کردیں۔ اس کا ڈوبتا ہوا دل اس تنکے کے سہارے کوزوروں سے پکڑے ہوئے ہے۔ لیکن ہائے رے نفس! اس عذاب میں غرور کا جنون سر پر سوار ہے۔ جانا چاہتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی بلاوے۔ اگر راجہ صاحب منشی جی سے اشارہ کردیں تو فوراً بلاوا آجاوے۔ لیکن راجہ صاحب سے کچھ کہنے کا یا تو موقع نہیں ملتا یا ہمت نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اگر منورما سے یہ راز کہہ دیتی تو منشا پوری ہوجاتی لیکن منورما سے اس کا دل نہ پہلے کبھی ملا تھا، نہ اب ملتا تھا۔ جو منورما اب گانے بجانے اور سیر وتفریح میں مگن رہتی ہے۔ اس سے وہ اپنا درد دل کیسے کہہ سکتی ہے؟ وہ دن کے دن پڑی بسورا کرتی ہے۔ منورما کبھی بھول کر بھی اس کی بات نہیں پوچھتی۔ اپنے راگ رنگ میں بھولی ہوئی ہے۔ پرائی پیڑ کیا جانے؟

مگر کیا منورما واقعی راگ رنگ میں بھولی ہوئی ہے؟ بظاہر تو صحیح ہے لیکن دل کی کون جانے۔ وہ امید اور یاس، سکون اور اضطراب ، متانت اور شوخی۔ ضبط اور درد کا عجیب معمہ بن گئی ہے۔ اگر وہ دل سے ہنستی اور گاتی ہے تو اس کے حسن کی وہ چمک کہاں ہے۔ جو چاند کو لجاتی تھی، وہ تیزی کہاں ہے، جو ہرن کو ہراتی تھی۔ وہ سوز باطن کی اس حد تک پہنچ گئی ہے۔ جب فکر اور آرزو، شرم اور خودداری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس نے کچی عقل میں شباب جیسا انمول رتن دے کر جو سونے کی گڑیا خریدی تھی۔ وہ کسی چڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں سے اڑگئی تھی۔ اور جس ہمجولی کے لیے وہ گڑیا خریدی تھی۔ وہ پہلے ہی روٹھ گئی تھی۔ کچھ دنوں اکیلی ہوس کو سہیلی بنائے گڑیا کھیلتی رہی۔ اور آج وہ گڑیا بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ قیمت کی یہ عشوہ گری رونے کی چیز نہیں

، ہنسنے کی چیز ہے۔ ہم عارضی درد میں ہی روتے ہیں۔ مزمن درد میں ہم خوب ہنستے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ ہنستے ہیں۔ جتنا ہم انتہائی مسرت میں ہنستے۔ ہماری خوشی جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے پاس قسمت کی ستم شعاریوں کا اس کے سوا اور جواب ہی کیا ہے؟ روشنی جب ہماری قوت برداشت سے باہر ہوجاتی ہے تو وہ مبدل بہ تاریکی ہوجاتی ہے۔ کیونکہ ہماری آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔

ایک دن اہلیا کا دل اتنا بے قرار ہوا کہ وہ شرم اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر منورما کے پاس آبیٹھی۔ منورما کے روبرو سائل کی صورت میں آنے میں اُسے جو روحانی خلش ہوئی۔ اس کا اندازہ اسی سے کیاجاسکتا ہے کہ اپنے کمرے سے یہاں تک آنے میں اُسے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ کتنی ہی بار دروازہ تک آکر لوٹ گئی۔ جس سے ہمیشہ بدظن رہی۔ اس کے سامنے اپنی غرض لے کر جانے میں اس کی موت ہوئی جاتی تھی۔ لیکن جب بھگوان نے ہی اس کے غرور کو پامال کردیا تو اب جھوٹی اینٹھ سے کیا ہوسکتا تھا۔

منورما نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ کیا رورہی تھیں اہلیا! یوں کب تک روتی رہوگی؟

اہلیا نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ جب تک بھگوان رلاویں۔

کہنے کو تواہلیا یہ کہہ گئی۔ مگر اس سوال سے اس کا غرور جاگ اٹھا اور وہ پچھتائی کہ ناحق آئی۔

منورما نے بے دردی سے کہا۔ تب تو اور ہنسنا چاہیے۔ جس میں درد نہیں۔ اس کے سامنے روکر دیدہ کیوں کھوتی ہو۔ بھگوان اپنے گھر کا بھگوان ہوگا۔ کوئی اس کے رُلانے سے کیوں روئے؟ ایک بار ٹھان لو کہ اب نہ روؤگی۔ پھر دیکھوں کیسے رونا آتا ہے؟

اہلیا سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ بولی۔ تم تو جلے پر نمک چھڑکتی ہو رانی جی! تمھارا جیسا دل کہاں سے لاؤں؟ اور پھر روتا وہی ہے جس پر پڑتی ہے۔ جس پر پڑی ہی نہیں وہ کیوں روئے گا۔

منورما ہنسی۔ وہ ہنسی جو یا تو دیوانہ ہی ہنس سکتا ہے یا فرزانہ ہی۔ بولی۔ اگر بھگوان کسی کو رلاکر ہی خوش ہوتا ہے تو وہ عجیب چیز ہے۔ اور کوئی ماں یا باپ اپنی اولاد کو

رلاتے دیکھ کر خوش ہو، تو تم اُسے کیا کہوگی۔ بولو۔ تمھارا جی چاہے گا کہ ایسے آدمی کا منہ نہ دیکھوں۔ کیا بھگوان ہم سے اور تم سے بھی گیا گذرا ہے۔ آؤ بیٹھ کر گائیں۔ اس سے بھگوان خوش ہوں گے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں سب کے بھلے کے لیے ہی کرتے ہیں۔ تمھیں ایک بھیرویں سناؤں گی۔ دیکھو۔ میں کیسا اچھا گاتی ہوں۔

اہلیا نے اس کی بات کو ان سنی کرکے کہا۔ میں اس وقت آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں۔ مجھے ایسا گمان ہورہا ہے کہ یہ ساری گردش میری ہوس ثروت کا پھل ہے۔ جب تک ثروت سے میرا گلانہ چھوٹے گا۔ مجھے اس عذاب سے نجات نہ ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے یہاں سے نکل کر میری مرادیں پوری ہوں گی۔ آپ اتنی تکلیف کریں کہ اماں سے کہہ دیں مجھے بلالیں۔

منورما کو اہلیا سے آج سچی ہمدردی ہوئی۔ کون جانے اہلیا کے دل میں یہ غیبی تحریک ہو۔ اس نے اسی دن جاکر نرملا سے یہ ذکر کیا اور دوسرے ہی دن منشی بجردھر نے راجہ صاحب کے پاس رخصتی کا پیغام بھیجا۔ راجہ صاحب علاقہ پر تھے۔ پیغام پاتے ہی جگدیش پور آئے۔ اہلیا کا کلیجہ دھک دھک کررہاتھا کہ کہیں راجہ صاحب سے سامنانہ ہوجائے۔ ادھر ادھر جھینپتی پھرتی تھی۔ اسے معلوم ہوگیاتھا کہ راجہ صاحب نے اس کی رخصتی منظور کرلی ہے۔ پر اب نہ جانے کیوں وہ جانے کے لیے بہت بیتاب نہ تھی۔ یہاں سے جانا تو چاہتی تھی، پر جاتے صدمہ ہوتا تھا۔ یہاں آئے اُسے ۱۴ سال ہوگئے۔ اس گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھنے لگی تھی۔ سسرال کے لیے پرایا گھر تھا۔ لیکن نرملا نے کوئی لگتی ہوئی بات کہہ دی تو وہ کیا کرے گی۔ جس گھر سے روٹھ کر نکلی تھی۔ مجبور ہوکر پھر وہیں جانا پڑرہا تھا۔ ان خیالات نے اسے اتنا سراسیمہ کیا کہ آخر وہ راجہ صاحب کے پاس جاکر بولی۔ آپ مجھے کیوں رخصت کرتے ہیں۔ میں نہیں جانا چاہتی۔

راجہ صاحب نے ہنس کر کہا۔ کوئی لڑکی ایسی بھی ہے جو خوشی سے سسرال جاتی ہو؟ اور کون باپ ایسا ہے جو لڑکی کو خوشی سے رخصت کرتا ہو۔ میں کب چاہتا ہوں کہ تم جاؤ۔ لیکن منشی بجردھر کا حکم ہے اور اس کی تعمیل مجھ پر فرض ہے۔ وہ لڑکے کے باپ ہیں۔ میں لڑکی کاباپ ہوں۔ میری اور ان کی کیا برابری۔ اور بیٹی !

میرے دل میں بھی ارمان ہیں۔ انھیں پورا کرنے کا اور کون موقعہ آئے گا۔ شنکھ دھر ہوتا تو اس کی شادی میں یہ ارمان پورے ہوتے۔ اب تمھارے گونے میں پورے ہوں گے۔

اہلیا اس کا کیا جواب دیتی؟

دوسرے دن سے راجہ صاحب نے رخصتی کی تیاریاں شروع کیں۔ سارے علاقے کے سنار پکڑ بلائے گئے اور زیور بننے لگے۔ علاقہ ہی کے درزی کپڑے سینے لگے۔ گھر کی صفائی، سفیدی اور رنگائی ہونے لگی۔ راجاؤں، رئیسوں اور افسروں کے نام نوید بھیجے جانے لگے۔ سارے شہر کے طایفوں کو بیعانے دے دیے گئے۔ برقی روشنی کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ ایسامعلوم ہوتا ہے گویا کسی بڑی بارات کی مہمانداری کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ اہلیا یہ اہتمام دیکھ کر دل میں شرماتی اور جھنجھلاتی تھی۔ سوچتی کہاں سے کہاں میں نے رخصتی کانام لیا۔ اب اس بڑھاپے میں میرا گونا ہورہا ہے۔ میں مرنے کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ یہاں رخصتی کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ کون جانے شاید یہ آخری رخصتی ہی ہو۔ راجہ صاحب اہتمام میں ایسے منہمک ہیں کہ کسی سے بات کرنے کی بھی انھیں فرصت نہ تھی۔ کہیں سوناروں کے پاس بیٹھے اچھی نقاشی کرنے کی تاکید کررہے ہیں۔ کہیں درزیوں کے پاس بیٹھے مہین بخیے پر زور دے رہے ہیں۔ کہیں جوہریوں کے پاس بیٹھے جواہرات پرکھ رہے ہیں۔ ان کے ارمانوں کا وار اپار نہ تھا۔ من کی مٹھائی گھی شکر کیا مٹھائی سے کم لذیذ نہیں ہوتی۔

(45)

شنکھ دھر کو ہوش آیا تو اس نے اپنے کو مندر کے برآمدے میں چکردھر کی گود میں پڑاپایا۔ چکردھر تشویشناک نگاہوں سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے کئی آدمی آس پاس کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ آہ! آج کتنے دنوں کے بعد شنکھ دھر کو یہ نعمت ملی ہے۔ وہ باپ کی گود میں لیٹا ہوا ہے۔ آسمان کے بسنے والو؟ تم پھولوں کی برکھا نہیں کرتے۔

شنکھ دھر نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی جان حزیں اس وقت ایک روحانی

طراوت، ایک پر کیف سرور اور وجدانی سکون کا احساس کر رہی تھی۔ اس پُر خلش مزے کو وہ اتنی جلد نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی حرماں نصیب ماں کی یاد آئی۔ اس مبارک دن کا خواب دیکھنے لگا۔ جب وہ اپنی ماں کو بھی باپ کے درشن کرائے گا اس کی نامراد زندگی کو اس حسرت سے ہم آغوش کرے گا۔

چکردھر نے پیار کی مٹھاس میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا۔ کیوں بیٹا! اب طبیعت کیسی ہے؟

شنکھ دھر الجھن میں پڑا کیا جواب دے۔ اگر کہتا ہے اچھا ہوں۔ تو اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہوتا ہے۔ اس نے خاموش رہنا ہی مصلحت سمجھی۔ کچھ جواب دینا بھی چاہتا۔ تو اس کے منہ سے الفاظ نہ نکلتے۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ ان قدموں پر سر رکھ کر خوب روئے۔ اس سے بڑی مسرت کا وہ قیاس ہی نہ کر سکتا تھا۔

دنیا کی کوئی چیز کبھی اتنی خوش آئند تھی؟ ہوا اور روشنی، درخت اور جنگل زمین اور آسمان کبھی اتنے دلکش نہ تھے۔ ان کی کیفیت کچھ اور ہوگئی تھی۔ ان میں کتنی کشش تھی۔ کتنی وجدانیت۔

چکردھر نے پھر پوچھا۔ کیوں بیٹا! کیسی طبیعت ہے؟

شنکھدھر نے دبی ہوئی زبان سے کہا۔ اب تو اچھا ہوں۔ ایک لمحہ کے بعد وہ پھر بولا۔ آپ کے درشنوں کے لیے سیتاوار سے آیا ہوں۔ میں نے بیدوں میں آپ کی خبر پائی تھی۔ وہاں معلوم ہوا کہ آپ سائیں گنج چلے گئے۔ وہاں سے سائیں گنج چلا۔ ساری رات چلتے گذر گئی۔ مگر سائیں گنج نہ ملا۔ ایک دوسرے گاؤں میں جا پہنچا۔

چکردھر۔ رات کو کہیں ٹھیرے نہیں؟

شنکھ دھر۔ یہی خوف تھا کہ شاید آپ کہیں اور نہ چلے جائیں۔

چکردھر۔ کچھ کھایا بھی نہ ہوگا؟

شنکھ دھر۔ کھانے کی تو زیادہ خواہش نہ تھی۔ آپ کے درشن ہوگئے۔ میری مراد پوری ہوگئی۔ ساری مصیبتیں کٹ جائیں گی۔

چکردھر نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ بیٹا! مصیبتوں کا کاٹنے والا ایشور ہے۔ میں اس کا ایک ناچیز سیوک ہوں۔ لیکن پہلے کچھ کھا کر آرام سے سو رہو۔ مجھے کئی مریضوں

کو دیکھنے جانا ہے۔ میں شام کو لوٹوں گا تو تم سے باتیں ہوں گی۔ میری وجہ سے تمھیں اتنی تکلیف ہوئی۔ اس کا افسوس ہے!

شنکھ دھر نے عقیدت مندانہ لہجہ میں کہا۔ مجھے تو یہ سرگ یاترا سی معلوم ہوتی تھی۔ بھوک، پیاس وتکان ایک کا نام بھی نہ تھا۔

چکردھر کو اپنی تکلیف پر قابو نہ رہا۔ اس نوجوان کے بشرے اور انداز گفتگو میں نہ جانے ایسی کون سی بات تھی۔ جو انھیں اپنی جانب مائل کررہی تھی۔ ان کے دل میں اس کی داستان سننے کو بے تاب کن اشتیاق پیدا ہوا۔ مریضوں کو دیکھنے جانا چاہتے تھے مگر نفس بہانے ڈھونڈنے لگا۔ مریضوں کو دوا تو دے ہی آیا ہوں۔ ان کی حالت بھی کچھ زیادہ تشویشناک نہیں۔ جانا فضول ہے۔ ذرا پوچھنا چاہیے۔ کون ہے؟ کیوں مجھ سے ملنے کے لیے اتنا بے قرار تھا۔ کتنا ذی شعور لڑکا ہے۔ انداز گفتگو میں کتنا انکسار بھرا ہوا ہے۔ کسی اونچے خاندان کا چراغ ہے۔

لیکن پھر سوچا۔ میرے نہ جانے سے مریضوں کو کتنی مایوسی ہوگی۔ کون جانے ان کی حالت خراب ہوگئی ہو۔ تب تک یہ لڑکا بھی آرام کرے گا۔ بے چارہ ساری رات چلتا رہا۔ میں جانتا تو بیدوں ہی میں ٹِک گیا ہوتا۔

ایک آدمی پانی لایا۔ شنکھ دھر نے ہاتھ دھویا اور لوٹے کو منہ سے لگا کر پانی پینا چاہتا تھا کہ چکردھر بول اٹھے۔ ہاں۔ ہاں یہ کیا؟ ابھی پانی نہ پیو! رات کو کچھ کھایا نہیں اور باسی منہ پانی پینے لگے۔

شنکھ دھر۔ بڑی پیاس لگی ہے۔

چکردھر۔ پانی کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔ کچھ کھا کر پیو!

شنکھ دھر۔ دو ہی گھونٹ پی لوں۔ نہیں رہاجاتا۔

چکردھر نے اس کے ہاتھ سے لوٹا چھین لیا اور سخت ہوکر بولے۔ ابھی تم ایک قطرہ پانی نہیں پی سکتے۔ منع کرتا ہوں تو مانتے نہیں۔

شنکھ دھر کو اس تنبیہ میں جو مزا آیا۔ وہ ماں کی لاڈ پیار کی باتوں میں بھی نہ آیا۔ پانچ سال ہوئے جب سے وہ اپنے من کی کرتا آیا ہے۔ وہ جو پاتا ہے کھاتا ہے۔ جب چاہتا ہے پانی پیتا ہے۔ جہاں جگہ پاتا ہے۔ پڑ رہتا ہے۔ کسی کو اس کی پرواہ نہیں

ہوتی۔ لوٹا ہاتھ سے نہ چھین گیا ہوتا تو وہ بغیر دوچار گھونٹوں کا مزا لیے نہ رہتا۔

مندر کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغ اور کنواں تھا۔ وہیں ایک درخت کے نیچے چکردھر کا کھانا پکتا تھا۔ چکردھر اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ برتن بھی آپ ہی دھوتے تھے۔ شنکھ دھر ان کے ساتھ کھانے گیا تو دیکھا۔ تھالی میں پوری مٹھائی۔ دودھ۔ دہی۔ گھی سب کچھ ہے۔ اس کی رال ٹپکنے لگی۔ ان نعمتوں کے مزہ چکھے ہوئے اُسے ایک مدت گذر گئی۔ مگر اسے کتنی حیرت ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ ساری چیزیں اسی کے لیے مخصوص ہیں۔ چکردھر خود روکھی روٹیاں اور بھاجی لے کر بیٹھے۔

شنکھ دھر نے کہا۔ آپ تو سب کچھ مجھی کو دیے دیتے ہیں۔ اپنے لیے کچھ رکھا ہی نہیں۔

چکردھر۔ میرے لیے یہ روٹیاں کافی ہیں۔ یہی میری خوراک ہے۔

شنکھ دھر۔ تو مجھے بھی روٹیاں ہی دیجیے۔

چکردھر۔ بیٹا! میں تو روٹیوں کے سوا اور کچھ نہیں کھاتا۔ میرا ہاضمہ کمزور ہے۔ دن میں صرف ایک بار کھاتا ہوں۔

شنکھ دھر۔ میری خوراک تو تھوڑا سا ستو یا چینا ہے۔ میں نے تو مدت سے یہ نعمتیں نہیں کھائیں۔ اگر آپ نہ کھائیں گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔

آخر شنکھ دھر کے اصرار سے چکردھر کو اپنا اصول توڑنا پڑا۔ سولہ برسوں کا پالا ہوا اصول جسے بڑے بڑے رئیسوں اور راجاؤں کا پُر عقیدت اصرار بھی نہ توڑ سکا تھا۔ آج اس اجنبی لڑکے کے ہاتھوں ٹوٹ گیا۔ انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔ تم تو بڑے ضدی معلوم ہوتے ہو؟ اچھا لو میں بھی لیے لیتا ہوں۔ اب تو کھاؤ گے؟

انھوں نے تھالی کی ہر ایک چیز میں ذرا ذرا سا نکال کر اپنے پتل میں رکھ لیا۔

شنکھ دھر۔ آپ نے تو محض رسم کی پابندی کی ہے۔ لائیے! میں پروس دوں۔

چکردھر۔ اگر تم اس طرح عذر کروگے تو میں تمھیں اپنے ساتھ نہ رکھوں گا۔

شنکھ دھر۔ مجھے کیا۔ یہیں پڑے پڑے مرجاؤں گا۔ کون کوئی رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔

یہ کہتے کہتے شنکھ دھر کی آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ چکردھر نے مجبور ہو کر کہا۔

اچھا لاؤ تمھیں اپنے ہاتھ سے دے دو بھائی! اپنے کو کوستے کیوں ہو؟
شنکھ دھر نے سبھی چیزوں سے آدھی سے زیادہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں اور آپ ایک پنکھا لے کر انھیں جھلنے لگا۔ چکردھر نے ملائمت آمیز ترشی سے کہا معلوم ہوتا ہے۔ آج تم مجھے بیمار کروگے۔ بھلا اتنی چیزیں میں کھاسکوں گا؟
شنکھ دھر۔ آپ جو کچھ چھوڑ دیں گے۔ وہ میں کھالوں گا۔ مجھے آپ کا جو ٹھا کھانے کی بڑی خواہش ہے۔
اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ چکردھر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ میرا جوٹھا کیوں کھاؤگے؟ اب تو ساری باتیں تمھاری مرضی کے مطابق پوری ہیں!
شنکھ دھر۔ مجھے تین دنوں سے یہ آرزو ہے۔ ایک مدت سے یہ موقعہ ڈھونڈ رہا تھا۔
چکردھر کو پھر ہار ماننی پڑی۔ وہ گوشۂ عافیت میں رہنے والا نفس کش، زہد پرور، عامل آج ایک اجنبی بے کس لڑکے کے احمقانہ اصرار کو کسی طرح نہ ٹال سکتا تھا۔
چکردھر جب کھانا کھاکر اٹھ گئے۔ تو وہ کھانے بیٹھا۔ آہ! اس کھانے میں آج کتنی لذت تھی۔ گھر پر تکلف سے پکے ہوئے پکوانوں میں بھی یہ لذت نہ تھی۔
چکردھر ہاتھ منہ دھو کر رقت آمیز لہجہ میں بولے۔ تم نے آج میرے دو اصول توڑ دیے۔ بغیر جانے بوجھے کسی کو مہمان بنانے کا یہی نتیجہ ہے۔ اب میں آج کہیں نہ جاؤں گا۔ تم کھانا کھالو اور مجھ سے جو کچھ کہنا ہو کہو۔ میں اپنے ضدی لڑکے کو اپنے ساتھ نہ رکھوں گا۔ تمھارا گھر کہاں ہے؟
شنکھ دھر۔ میرے تو کوئی گھر ہی نہیں۔
چکردھر۔ ماں باپ تو ہوں گے! وہ کس گاؤں میں رہتے ہیں؟
شنکھ دھر۔ یہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرے والد تو بچپن ہی میں گھر سے نکل گئے، اور والدہ کی پانچ سال سے مجھے خبر نہیں۔
چکردھر کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا زمین نیچے دھنسی جارہی ہے۔ گویا وہ لہروں میں بہے جارہے ہیں۔ بابا بچپن سے گھر سے چلے گئے۔ اور ماں کی پانچ سال سے کچھ خبر نہیں لی۔ بھگوان! کیا یہ وہی ننھا سا لڑکا ہے۔ وہی جسے دل سے نکال ڈالنے کی کوشش

کرتے ہوئے سولہ سال سے زیادہ ہوگئے۔

انھوں نے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ تم پانچ سال تک کہاں رہے۔ جو پھر نہیں گئے؟

شنکھ دھر۔ ابا جان کی تلاش میں نکلا تھا۔ اور جب تک وہ نہ ملیں گے لوٹ کر نہ جاؤں گا۔

چکردھر کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سائبان کے ستون کے سہارے بیٹھ گئے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ تمھارا نام کیا ہے بیٹا!

یہ سوال نہ تھا۔ ایک معلوم حقیقت کی تصدیق تھی۔ اس سوال کا جواب وہی ہوگا۔ جس کا امکان چکردھر کو امید وبیم کی حالت میں ڈالے ہوئے تھا۔ دنیا میں ایک ایسا ہی لڑکا ہے جسے اس کا باپ بچپن میں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ کیا ایسا ایک ہی لڑکا ہے۔ جو اپنے باپ کی تلاش میں نکلا ہو۔

شنکھ دھر نے اپنا نام بتادیا۔

''او'' تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔؟

شنکھ دھر نے باپ کا نام بھی بتادیا۔

''مکان کہا ہے''؟

''جگدیش پور''!

چکردھر کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کے بدن سے جان نکل گئی ہے اور چاروں طرف خلا ہے۔ شنکھ دھر بس یہی ایک لفظ اس فضائے بیکراں میں کسی چڑیے کی طرح چکر لگارہے۔ شنکھ دھر ایک یاد تھی جو اس بے ہوش کی حالت میں بھی اندراک کو تعلقات سے باندھے ہوئے تھی۔

(46)

راجہ بشال سنگھ نے جس اہتمام سے اہلیا کی رخصتی کی۔ وہ راجاؤں ، رئیسوں میں بھی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ تحصیلدار صاحب کے گھر میں ان چیزوں کے رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ باوجودیکہ تحصیلدار صاحب نے نیا مکان بنوایا تھا۔ مگر وہ کیا

جانتے تھے کہ ایک دن ریاست جگدیش پور کی آدھی ثروت آپہنچے گی۔ گھر کا کونہ کونہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ کئی پڑوسیوں کے مکان بھی اَٹ اُٹھے۔ اس پر لاکھوں روپے نقد ملے، وہ الگ۔ منشی جی لانے کو سب کچھ لائے پر اب اسے دیکھ دیکھ کر روتے اور کڑھتے تھے۔ کوئی بھوگنے والا نہیں۔ اگر یہ دولت آج سے ۲۵ سال پہلے ہوتی تو دل کھول کر زندگی کے مزے اُٹھاتے۔ اب ضعیفی میں لے کر کیا کریں۔ چیزوں کو بیچنا باعثِ ذلت تھا۔ ہاں احباب کی نذر جو کچھ کرسکتے تھے وہ کیا۔ اناج کی کئی گاڑیاں ملی تھیں۔ یہ سب لٹادیں۔ کئی مہینے سدابرت سا چلتا رہا۔ ملازموں کو حکم دے دیا کہ کسی آدمی کو کوئی چیز مانگے دینے سے انکار نہ کرو۔ سہالگ کے دنوں میں روز ہی ہاتھی گھوڑے، پالکیاں، فرش فروش وغیرہ آلات مانگے جاتے۔ سارے شہر میں منشی جی کا شہرہ ہوگیا۔ بڑے بڑے رئیس ان کے ملاقات کرنے آنے لگے۔ نصیب جاگے تو یوں جاگے۔ روٹیاں بھی میسر نہ ہوتی تھیں۔ آج دروازے پر ہاتھی جھومتا ہے۔ سارے شہر میں یہی چرچے تھے۔

مگر منشی جی کے دل پر جو گذر رہی تھی۔ وہ کون جان سکتا ہے۔ دل میں بیسیوں ہی بار چکردھر پر بگڑتے۔ نالائق آپ آپ گیا۔ اپنے ساتھ لڑکے کو بھی لے گیا۔ بتلاؤ یہ ہاتھی گھوڑے اور موٹروں اور گاڑیوں کو لے کر کیا کروں؟ اکیلے کس کس پر بیٹھوں۔ بہو ہے اسے ان سے فرصت نہیں۔ ماں ہے زندہ درگور۔ پہلے بے چارے شام سویرے کچھ گا بجالیتے تھے۔ کچھ سرور بھی جمالیتے تھے۔ اب ان چیزوں کی دیکھ بھال ہی میں بھور ہوجاتا۔ لمحہ بھر بھی آرام لینے کی مہلت نہ تھی۔

اہلیا یہاں آکر اور بھی پچھتانے لگی۔ وہ رنواس کی تکلیفات سے آزردہ خاطر ہوکر یہاں آئی تھی۔ پر وہ مصیبت یہاں بھی اس کے ساتھ آئی۔وہاں اسے خانہ داری سے کوئی مطلب نہ تھا۔ یہاں وہ بلا بھی سر پر آئی۔ جن چیزوں سے وہاں اُسے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ انھیں کے تلف ہوجانے کی خبر سن کر اسے رنج ہوتا تھا۔ وہاں وہ کچھ دیر اطمینان سے بیٹھ سکتی تھی۔ کچھ دیر ہنس بول کر دل بہلالیتی تھی۔ کسی کے طعنے تشنے نہ سننے پڑتے تھے۔ یہاں ایک لمحہ کے لیے بھی سکون نہ تھا۔ نرملا اس کے زخم پر نمک چھڑکتی رہتی تھی۔ بہو کے کارن وہ اپنے بیٹے سے محروم ہوئی۔ بہو ہی کے

کارن پوتا بھی ہاتھ سے گیا۔ ایسی سبز قدم بہو کو وہ اپنے گھر کی دیوی نہ سمجھ سکتی تھی۔ اس کی دولت لے کر وہ کیا کرے۔ بیٹے اور پوتے کے مقابلے میں اس دولت کی کیا ہستی تھی۔ کھانا بھی وہ اپنے ہاتھوں ہی پکاتی۔ ان دنوں منگلا بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ یہاں کی ساری چیزیں سمیٹ لے جاؤں۔ اہلیا اپنی چیزوں کا لٹنا نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے نند بھاوج میں کبھی کبھی بدمزگی ہوجاتی تھی۔

برتنوں میں کئی بڑے بڑے کنڈال بھی تھے۔ ایک کنڈال اتنا بڑا تھا کہ اس میں ڈھائی سو کلشے پانی آجاتا تھا۔ اہلیاایک دن کسی ضرورت سے اسے تلاش کرنے لگی۔ تو اس کا پتہ نہ تھا۔ ساس سے پوچھا۔ اس نے بے دلی سے جواب دیا میں نہیں جانتی ہوں۔ گھر میں ہے تو کہاں جاسکتا ہے۔

اہلیا۔ جب گھر میں نہ ہو۔

نرملا۔ گھر میں سے کہاں غائب ہوگیا؟

اہلیا۔ گھر کی چیز گھر کے آدمیوں کے سوا کون لے جاسکتا ہے؟

نرملا۔ تو اس گھر میں سب چور ہی بستے ہیں؟

اہلیا۔ یہ تو میں نہیں کہتی۔ لیکن چیز کا پتہ تو لگنا چاہیے۔

نرملا۔ تمھیں چیزوں سے محبت ہے۔ تمھیں ان کا پتہ لگاتی پھرو۔ مجھے تو ان چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں پھوٹتی ہیں۔

جب گھر میں کوئی کسی چیز کی حفاظت کرنے والا نہ رہا تو چاروں طرف لوٹ مچ گئی۔ کچھ پتہ نہ چلتا کہ گھر میں کون لٹیرا آبیٹھا ہے۔ لیکن چیزیں ایک ایک کرکے غائب ہوتی جاتی تھیں۔ اہلیا دیکھ کر ان دیکھی اور سن کر ان سنی کر جاتی تھی۔ پر اپنی چیزوں کو تہس نہس دیکھ کر اُسے صدمہ ہوتا تھا۔ اس کا ترک ہوس پرستی کا دوسرا روپ تھا۔

اس طرح مہینے گذر گئے اور اہلیا کا چراغ دن بدن مدھم ہوتا گیا۔ وہ کتنا ہی چاہتی تھی کہ خواہشوں کی بندش سے اپنے کو چھڑالوں۔ پر دل پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔ کیا بھکارنی بن کر زندگی کے دن کاٹے گی۔ دولت کے ہاتھ سے نکل جانے پر اس کے لیے پھر کون سا ذریعہ باقی رہ جائے گا۔

اہلیا بار بار عہد کرتی کہ اب اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں کروں گی۔ ایک ہی وقت کھانا کھاؤں گی۔ لیکن وہ کسی عہد پر قائم نہ رہ سکتی۔ اس میں اصول پروری کی صلاحیت باقی نہ تھی۔ صاف تجربہ ہوگیا کہ یہاں رہ کر کچھ نہ کرسکیں گی۔

لیکن اب کہاں جائے۔ جب تک خواہشوں سے گلانہ چھوٹے۔ تیر تھ یاترا اسے نمائش سی معلوم ہوتی تھی۔

اب اُسے باگیسری کی یاد آئی۔ سکھ کے دن وہی تھے۔ جو اس کے ساتھ کٹے۔ اصل میکانہ ہونے پر بھی زندگی کا جو کچھ مزا وہاں ملا۔ وہ پھر نہ نصیب ہوا۔ آہ! وہ دن خواب ہوگئے۔ ساس ملی وہ اس طرح کی۔ نند ملی وہ اس قماش کی۔ ماں تھی ہی نہیں۔ صرف ایک باپ ملے، مگر کتنا مہنگا سودا تھا۔ جس دن معلوم ہوا تھا کہ وہ راجہ کی بیٹی ہے۔ وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ پر کیا معلوم تھا کہ اس عارضی مسرت کے بدلے ساری زندگی رو کے کٹے گی۔

اب اہلیا کو شب وروز یہی دُھن رہتی تھی کہ کسی طرح باگیسری کے پاس پہنچوں۔ گویا وہاں جاتے ہی اس کے سارے دُکھ دور ہوجائیں گے۔ ادھر کئی مہینوں سے کوئی خط نہ آیا تھا۔ اہلیا نے کئی بار بلایا بھی تھا۔ مگر باگیسری نے لکھا تھا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ مجھے یہاں پڑی رہنے دو! اہلیا کو باگیسری ہی سے سچی ہمدردی کو توقع تھی۔

آخر ایک دن اہلیا نے نرملا سے یہ چرچا کر ہی دیا۔ نرملا نے کچھ بھی اعتراض نہ کیا۔ شاید وہ خوش ہوگی کہ یہ کسی طرح یہاں سے ٹلے۔

اہلیا جب سفر کی تیاریاں کرنے لگی۔ تو منگلا نے ظاہر داری کی۔ بھابی! تم چلی جاؤگی تو یہاں بالکل اچھا نہ لگے گا۔ وہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟

اہلیا۔ ابھی کیا کہوں بہن! یہ تو وہاں جانے پر ہی معلوم ہوگا۔

منگلا۔ اتنے دنوں کے بعد جارہی ہو۔ تو دو تین ہفتے تو رہنا ہی پڑے گا۔ اب میں بھی چلی جاؤں گی۔ اب تو رانی منورما سے بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ اکیلے کیسے رہا جائے گا؟ تمھیں لوگوں سے تو ملنے آئی تھی۔ رانی صاحب نے تو بھلا ہی دیا۔ تم بھی چھوڑ کر چلی جاتی ہو۔

یہ کہہ کر منگلا رونے لگی۔

دوسرے دن اہلیا یہاں سے چلی۔ اپنے ساتھ کوئی سازو سامان نہ لیا۔ صرف ایک بڈھے کہار کو پہنچانے کے لیے لے لیااور اسے بھی آگرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن رخصت کردیا۔

آج 20 سال کے بعد اس گھر میں پھر قدم رکھے۔ سارا گھر منہدم ہوگیا تھا۔ نہ آنگن کا پتہ تھا نہ دیوان خانے کا۔ چاروں طرف بلوے کا ڈھیر جمع ہورہا تھا۔ اس پر مدار اور دھتورے کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بچی رہی تھی۔ باگیشری اسی میں رہتی تھی۔ اس کی صورت بھی اس گھر کی طرح تبدیل ہوگئی تھی۔ نہ منہ میں دانت نہ آنکھوں میں بصارت۔ کمر جھک کر کمان ہوگئی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں۔ جب آنسو تھمے تو باگیشری نے کہا۔ بیٹی! تم اپنے ساتھ کچھ سامان نہیں لائیں؟ کیا دوسری گاڑی لوٹ جانے کا ارادہ ہے؟ اتنے دنوں کے بعد آئیں بھی تو اس طرح۔ ہاں اس کھنڈر میں تمھارا جی کیوں لگے گا؟۔

اہلیا۔ اماں! محلوں سے بہت بیزار ہوگئی۔ اب کچھ دن اس کھنڈر ہی میں رہوں گی اور تمھاری خدمت کروں گی۔ جب سے یہاں سے گئی ایک دن بھی سکھ نہیں پایا۔

باگیشری۔ لڑکے کا کچھ پتہ چلا؟

اہلیا۔ کسی کا پتہ نہیں چلا اماں! میں راج کے سکھوں پر لٹو ہوگئی تھی۔ اس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ ان تکلفات سے جو کچھ ملتا ہے۔ وہ دیکھ چکی۔ اب انھیں چھوڑ کر دیکھوں گی۔ کیاجاتا ہے۔ مگر تمھیں تو بڑی تکلیف ہورہی ہے اماں!

باگیشری کیسی تکلیف بیٹی! جب تک تمھارے دادا جیتے رہے۔ ان کی خدمت کرنے میں بھی مجھے عیش وراحت تھی۔ تیرتھ، برت، پن، دھرم سب کچھ ان کی خدمت ہی تھا۔ اب وہ نہیں ہیں تو ان کے نام کی خدمت کررہی ہوں۔ آج بھی ان کے کتنے ہی دوست میری مدد کو تیار ہیں۔ میَں کیوں کسی کی مددلوں۔ تمھارے دادا ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ تو پھر میں کس منہ سے مدد کے لیے ہاتھ پھیلاؤں۔

یہ کہتے کہتے اس دیوی کا زرد چہرہ غرور سے چمک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں

ایک رقت آمیز زندہ دلی نمودار ہوگئی۔ اہلیا کا سر شرم سے جھک گیا۔

باگیشری نے پھر کہا۔ خواجہ محمود نے بہت چاہا۔ میں ان سے کوئی رقم ماہوار لے لیا کروں۔ میکے والے بھی کئی بار مجھے بلانے آئے۔ میں نے کسی کا احسان نہیں لیا۔ شوہر کی کمائی کو چھوڑ کر اور کسی کی کمائی پر عورت کا اختیار نہیں ہوتا۔ جب تک آنکھیں تھیں سلائی کرتی رہی۔ جب سے آنکھیں گئیں دلائی کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ان پر جی جھنجھلاتا ہے۔ جو کچھ کمایا اڑادیا۔ لیکن پھر دل کو سمجھاتی ہوں کہ انھوں نے کسی برے کام میں تو نہیں اڑایا۔ جو کچھ کیا اپنے بھائیوں کی بھلائی ہی کے لیے تو کیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان بھی دے دی۔ پھر میں کیوں پچھتاؤں اور کیوں روؤں۔ چلو ہاتھ منہ دھوڈالو۔ کچھ کھالو تو پھر باتیں کریں گے۔

لیکن اہلیا ہاتھ منہ دھونے نہ اٹھی۔ باگیشری کی وہ عصمت پروری دیکھ کر اس کا نفس اس پر ہنس رہا تھا۔ ایک یہ ہیں کہ شوہر کے نام پر اپنے کو مٹائے دیتی ہیں۔ ایک تو ہے کہ ثروت دیکھ کر اندھی ہوگئی۔

باگیشری نے پھر کہا۔ ابھی تک تو بیٹھی ہے۔ ہاں لونڈی پانی نہیں لائی کیسے اُٹھے گی۔ لے میں پانی لائے دیتی ہوں۔ ہاتھ منہ دھوڈال۔ تب تک میں تیرے لیے گرم روٹیاں سینکتی ہوں۔

اہلیا یہ اخلاص میں ڈوبے ہوئے الفاظ سن کر باغ باغ ہوگئی۔ اس "تو" میں جو مزا تھا وہ "آپ" و "سرکار" میں کہاں! بچپن کے دن آنکھوں میں پھر گئے بولی۔ ابھی تو بھوک پیاس نہیں ہے اماں جی بیٹھئے! کچھ باتیں کیجیے۔ میں آپ سے اپنی مصیبت کی داستان کہنے کے لیے بے قرار ہورہی تھی۔ بتائیے! میرا بیڑا پار کیسے لگے گا؟

باگیشری نے بزرگانہ متانت سے کہا۔ "جس کے لیے تو نے شوہر اور بیٹے کو کھویا۔ اسے چھوڑ کر ہی تو اپنے پیاروں کو پاسکے گی۔ تجھے اتنی ہوس کیسے ہوگئی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

اہلیا۔ "اماں! سچ کہتی ہو۔ میں محض شنکھ دھر کا خیال کرکے ان کے ساتھ نہ گئی"۔

اہلیا نے شرمندہ ہوکر کہا۔ ہوسکتا ہے۔ اماں جی۔ ایسا ہی ہو!

باگیشری۔ وہ ہوس یہاں بھی تجھے نہ چھوڑے گی۔

اہلیا۔ اب تو اس سے طبیعت سیر ہوگئی۔

باگیشری۔ جبھی تو وہ پھر تیرا پیچھا کرے گی۔ جو اس سے بھاگتا ہے۔ اسی کے پیچھے وہ دوڑتی ہے۔ ایک بار چوکی تو ۱۴ برس رونا پڑا۔ اب کے چوکی تو باقی عمر روتے ہی گذر جائے گی۔

(47)

شنکھ دھر کو اپنے باپ کے ساتھ رہتے ایک مہینہ ہوگیا۔ نہ وہ جانے کا نام لیتا ہے۔ نہ چکردھر جانے کو کہتے ہیں۔ شنکھ دھر اتنا خوش وخرم رہتا ہے۔ گویا اسے کسی چیز کی آرزو نہیں ہے۔ اتنے میں دونوں میں اس کے مردانہ چہرے پر سرخی نظر آنے لگی ہے اور جسم بھر آیا ہے۔

چکردھر کو اب اپنے ہاتھوں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ جب ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہیں تو ان کا سامان شنکھ دھر اٹھالیتا۔ انھیں اپنا کھانا بھی تیار ملتا ہے۔ برتن منجھے ہوئے صاف ستھرے۔ دونوں آدمیوں کی زندگی کا سب سے مسرت بخش موقعہ وہ ہوتا ہے جب ایک سوال کرتا ہے، دوسرا جواب دیتا ہے۔ شنکھ دھر کو اگر بابا جی کی باتوں سے سیری نہیں ہوتی۔ کم سخن بابا جی کو بھی اس سے باتیں کرنے میں سیری نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات، سائنس، مذہب، تاریخ اور دیگر علوم کی ساری باتیں گھول کر پلادینا چاہتے تھے۔ جڑی بوٹیوں کا جو علم انھوں نے بڑے بڑے باکمال فقیروں سے برسوں میں حاصل کیا تھا۔ وہ سب شنکھ دھر کو سکھادیا۔ وہ اسے کوئی نئی بات سمجھا دینے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک ایک حرکت پر ان کی باریک نگاہیں پڑتی رہتی ہیں۔ دوسروں سے اس کی شرافت اور تحمل کی تعریف سن کر ان میں کتنی مسرت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ شنکھ دھر ان کا لڑکا ہے۔ صورت کی مشابہت اس خیال کی تصدیق کرتی ہے مگر جو بات سب جانتے ہیں اُسے وہ خود نہیں جانتے اور نہ جاننا چاہتے ہیں۔

ایک دن وہ ایک گاؤں میں پہنچے تو وہاں دنگل ہورہا تھا۔ شنکھ دھر بھی اکھاڑے

کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ ایک پٹھے نے شنکھ دھر کو للکارا۔ وہ شنکھ دھر سے ڈیوڑھا تھا مگر شنکھ دھر نے کشتی منظور کرلی۔ چکردھر یہی کہتے رہے۔ یہ لڑکا لڑنا کیا جانے۔ بھلا یہ کیا لڑے گا۔ لیکن شنکھ دھر لنگوٹ کس کراکھاڑے میں اتر ہی تو پڑا۔ اس وقت چکردھر کی صورت دیکھنے ہی کے قابل تھی۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ اپنے اضطراب کو چھپانے کے لیے اکھاڑے سے دور جا بیٹھے تھے۔ گویا انھیں اس بات کی بالکل پرواہ نہیں ہے کہ اکھاڑے میں کیاہورہا ہے۔ بھلا لڑکوں کے کھیل سے سادھو مہاتماؤں کو کیا تعلق؟ لیکن کسی نہ کسی بہانے سے اکھاڑے کی طرف آہی جاتے تھے۔ جب اس پٹھے نے پہلی ہی پکڑ میں شنکھ دھر کو دھر دبایا۔ تو بابا جی ایک بے خودی کے عالم میں خود جھک گئے۔ شنکھ دھر جب زور مار کر نیچے سے نکل آیا تو بابا جی سیدھے ہوگئے۔ اور جب شنکھ دھر نے کشتی مارلی۔ تب تو چکردھر اچھل پڑے اور دوڑ کر شنکھ دھر کو گلے لگالیا۔ مارے غرور کے ان کی آنکھیں متوالی ہوگئیں۔

شنکھ دھر کو کبھی کبھی اگر صبر آزما خواہش ہوتی تو یہ کہ پتا جی کے قدموں پر گر پڑوں اور ساری کیفیت صاف صاف بیان کردوں۔ وہ دل میں قیاس آرائیاں کیا کرتا کہ اگر ایسا کروں تو وہ کیا کہیں گے؟ شاید اسی دن مجھے سوتاچھوڑ کر کسی دوسری طرف کی راہ لیں گے۔ اس خوف سے بات اس کے منہ تک آکے رُک جاتی تھی۔ مگر یہ خواہش اسی تک محدود نہ تھی۔ چکردھر بھی کبھی بیٹے کی محبت سے بے تاب ہو جاتے اور چاہتے کہ اسے گلے لگا کر کہوں کہ بیٹا! تم میری آنکھوں کے تارے ہو! تمھاری یاد دل سے کبھی نہ اُترتی تھی۔ سب کچھ بھول گیا۔ پر تم نہ بھولے۔ وہ شنکھ دھر کے منہ سے اپنے حال کاقصہ۔ غم دادی کی اشک ریزی اور زوجہ کے عیش وغضب کی داستان سننے سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ رانی منورما کو ان کا کتنا خیال تھا۔ یہ چرچا سن کر چکردھر بہت رنجیدہ ہوجاتے تھے۔

اس طرح ایک مہینہ گذر گیا اور شنکھ دھر کو فکر ہوئی کہ انھیں کسی بہانے سے گھر لے چلو۔ لیکن بہت غور کرنے پر بھی اسے کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ تب اس نے فیصلہ کیاکہ ماں کو خط لکھ کر کیوں نہ یہیں بلالوں۔ اور خط پاتے ہی سر کے بل دوڑی آئیں گی اور لوگ بھی آئیں گے۔ تب دیکھوں کہ یہ حضرت کس طرح جان

بچاتے ہیں۔ وہ پچھتاتا کہ میں ناحق اتنے دنوں شش وپنج میں پڑا رہا۔ اسی رات کو اس نے اپنی ماں کے نام خط ڈال دیا۔ خط کے اخیر میں لکھا۔ آپ آنے میں توقف نہ کیجیے گا، ورنہ پچھتائیں گی۔ یہ امید چھوڑ دیجیے کہ میں جگدیش پور راج کا مالک ہوں گا۔ پتا جی کے قدموں کو چھوڑ کر میں ثروت کے مزے نہیں اٹھا سکتا۔ انھیں یہاں سے لے جانا غیر ممکن ہے۔ انھیں اگر معلوم ہوجائے کہ میں انھیں پہچان گیا ہوں تو آج ہی غائب ہوجائیں۔ میں نے ان سے اپنی داستان کہہ دی ہے۔ آپ لوگوں کے حالات بھی سنایا کرتا ہوں۔ پر مجھے ان کے چہرے پر ذرا بھی تسکین نظر نہیں آتا۔ جذبات پر انھوں نے اتنا قابو کرلیا ہے۔ آپ جلد سے جلد آئیں۔

وہ ساری رات اسی تخیل میں مگن رہا کہ اماں آجائیں گی تو دادا کو جھک کر سلام کروں گا۔ اور پوچھوں گا کہ اب بھاگ کر کہاں جائے گا۔

مگر اپنی سوچی ہوئی بات کبھی پوری ہوئی ہے؟

ایک مہینہ گذر گیا اور نہ اہلیا ہی آئی نہ کوئی دوسرا ہی۔ شنکھ دھر دن بھر اس کی راہ دیکھتا رہتا۔ ریل کا اسٹیشن وہاں سے پانچ میل تھا۔ راستہ بھی صاف تھا۔ پھر بھی کوئی نہیں آیا۔ چکردھر جب کہیں چلے جاتے تو وہ چپکے سے اسٹیشن کی راہ لیتا اور گاڑی کے نکل جانے پر مایوس ہوکر لوٹ آتا۔ آخر ۔ سے ایک دن ایک خط ملا۔ جسے پڑھ کر اُسے بے حد افسوس ہوا۔ اہلیا نے لکھا تھا۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔ تم نے اتنی جانکاہی کے بعد جس دیوتا کے درشن پائے۔ اس کے درشن کی بہت خواہش ہونے پر بھی یہاں سے ہل نہیں سکتی۔ ایک مہینہ سے بیمار ہوں۔ جینے کی امید نہیں۔ اگر تم آجاؤ تو تمھیں ایک نگاہ دیکھ لوں۔ ورنہ یہ حسرت بھی رہ جائے گی۔ میں کئی مہینے سے آگرے میں پڑی ہوں۔ اکیلے جی گھبرایا کرتا ہے۔ اگر کسی طرح سوامی جی کو لاسکو۔ تو آخری وقت ان کی زیارت بھی کرلوں۔ میں جانتی ہوں وہ نہ آئیں گے مگر تم آنے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کرنا۔

شنکھ دھر ڈاک خانہ کے سامنے کھڑا دیر تک روتا رہا۔ اماں بیمار ہیں۔ کیا وہ انھیں اس حالت میں چھوڑ کر ایک لمحہ بھی یہاں رک سکتا ہے۔ اس نے پانچ سال تک ماں کو اپنی خیریت کا کوئی حال لکھ کر اس کے ساتھ جو سردمہری ظاہر کی ہے

اُسے یاد کر کے اسے سچی ندامت ہوئی۔

اس کا منہ اُترا ہوا دیکھ کر چکردھر نے پوچھا۔ کیوں بیٹا! آج کچھ اُداس معلوم ہوتے ہو۔

شنکھ دھر نے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا۔ آج ماتا جی کا خط آیا ہے۔ وہ بہت بیمار ہیں۔ میں پتا جی کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ تو نہ ملے۔ اماں جی بھی رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ دادا سے ملاقات ہوجاتی۔ تو میں ان سے ضرور کہتا ....

چکردھر۔ کیا کہتے ؟ کہو نہ!

شنکھ دھر۔ کہہ دیتا کہ آپ ہی ماتا جی کے قاتل ہیں۔ آپ کی عبادت اور خدمت کس کام کی؟ جو اپنے گھر والوں کی جانب سے اتنا تغافل ہے۔ آپ کے پاس بڑی بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ مگر آپ کو بھی ایک بے کس یتیم پر درد نہ آیا۔

چکردھر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا! میں تمہارے باپ کا پتہ لگاچکا ہوں۔ ان سے مل بھی چکا ہوں۔ تمھیں خبر نہیں۔ پر وہ پوشیدہ طور پر تمھیں دیکھ بھی چکے ہیں۔ انھیں جتنی تم سے محبت ہے۔ تم اس کا قیاس بھی نہیں کرسکتے۔ تمھاری ماں کو بھی وہ ہمیشہ یاد کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا جو راستہ طے کرلیا ہے اسے چھوڑ نہیں سکتے۔

شنکھ دھر۔ آج کل تو اماں جی آگرے ہیں۔ باگیسری دیوی سے ملنے گئی تھیں وہیں بیمار پڑ گئیں۔ لیکن آپ کی پتا جی سے ملاقات ہوئی۔ پھر بھی آپ نے اس کا مجھ سے ذکر نہ کیا۔ اسے میں اپنی بد نصیبی کے سوا اور کیا سمجھوں؟

چکردھر نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سخت آزمائش میں پڑے ہوئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد ناگہانی طور پر اپنے بیٹے سے ملنے کا اتفاق ہوگیا تھا۔ وہ ساری آرزوئیں اور خواہشیں جنھیں وہ دل سے نکال چکے تھے۔ بیدار ہوگئی تھیں اور اس وقت صدمہ فراق سے زاروقطار رو رہی تھیں۔ نفس کا وہ پھندہ جسے انھوں نے بڑی مشکلوں سے کر پایا تھا۔ ہر لمحہ سخت ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

یکایک شنکھ دھر نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔ تو میں مایوس ہوجاؤں!

چکردھر نے دل سے نکلنے والی آہ سرد کو دباتے ہوئے کہا۔ نہیں بیٹا! ممکن ہے

کبھی وہ خود تمھاری محبت سے بے قرار ہوکر خود تمھارے پاس دوڑے آئیں۔ اس کا فیصلہ تمھارے اطوار پر مبنی ہے۔

شنکھ دھر۔ آپ کے درشن مجھے پھر کب ہوں گے؟ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کہاں ہیں۔ اگرچہ مجھے والد بزرگوار سے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن شفقت پدری کا جو تخیل میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ آپ کی قدم بوسی نے پورا کردیا۔ میں نے آپ کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے اور ہمیشہ دیکھتا رہوں گا۔ یہ شفقت، یہ دست گیری، یہ نظر کرم مجھے کبھی نہ بھولے گی۔

چکردھر نے رخصت آمیز لہجہ میں کہا۔ نہیں بیٹا! تمھیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کبھی تم سے مل جایا کروں گا۔ میری دعا ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گی۔

شام کے وقت شنکھ دھر اپنے باپ سے رخصت ہوکر چلا۔ انھیں ایسا محسوس ہورہا تھا۔ گویا ان کا دل سینے سے نکل کر شنکھ دھر کے ساتھ چلاجارہا ہے۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایسامعلوم ہوا کہ زندگی تاریک ہوگئی۔

(48)

اہلیا کے آنے کی خبر پاکر محلے کی سینکڑوں عورتیں ٹوٹ پڑیں۔ شہر کے کئی بڑے گھروں کی عورتیں آپہنچیں۔ شام تک تانتا لگا رہا۔ کچھ لوگ وفد بناکر ایواروں کے لیے چندے مانگنے آپہنچے۔ اہلیا کو ان لوگوں سے جان بچانا مشکل ہوگیا۔ کس کس سے اپنی مصیبت کی داستان کہے۔ اپنی غرض کے باولے اپنی کہتے ہیں۔ کسی کی سننے کی انھیں کہاں فرصت۔ اس وقت اہلیاکو بے سروسامانی سے یہاں آنے پر بڑی شرم آئی۔ اگر جانتی کہ یہاں یہ ہنگامہ بپا ہوگا۔ تو وہ اپنے ساتھ دس بیس ہزار کے نوٹ لیتے آتی۔ اُسے اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں ٹھہرتے بھی شرم آتی تھی۔ جب اسے راج کماری کا رتبہ حاصل ہوا۔ وہ شہر سے باہر نہ گئی تھی۔ کبھی کبھی کاشی رہتی، کبھی جگدیش پور۔ اب اسے معلوم ہوا کہ دولت محض تن پروری کی چیز نہیں۔ اس سے

شہرت اور نیک نامی بھی مل سکتی ہے۔ تن پروری سے تو اسے نفرت ہوگئی تھی۔ لیکن نیک نامی کا شہرہ پہلے ہی بار ملا۔ شام تک اس نے پندرہ بیس ہزار کے چندے لکھ دیے اور منشی بجردھر سے روپیہ بھیجنے کی بھی التجا کی۔ خط پہنچنے کی دیر تھی روپیہ فوراً آگئے۔ پھر تو اس کے دروازے پر فقیروں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ لنگڑے اندھوں سے لے کر جوڑی اور موٹر پر بیٹھنے والے گداگر آکر دست سوال پھیلانے لگے۔

خواجہ محمود کو بھی خبر ملی۔ وہ بے چارے آنکھوں سے معذور تھے۔ مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔ انھیں امید تھی کہ رانی صاحب مجھے ضرور سرفراز پائیں گی۔ لیکن جب ایک ہفتہ گذر گیا اور اہلیا نے انھیں سرفراز نہ کیا تو ایک دن لاٹھی ٹیکتے ہوئے اور دروازے پر کھڑے ہوکر بولے۔ خواجہ محمود حضور کو دعا دینے کے لیے حاضر ہوا ہے۔

اہلیا فوراً باہر نکل آئی اور مودبانہ انداز سے بولی۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میں تو خود حاضر ہونے والی تھی۔ مزاج تو اچھے ہیں؟

خواجہ۔ خدا کا شکر ہے۔ زندہ ہوں۔ حضور تو خیریت سے ہیں۔

اہلیا۔ آپ کی دعا ہے۔ مگر آپ تو ت۔ سے یوں باتیں کررہے ہیں۔ گویا میں کچھ اور ہوگئی ہوں۔ میں۔ میں آپ کی گود کی کھلائی ہوئی وہی لڑکی ہوں جو آج سے پندرہ سال پہلے تھی۔ اور آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔

خواجہ صاحب اہلیا کی مجامعت اور انکسار پر مفتون ہوگئے۔ واللہ! کیا شرافت ہے۔ کتنی خاکساری ہے۔ انسان وہی ہے جو اپنے کو بھول نہ جائے۔ بولے۔ تمھیں خدا نے یہ رُتبہ اعلیٰ بخشا ہے۔ مگر تمھارا مزاج وہی ہے۔ ورنہ کسے اپنے دن یاد رہتے ہیں۔ ثروت پاتے ہی لوگوں کی نگاہیں بدل جاتی ہیں۔ قسم خدا کی! میں نے جس وقت تمھیں نالی میں روتے ہوئے پایا۔ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ کسی بڑے گھر کا چراغ ہے۔ اتنی ہمت۔ اتنی دلیری اپنی عصمت کے لیے جان پر کھیل جانے کے لیے یہ جوش شہزادیوں میں ہی ہوسکتاہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ کو دیکھ کر آنکھیں مسرور ہوئیں۔ تمھاری اماں جان تو اچھی طرح ہیں؟ کیا کروں پڑوس میں رہتا ہوں اور برسوں آنے کی نوبت نہیں آتی۔

اہلیا۔ آپ انھیں سمجھاتے نہیں۔ کیوں اتنی تکلیفیں جھیلتی ہیں؟

خواجہ۔ بیٹا! ایک بار نہیں، ہزار بار سمجھا چکا۔ مگر جب وہ خدا کی بندی مانے بھی۔ کتنا کہا کہ میرے پاس جو کچھ ہے۔ وہ تمھارا ہے۔ جسوداانندن مرحوم سے میرا برادرانہ رشتہ تھا۔ میری جائداد میں تمھارا بھی حصہ ہے۔ مگر میری گذارش کا مطلق لحاظ نہ کیا۔ تمھیں تو اس مکان میں بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ میرا بنگلہ خالی ہے۔ کوئی ہرج نہ سمجھو تو اس میں قیام کرو!

فی الواقع اہلیا کو اس گھر میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ راتوں کو نیند ہی نہ آتی۔ انسان اپنی عادتوں کو یکایک نہیں تبدیل کرسکتا۔ پندرہ سال سے وہ ایک شاندار محل میں رہنے کی عادی ہورہی تھی۔ اس تنگ گندے ٹوٹے پھوٹے مکان میں یہاں رات بھر مچھروں کی بھنبھنائی بجتی رہتی تھی۔ اسے کب آرام مل سکتا تھا۔ مگر خواجہ صاحب کی دعوت کو وہ قبول نہ کرسکی۔ بولی۔ نہیں خواجہ صاحب! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آدمی کو اپنے دن نہ بھولنے چاہئیں۔ اسی گھر میں سولہ سال رہی ہوں۔ زندگی میں جو کچھ سکھ دیکھا۔ اسی گھر میں دیکھا۔ اپنے پرانے رفیق کو کیسے چھوڑدوں؟

خواجہ۔ بابو چکردھر کا اب تک کچھ پتہ نہ چلا؟

اہلیا۔ اس لحاظ سے میں بڑی بدنصیب ہوں خواجہ صاحب! پندرہ سال سے ان کا کوئی پتہ نہیں۔ پانچ سال سے لڑکا بھی غائب ہے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ اس کی سی خوش نصیب عورت دنیا میں نہ ہوگی۔ اور میں اپنی قسمت کو روتی ہوں۔ ارادہ تھا کہ کچھ دنوں اماں کے ساتھ اکیلی پڑی رہوں گی۔ مگر ثروت کی بلا یہاں بھی سر سے نہ ٹلی۔ کہئے اب یہاں تو آپس میں فتنہ فساد نہیں ہوگا۔

خواجہ۔ جی نہیں! ابھی تک تو خدا کا فضل ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ آپس میں وہ پہلے کا سا ارتباط نہیں رہا۔ دونوں قوموں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی عزت اور وقار دونوں کے عناد پر قائم ہے۔ بس یہ لوگ ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑا کرتے ہیں۔ میرا تو قول ہے کہ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ خدا کے سچے بندے رہو۔ ساری خوبیاں کسی ایک ہی قوم کے حصہ میں نہیں آئی ہیں۔ نہ سبھی ہندو کافر ہیں اور نہ سبھی مسلمان مومن۔ اپنے اہل وطن سے جو شخص جتنی بھی نفرت کرتا ہے۔ سمجھ لیجیے کہ وہ خدا سے اتنی

ہی دور ہے۔ مجھے آپ سے کمال ہمدردی ہے۔ مگر چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ ورنہ بابو چکردھر جہاں ہوتے وہاں سے کھینچ لایا۔

خواجہ صاحب جانے لگے تو اہلیا نے اسلامی یتیم خانہ کے لیے پانچ ہزار کا عطیہ پیش کیا۔ اس سے مسلمانوں کے دلوں پر بھی اس کا سکہ بیٹھ گیا۔ چکردھر کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔

اہلیہ کو اب روز ہی کسی نہ کسی جلسہ پر جانا پڑتا ہے اور وہ بڑے شوق سے جاتی ہے۔ دو ہی ہفتوں میں اس کی کایا پلٹ کی سی ہوگئی۔ حرص شہرت کا جادو سر پر چڑھنے لگا۔ فی الواقع ان مصروفیات میں وہ اپنی مصیبتیں بھول گئی۔ اچھی تقریریں تیار کرنے میں اسے اتنا انہماک رہنے لگا۔ گویا نشہ ہوگیا ہے۔ اور یہ تھا بھی نشہ ہی۔ حرص شہرت سے بڑھ کر دوسرا نشہ نہیں۔

باگیشوری پرانے خیالات کی عورت تھی۔ اُسے اہلیا کا یوں گھوم گھوم کر تقریریں کرنا اور روپے لٹانا اچھا نہ لگتا تھا۔ ایک دن اس نے کہہ ہی ڈالا۔ کیوں ری اہلیا! کیا تو اپنی ساری دولت لٹا کر رہے گی؟

اہلیا نے پُر غرور انداز سے کہا۔ اور دولت ہے ہی کس لیے اماں جی! دولت میں اتنی ہی برائی ہے کہ اس سے تکلیف کا شوق بڑھتا ہے۔ لیکن اس سے ثواب بھی تو ہوسکتا ہے۔

باگیشوری نے ثواب کے نام سے چڑ کر کہا۔ تو جو کررہی ہے! ثواب نہیں ہے۔ ناموری کی ہوس ہے۔

اہلیا۔ تم تو اماں جی آپے سے باہر ہوجاتی ہو۔

باگیشور۔ اگر تم دولت کے پیچھے اندھی نہ ہوجاتی تو تجھے یہ خمیازہ نہ اٹھانا پڑتا۔ تیری طبیعت کچھ کچھ ٹھکانے پر آرہی تھی۔ تب تک تجھے یہ نئی سنک سوار ہوگئی۔ ثواب تو میں جب سمجھتی۔ جب تم وہیں بیٹھے بیٹھے گمنام طریقہ سے چندہ بھیج دیتی۔ مجھے خوف ہورہا ہے کہ اس واہ واہ سے تیرا سر نہ پھر جائے۔ ثروت کا بھوت تیرے پیچھے بُری طرح پڑا ہوا ہے اور تجھے ابھی اور کنوئیں جھنکوائے گا۔

اہلیا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ اب کیا ہوگا۔ زندگی ہی کتنی رہ

گئی ہے جس کے لیے رووں۔

دوسرے دن ڈاکیہ شنکھ دھر کا خط لے کر پہنچا۔ جو جگدیش پور ہوتا ہوا آیا تھا۔ اہلیا خط پڑھتے ہی اچھل پڑی اور دوڑی ہوئی باگیشوری کے پاس جاکر بولی۔ اماں! دیکھو۔ للو کا خط آگیا۔ دونوں آدمی ایک ہی جگہ ہیں۔ للو نے اس کا پتہ لگا ہی لیا۔ مجھے بلارہا ہے۔

باگیشوری۔ ایشور کا شکر کرو بٹی! کہاں ہے؟

اہلیا۔ دکھن کی طرف ہیں۔ پورا پتہ لکھا ہوا ہے۔

باگیشوری۔ تو بس! اب تو چلی ہی جا۔ چل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔

اہلیا۔ آج پورے پانچ سال کے بعد للو کا خط آیا ہے۔ مجھے آگرہ آنا پھل گیا۔ یہ تمھاری دعا کا اثر ہے۔

باگیشوری۔ میں تو اس لڑکے کی جیوٹ کو سراہتی ہوں کہ باپ کا پتہ لگا کر ہی دم لیا۔

اہلیا۔ اس خوشی میں آج جشن منانا چاہیے اماں!

باگیشوری۔ جشن پیچھے منانا۔ پہلے وہاں چلنے کی تیاری کرو!

لیکن سارا دن گذر گیا۔ اہلیا نے سفر کی کوئی تیاری نہ کی۔ وہ سفر کے لیے اب کچھ آمادہ نظر نہ آتی تھی۔ مسرت کا پہلا جوش ختم ہوتے ہی وہ اب اس دُبدے میں پڑ گئی تھی کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ وہاں جانا محض دس پانچ دن یا مہینہ دو مہینہ کے لیے جانا نہ تھا۔ بلکہ راج پاٹ سے ہاتھ دھو لینا اور شنکھ دھر کی تقدیر کو پلٹنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ باپ کا پجاری شنکھ دھر انھیں چھوڑ کر کسی طرح نہ آئے گا۔ اور میں بھی مامتا کے بُول میں پھنس جاؤں گی۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ شنکھ دھر کو کسی حیلہ سے بلالینا چاہیے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ شنکھ دھر آگیا تو اس کا باپ بھی ضرور آئے گا۔ شنکھ دھر نے خط میں لکھا تھا کہ پتا جی کو مجھ سے بے انتہا محبت ہے۔ کیا یہ محبت انھیں کھینچ لائے گی؟ وہ چاہے سنیاسی ہی کے بھس میں آئیں پر آئیں گے ضرور۔ اور جب اب کی وہ آئیں گے۔ وہ ان کے پیروں کو پکڑے گی۔ تو وہ نہ چھڑا سکیں گے۔ شنکھ دھر کی گدی نشینی کے بعد اگر ان کی مرضی ہوگی۔ تو وہ ان کے ساتھ چلی

جائے گی، اور زندگی کے باقی دن ان کی خدمت میں صرف کرے گی۔ اس وقت وہاں جاکر وہ اپنے بیٹے کی آرزوؤں کا خون نہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے اتنے دنوں ان کے فرق میں جلی ہے۔ اسی طرح کچھ دن اور جلے گی۔ یہ فیصلہ کرکے اس نے شنکھ دھر کو خط لکھا۔ میں بہت بیمار ہوں۔ بچنے کی کوئی امید نہیں۔ بس ایک بار تمھیں دیکھنے کی آرزو ہے۔ تم آجاؤ تو شاید جی اٹھوں۔ لیکن نہ آئے تو سمجھ لینا اماں مر گئی۔ اہلیا کو یقین تھا کہ یہ خط پڑھ کر شنکھ دھر دوڑا چلا آئے گا۔

بدنصیب اہلیا تو پھر تن پروری کے جعل میں پھنس گئی۔ کیا خواہشیں بھی راکششوں کی طرح اپنے ہی خون سے پیدا ہوتی ہیں۔

شام کے وقت باگیشوری نے پوچھا۔ کیا جانے کا ارادہ نہیں ہے؟

اہلیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ابھی تو اماں میں نے للو کو بلایا ہے۔ اگر وہ نہ آئے گا تو چلی جاؤں گی۔

باگیشوری۔ للو کے ساتھ کیا چکردھر بھی آجائیں گے؟ تو ایسا موقعہ پاکر چھوڑ دیتی ہے۔ نہ جانے ابھی تیری گردش کے کتنے دن باقی ہیں۔

اہلیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے سارے غم بھول کر شنکھ دھر کی گدی نشینی کے منصوبے باندھ رہی تھی۔

(49)

گاڑی سکون کو چیرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ دفعتاً شنکھ دھر ہرش پور کا نام سن کر چونک پڑا۔ وہ بھول گیا۔ میں کہاں جارہا ہوں۔ کسی کام سے جارہا ہوں اور میرے رک جانے سے کتنا کہرام مچ جائے گا۔ کسی غیبی طاقت نے اسے گاڑی کھول کر اُتر آنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اسٹیشن کو غور سے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسے پہلے بھی دیکھا ہے وہ ایک لمحہ تک خود فراموشی کی حالت میں دم بخود کھڑا رہا۔ پھر ٹہلتا ہوا اسٹیشن کے باہر چلا گیا۔

ٹکٹ بابو نے پوچھا۔ آپ کا ٹکٹ تو آگرہ کا ہے! شنکھ دھر نے لاپرواہی سے کہا۔ کوئی ہرج نہیں۔

وہ اسٹیشن کے باہر نکلا، تو اس وقت گھنی تاریکی میں بھی وہ مقام مانوس سا معلوم ہوا۔ کچھ ایسا گمان ہوا کہ وہ بہت دنوں یہاں رہ چکا ہے۔ وہ سڑک پر ہولیا۔ اور آبادی کی طرف چلا۔ جوں جوں بستی قریب آتی تھی۔ اس کے پاؤں تیز ہوتے جاتے تھے۔ اسے ایک عجیب بے چینی سی ہورہی تھی۔ جس کو وہ خود نہ سمجھ سکتا تھا۔ یکایک اُسے سامنے ایک سر بفلک عمارت نظر آئی۔ محل کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ وہ برقی روشنی سے جگمگارہا تھا۔ شنکھ دھر کو کچھ ایسا خیال ہوا کہ وہیں اس کا بچپن بیتاہے۔ اس محل کاایک ایک کمرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وفور شوق نے ایسا بے تاب کردیا کہ وہ اڑ کر اندر چلاجائے۔ باغ کے دروازہ پر ایک چوکیدار سنگین چڑھائے کھڑا تھا۔ شنکھ دھر کو اندر قدم رکھتے دیکھ کر بولا۔ تم کون ہو؟

شنکھ دھر نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ چپ رہو! ہم رانی کے پاس جارہے ہیں۔

یہ رانی کون تھی؟ وہ کیوں اس کے پاس جارہا تھا؟ رانی کے اس سے کیا مراسم تھے؟ یہ سب شنکھ دھر کو کچھ نہ یاد آتا تھا۔ دربان کو اس نے جو جواب دیا۔ وہ بھی استراری طور پر اس کی زبان سے نکل گیا تھا۔ جس نشہ میں انسان کا اپنے حواس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی زبان اس کے جسم، اس کے اعضائے اس کے قابو سے باہر ہوجاتے ہیں۔ وہیں حالت شنکھ دھر کی ہورہی تھی۔ چوکیدار اس کے جواب سے کچھ مرعوب ہوگیا اور راستہ سے ہٹ گیا۔ شنکھ دھر نے باغ میں قدم رکھا۔ باغ کا ایک ایک پودا۔ ایک ایک کیاری۔ ایک ایک روش، ایک ایک مورت حوض، سنگ مرمر کا چبوترہ جانا پہچانا سامعلوم ہورہاتھا۔ وہ بے محابہ محل میں جا پہنچا۔

ایک خادمہ نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ شنکھ دھر نے جواب دیا۔ سادھو ہوں۔ جاکر مہارانی کو اطلاع دے دو!

خادمہ۔ مہارانی تو اس وقت پوجا پر ہیں۔ ان کے پاس جانے کا حکم نہیں ہے۔

شنکھ دھر۔ کیا بہت دیر تک پوجاکرتی ہیں؟

خادمہ۔ ہاں۔ کوئی تین بجے رات پوجا پر سے اُٹھیں گی۔ اسی وقت نام کے لیے کچھ کھاکر گھنٹہ بھر آرام کریں گی۔ پھر اشنان کرنے چلی جائیں گی۔

شنکھ دھر۔ بڑی تپسیا کررہی ہیں۔

خادمہ۔ اب اور کیسی تپسیا ہوگی۔ مہاراج ! نہ کوئی شوق ہے نہ سنگار، نہ کسی سے ہنسنا نہ بولنا۔ آدمیوں کی صورت سے کوسوں بھاگتی ہیں۔ رات دن جپ، تپ کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ جب سے مہاراج کا بیکنٹھ باس ہوا۔ تبھی سے یہ حال ہے۔ آپ کہاں سے آتے ہیں۔ ان سے کچھ کام ہے؟

شنکھ دھر۔ سادھو سنتوں سے کسی کا کیا کام ہے۔ مہارانی کے حسن اعتقاد کا شہرہ سن کر چلا آیا۔

خادمہ۔ آپ کی آواز سے تو معلوم ہوتا ہے کہیں سنی ہے لیکن آپ کو دیکھا نہیں۔

یہ کہتے کہتے وہ یکایک کانپ اُٹھی۔ شنکھ دھر کی پُرجلال شبیہ میں اُسے اس صورت کا عکس نظر آیا۔ جسے اس نے ۲۰ سال پہلے دیکھا تھا۔ وہ مشابہت ہر لمحہ واضح تر ہوجاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگی اور رانی کملا کے کمرے میں جاکر ہیبت زدہ کھڑی ہوگئی۔

رانی کملا نے خشمگیں آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا۔ تو یہاں کیا کرنے آئی؟ اس وقت یہاں تیرا کیا کام ہے؟

خادمہ بولی۔ مہارانی جی! معاف کیجیے۔ جان بخشی ہو تو کہوں۔ آنگن میں ایک مہاتما کھڑے آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں سرکار! اُن کی آواز وصورت ہمارے مہاراج سے اتنی ملتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہی کھڑے ہیں۔ نہ جانے کیسی لیلا ہے۔ اگر میں نے کبھی کسی کا برا چیتا ہو۔ تو میں سو جنم نرک بھوگوں۔

رانی کملا پوجا پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُسے تسکین دیتی ہوئی بولی۔ ڈر مت! ڈر مت!! انھوں نے تجھ سے کیا کہا؟

خادمہ۔ میرا تو کلیجہ کانپ رہا ہے۔ انھوں نے آپ کا نام لے کر کہا کہ انھیں میرے آنے کی اطلاع دے دے!

رانی۔ ان کی کیا عمر ہوگی؟

خادمہ سرکار! ابھی تو مسیں بھیگ رہی ہیں۔

رانی۔ چل دیکھوں تو کون ہے؟

رانی نے آنگن میں آکر دیکھا تو شنکھ دھر کی نورانی صورت بجلی کی روشنی میں صاف نظر آئی۔ رانی کو سکتہ سا ہوگیا۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ایک پہاڑ کے غار میں مہندر کا رہنا یاد آگیا۔ اس وقت۔بھی وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی کتنی ہی مافوق العادت باتیں یاد آئیں۔ جن کا راز اب تک نہ سمجھ سکی تھی۔ پھر ہوائی جہاز پر ان کے ساتھ بیٹھ کر اڑنے کی یاد آئی۔ وہ گیت بھی یاد آیا جو اس وقت اس نے گایا تھا۔ پھر وہ خوفناک انجام نظروں میں پھر گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ میں کھڑی نہ رہ سکوں گی۔ کیا اب بھی شبہ کی کوئی گنجائش تھی؟ اگرچہ اس کا دل ان قدموں میں لپٹ جانے کے لیے بے قرار ہورہا تھا۔ مگر اس نے ضبط کیا اور بولی۔ مہاراج! آپ کون ہیں؟ اور مجھے کیوں یاد کیا ہے؟

شنکھ دھر نے رانی کے قریب جاکر کہا۔ کیا تم مجھے اتنی جلدی بھول گئیں؟ کملا! میں وہی ہوں جس نے نہ جانے کتنے دن ہوئے تمھارے دل میں پریم کے روپ میں جنم لیا تھا۔ اور آج تک اسی مسرت کی تلاش میں وہ پہاڑ کا غار تمھیں یاد ہے۔ وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑنا یاد ہے؟ تمھارے اس روحانی نغمہ کی آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

رانی کملا نے انھیں اور کچھ کہنے کا موقعہ نہ دیا۔ وہ دوڑ کر ان کے قدموں پر گر پڑی اور انھیں اپنے آنسوؤں سے دھونے لگی۔ جس نورانی مورت کی وہ ۲۰ برسوں سے پوجا کررہی تھی۔ وہی اس کے روبرو کسی دیوتا کی طرح کھڑی تھی۔

دفعتاً شنکھ دھر بولے۔ کملا! کبھی تمھیں میری یاد آئی تھی؟

رانی نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ سوامی! آج 30 برس سے تمھاری اُپاسنا کررہی ہوں۔ مگر آپ اس وقت آئے۔ جب میرے دل میں محبت نہیں۔ صرف عقیدت اور ارادت ہے۔

رانی کو اپنے ڈھلتے ہوئے شباب کی حسرت نے خاموش کردیا۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ اس حسن وجمال کے پتلے کی محبوبہ بن سکے۔ وہ کالی کالی لمبی زلفیں۔ وہ گل نورس۔ شگفتہ رخسار۔ وہ مخمور متوالی آنکھیں، وہ نزاکت، وہ شیرینی، وہ مستی اب کہاں!

شنکھ دھر نے پوچھا۔ یہ کیوں کہتی ہو کملا!

کملا نے آبگوں آنکھوں سے شنکھ دھر کی طرف دیکھا۔ ان حسرت ناک خیالات

کو زبان پر نہ لا سکی۔ شنکھ دھر نے اس کے اضطراب باطن کو تاڑ کر کہا۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی وہی ہو۔ جو آج سے ۲۰ سال پہلے تھی۔ نہیں تمھاری حقیقی صورت اس سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔ لیکن تمھیں یاد ہے۔ مجھے رشیوں کا بردان ہے۔ جس سے میں ایام کی بدعتوں کو مٹا سکتا ہوں۔

کملا کو اپنے قلب ماہیت کی یاد آئی۔ اور ایک بار پھر شباب کی گود میں کھیلے گی۔ اس خیال سے اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ذرہ ترنم پذیر ہوگیا۔ اُسے معاً خیال آیا کہ یہ میری تپسیا کا پھل ہے۔ آنے والی مسرتوں کے خیال نے دِل میں ایسی ایسی آرزوئیں پیدا کردیں۔ جنھیں وہ بہت عرصہ سے دفن کرچکی تھی۔ اس کی وہ ساری تپسیا اور وہ برت دل کو خواہشات کے ہجوم سے پاک نہ رکھ سکی۔ نفس مرا نہیں محض سوگیا تھا۔

یکایک کملا چونک پڑی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ شنکھ دھر اس کے سامنے چلا جارہا ہے۔ اس کی وہ نورانی صورت میٹھی میٹھی سی معلوم ہونے لگی۔ کملا نے گھبرا کر کہا کہ آپ مجھے چھوڑ کر چلے جارہے ہیں۔ اتنی جلد!

شنکھ دھر نے متفکر ہوکر کہا۔ میں تو جانے کے لیے نہیں آیا۔

کملا۔ تو آپ مجھے جاتے ہوئے کیوں نظر آرہے ہیں؟

شنکھ دھر۔ یہ سن کر مجھے وحشت ہوتی ہے۔ مگر اس کا علاج میرے پاس ہے۔ میرے تجربہ گاہ کی کیا حالت ہے؟

کملا۔ چلیے۔ آپ کو دکھلاؤں۔

شنکھ دھر۔ اس آزمائش کے لیے تیار ہو؟

کملا۔ آپ کے رہتے مجھے کیا خوف ہے؟

لیکن تجربہ گاہ میں پہنچ کر کملا کا دل بیٹھ گیا۔ جس سکھ کی آرزو اُسے مایا کی تاریکی میں لیے جاتی ہے۔ کیا اس سے بقا ہوگی؟ پہلے کی طرح کیا کوئی غیبی کرشمہ اس کے عیش میں ہارج نہ ہوگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ نہ جانے کتنے دنوں سے خواہشوں کی اس گردش میں مٹی جارہی ہے۔

شنکھ دھر نے ایک سنگ مرمر کی چوکی کو صاف کرکے کہا۔ تم اس پر لیٹ جاؤ۔ اور آنکھیں بند کرلو۔

(50)

راجہ بشال سنگھ کا ذوق مردم آزاری روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ جیوں جیوں انھیں اپنی حالت زار پر رنج ہوتا۔ ان کے ظلم وستم بھی بڑھتے تھے۔ ان کے دل میں اب ہمدردی، رحم یا صبر کے لیے ذرابھر بھی جگہ نہ تھی۔ جب ان پر چاروں طرف سے چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ ان کی حالت پر پرماتما کو بھی رحم نہیں آتا۔ تو وہ کسی پر کیوں رحم کریں۔ اگر ان کا بس ہوتا تو اندر لوک کو ویران کردیتے۔ دیوتاؤں پر ایسے حملے کرتے کہ برتاسر کی یاد بھول جاتی۔ مگر اندرلوک کا راستہ بند تھا اور ان کا سارا غصہ اپنی ریاست پر اُترتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے انھوں نے غیبی حملوں کا جواب دینے کے لیے ایک نیا اسلحہ تیار کیا تھا۔ انھیں اولاد سے محروم رکھ کر ان کی اولاد کو گود سے چھین کر مشیت نے ان کے اوپر سب سے بڑا ظلم کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انھیں پامال کرنے کے لیے سب سے بڑی یہی چوٹ تھی۔ اسے راجہ صاحب اس کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے پانچویں شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ راجاؤں کے لیے کنیاؤں کی کیا کمی۔ کئی مہینوں سے اس شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ کئی راج وید رات دن بیٹھے قسم قسم کے کشتہ اور مقوی ادویات تیار کرتے رہتے تھے۔ راجہ صاحب یہ شادی اتنی دھوم دھام سے کرناچاہتے تھے کہ دیوتاؤں کے کلیجہ پر بھی سانپ لوٹنے لگے۔

رانی منورما نے ادھر کئی مہینوں سے ریاست کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بولتی بھی تو سنتا کون؟ کہاں تو یہ حال تھا کہ راجہ صاحب کو اس کے بغیر کوئی لمحہ بھی چین نہ آتا تھا۔ وہی منورما اب دودھ کی مکھی بنی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ ایک بار راجہ صاحب کے پاس جاکر پوچھے کہ مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے۔ مگر راجہ صاحب اسے اس کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ ان کے دل میں ایک خیال جم گیا تھا۔ اور وہ کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ منورما ہی نے روہنی کو زہر دے کر مارڈالا۔ اس کا کوئی ثبوت ہو یا نہ ہو۔ پر یہ بات ان کے دل میں پتھر کی لکیر ہوگئی تھی۔ منورما کو آئے دن کوئی نہ کوئی ذلت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن وہ ذکی

الحسن منورما اب صبر وتوکل کا اتھاہ ساگر ہے جس میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے کوئی تلاطم نہیں ہوتا۔ وہ مسکرا کر ہر ایک وار کے آگے سر جھکادیتی ہے۔ اسی تبسم میں کتنا درد، آفات کو حقیر سمجھنے کی طاقت بھری ہوئی ہے۔ اسے کون جانتا ہے۔ نئی رانی صاحبہ کے لیے نیا محل بنوایا جارہا تھا۔ اس کی سجاوٹ کے لیے ایک بڑے آئینہ کی ضرورت تھی۔ شاید زار میں اتنا بڑا آئینہ نہ مل سکا۔ حکم ہوا کہ چھوٹی رانی کے دیوان خانہ کا بڑا آئینہ اتار لاؤ۔ منورما نے یہ حکم سنا اور مسکرادی۔ پھر قالین کی ضرورت پڑی۔ پھر وہی حکم ہوا۔ منورما نے مسکرا کر ساری قالینیں دے دیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد حکم ہوا۔ چھوٹی رانی کی موٹر نئے محل میں لائی جائے۔ منورما اس موٹر کو بہت پسند کرتی تھی اور اُسے خود چلاتی تھی۔ یہ حکم سن کر مسکرادی۔

منورما کے پاس بہت سی لونڈیاں تھیں۔ ادھر گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد تین تک پہنچ گئی تھی۔ ایک دن حکم ہوا۔ ان میں سے دو لونڈیاں نئے محل میں تعینات کی جائیں۔ اس کے ایک ہفتہ بعد وہ ایک بھی بلائی گئی۔ منورما کے یہاں کوئی لونڈی نہ تھی۔ اس حکم کا بھی مسکرا کر اس نے خیر مقدم کیا۔

مگر ابھی سب سے کاری چوٹ باقی تھی۔ نئی رانی کے لیے نیا محل تو بن ہی رہا تھا۔ ان کی والدہ کے لیے ایک دوسرے مکان کی ضرورت پڑی۔ راجہ صاحب نے نئے محل میں ان کا قیام مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے حکم ہوا کہ چھوٹی رانی کا محل خالی کرالیا جائے۔ رانی نے یہ حکم سنا اور مسکرادی۔ جس حصے میں پہلے مہریان رہتی تھیں اسی کو اس نے اپنا مسکن بنالیا۔ وہاں بھی وہ اتنی ہی خوش تھی۔

ایک دن گروسیوک منورما سے ملنے آئے۔ راجہ صاحب کی خفگی کا پہلا وار انھیں پر ہوا تھا۔ وہ دربار سے الگ کردیے گئے تھے۔ وہ اب اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اختیار چھن جانے پر اختیار کے دشمن ہوگئے تھے۔ اب وہ پھر کسانوں کی تنظیم کرنے لگے تھے۔ بیگار کے خلاف ان کی آواز پھر بلند ہونے لگی تھی۔ منورما پر یہ ساری بدعتیں دیکھ دیکھ کر ان کا غصہ مشتعل ہوتا رہتا تھا۔ جس دن اس نے سنا کہ منورما اپنے محل سے نکال دی گئی۔ ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔

منورما نے ان کا تمتما ہوا چہرہ دیکھا تو کانپ اٹھی۔

گروسیوک نے آتے ہی پوچھا۔ تم نے اپنا محل کیوں چھوڑدیا؟

منورما۔ کیا کرتی؟

گروسیوک۔ کیوں نہیں کہہ دیا نہ خالی کروں گی۔

منورما۔ میں نے کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ مجھے یوں ہی کون سا ایسا بڑا سکھ تھا۔ جو اس محل کے چھوڑنے کا دکھ ہوتا۔ میں یہاں بھی خوش ہوں۔

گروسیوک۔ میں دیکھتا ہوں کہ بڈھا دن بدن سٹھیاتا جاتا ہے۔ شادی کے پیچھے اندھا ہوگیا ہے۔

منورما۔ بھیا! آپ میرے سامنے ایسے کلمے منہ سے نہ نکالیں۔ آپ کے پیروں پڑتی ہوں۔

گروسیوک۔ تم باتوں کی کہتی ہو۔ میں اس کی مرمت کرنے کی فکر میں ہو۔ شادی کا مزا چکھاؤں گا۔

منورما کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔ بولی۔ بھیا! میں پھر کہتی ہوں آپ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ اس وقت اپنی ہوش میں نہیں ہیں۔ وہی کیا۔ کوئی آدمی ایسی چوٹیں کھا کر اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔ میں یا آپ ان کے دلی جذبات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ جس شخص نے ایک آرزو کو چالیس سال تک دل میں پالا ہو اسی ایک آرزو کے جائز اور ناجائز سب کچھ کیا ہو اور چالیس سال کے بعد جب اس کے آرزو کے پورے ہونے کے سامان ہوگئے ہوں۔ یکایک اس کے چہرے پر چھری چل جائے۔ تو سوچئے اس شخص کی کیا حالت ہوگی؟ راجہ صاحب نے سر پٹک کر جان نہیں دے دی۔ یہی کیا کم ہے؟ کم سے کم میں تو اتنا صبر نہ کرسکتی۔

گروسیوک۔ اچھا رعایا پر اتنا ظلم کیوں ہورہاہے؟ یہ بھی بے ہوشی ہے؟

منورما۔ بے ہوشی نہیں تو اور کیا ہے؟ جو آدمی ۶۵ سال کی عمر میں اولاد کے لیے شادی کرے۔ وہ بے ہوش ہی ہے۔ چاہے اس میں بے ہوشی کی کوئی علامت ہو یا نہ ہو۔

گروسیوک شرمندہ ہوکر اور مایوس ہوکر جب یہاں سے چلنے لگے تو منورما کھڑی

ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ بھیا! اگر کوئی خدشہ کی بات ہے تو مجھے بتادو۔ گروسیوک نے آنکھیں نیچے کر کے کہا۔ خدشہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ خدشہ کی کون بات ہو سکتی ہے بھلا؟

منورما۔ تم میری طرف تاک نہیں رہے ہو۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے۔ اگر راجہ صاحب پر ذرا بھی آنچ آئی تو برا ہوگا۔ جو بات ہو صاف صاف کہہ دو!

گروسیوک۔ مجھ سے اور راجہ صاحب سے مطلب ہی کیا ہے۔ اگر تم خوش ہو تو مجھے ان سے کون سی دشمنی ہے۔ رہی رعیت۔ وہ جانے اور راجہ صاحب جانیں! مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ مگر برا نہ مانو۔ تو ایک بات پوچھوں؟ وہ ٹھوکریں مارتے ہیں اور تم ان کے پاؤں سہلاتی ہو۔ کیا سمجھتی ہو۔ تمھاری اس خوشامد سے راجہ صاحب پھر تم سے خوش ہو جائیں گے؟

منورما نے بھائی کی طرف مجبور نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اگر ایسا سمجھتی ہوں تو کیا کوئی برائی کرتی ہوں؟ ان کی خوشی کی پرواہ نہیں تو پھر کس کی خوشی کی پرواہ کروں گی۔ ہمارا دھرم کینہ رکھنا نہیں۔ چھما کرنا ہے۔ میری شادی ہوئے بیس سال سے زیادہ ہوئے ہیں۔ بہت دنوں تک مجھ پر ان کی عنایت کی نظر رہی ہے۔ اب وہ مجھ سے تنے ہوئے ہیں۔ شاید میری صورت سے بھی انھیں نفرت ہو۔ لیکن آج تک انھوں نے ایک بھی کڑی بات نہیں کہی ہے۔ سنسار میں ایسے کتنے مرد ہیں۔ جنھیں اپنی زبان پر اتنا قابو ہو۔ کیا ان باتوں کو میں کبھی بھول سکتی ہوں؟ میں تمھارے پیروں پڑتی ہوں اگر کوئی خوف کی بات ہو تو تم مجھے بتلادو۔ گروسیوک نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔ میں تو کہہ چکا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔

گروسیوک نے آگے قدم بڑھایا۔ لیکن منورما نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ تمھارا بشرہ کہے دیتا ہے کہ تمھارے دل میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ جب تک مجھے نہ بتاؤ گے۔ میں جانے نہ دوں گی۔

گروسیوک۔ نورا! تم ناحق ضد کرتی ہو۔ اگر میں قیاس سے کوئی بات کہہ دوں تو تم کیا کرلو گی؟

منورما۔ اگر روک سکوں گی۔ تو روکوں گی۔

گروسیوک۔ اُسے تم نہیں روک سکتی اور نہ میں روک سکتا ہوں۔ منورما نے گھبرا کر کہا۔ کچھ منہ سے کہو گے بھی؟

گروسیوک۔ رعایا راجہ صاحب کے ظلم سے تنگ آگئی ہے۔

منورما۔ یہ تو میں پہلے سے جانتی ہوں۔ ہندوستان بھی تو انگریزوں سے تنگ آگیا ہے۔ مگر اس سے کیا؟

گروسیوک۔ بس اتنا ہی بتائے دیتا ہوں کہ راجہ صاحب سے کہہ دو شادی کے دن ہوشیار رہیں!

گروسیوک لپک کر باہر چلے گئے۔ اور منورما کے ایک سکتہ کے عالم میں کھڑی ہوئی سوچنے لگی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

کل ہی شادی کا دن تھا۔ شام ہوگئی تھی۔ علی الصبح برات یہاں سے جانے والی تھی۔ سوچنے بچارنے کا موقعہ نہ تھا۔ اسی وقت راجہ صاحب کو ہوشیار کردینا ضروری تھا۔ کل موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس نے راجہ صاحب کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اسی وقت دیوان خانہ کی طرف چلی۔ ایسے خطرہ کی حالت میں وہ سر دمہری نہ کر سکی۔ چار سال کے بعد اُس نے راجہ صاحب کی خواب گاہ میں قدم رکھا۔ جگہ وہی تھی۔ پر کتنی بدلی ہوئی۔ پودوں کے گملے سوکھے پڑے تھے۔ چڑیوں کے پنجرے خالی۔ راجہ صاحب کہیں باہر جانے کے لیے تیار تھے۔ میز پر بیٹھے جلدی جلدی کوئی خط لکھ رہے تھے۔ منورما کے دیکھتے ہی چونک کر اُٹھے اور دروازہ پر لپکے۔ گویا کوئی خوفناک درندہ سامنے آگیا ہو۔

منورما نے سامنے کھڑی ہوکر کہا۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے ٹھیر جائیے!

راجہ صاحب کچھ جھجک کر کھڑے ہوگئے۔ جس ظالم کے خوف سے ساری ریاست میں کہرام مچاہوا تھا جس کی آواز سن کر لوگوں کاخون خشک ہوجاتا تھا۔ جس کے روبرو جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ محض ایک مشتِ استخواں تھا۔ جسے دیکھ کر رحم آتا تھا۔

اور یہ بندہ نفس شادی کرنے جارہا تھا۔ جس کے آرزوؤں پر پڑا ہوا پالا، سر

مونچھ اور ابروؤں پر چھایاہوا تھا۔ وہی اپنی جھکی ہوئی کمر اور کانپتی ہوئی ٹانگوں سے شادی کے مندر کی طرف دوڑا ہوا جارہا تھا۔ ہوس کی کتنی عبرت ناک تصویر تھی۔

منورما نے پراسرار لہجہ میں کہا۔ ایک لمحہ کے لیے بیٹھ جائیے۔ میں آپ کا بہت وقت نہیں لوں گی۔

راجہ بیٹھوں گا نہیں۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ جو بات کہنی ہو چٹ پٹ کہہ دو۔ مگر نصیحت کا دفتر مت کھولنا۔

منورما۔ میں آپ کو کیا نصیحت دوں گی۔ صرف اتنا ہی کہنے آئی ہوں کہ کل برات میں ہوشیار رہیے گا۔

راجہ۔ کیوں؟

منورما۔ فساد ہونے کا خوف ہے۔

راجہ۔ بس اتنا ہی کہنا ہے یا کچھ اور؟

منورما۔ بس اتنا ہی۔

راجہ۔ تو تم جاؤ۔ میں فتنہ اور فساد کی پرواہ نہیں کرتا۔ لٹیروں کا خوف انھیں ہوتا ہے۔ جن کے پاس سونے کی گٹھری ہوتی ہے۔ میرے پاس کیا ہے جس کے لیے ڈروں۔

یکایک ان کا چہرہ تند ہوگیا۔ آنکھو میں ایک بے فکری کی چمک پیدا ہوگئی۔ بولے۔ مجھے کسی کاخوف نہیں ہے۔ اگر کسی نے چوں بھی کیا تو ریاست میں آگ لگادوں گا۔ بشال سنگھ ریاست کامالک ہے۔ اس کا غلام نہیں۔ کون ہے جو میرے سامنے آنکھیں سیدھی کرسکے۔

منورما کادل درد سے تڑپ اٹھا۔ ان لفظوں میں کتنی روحانی خلش بھری ہوئی تھی۔ یہ ہوش کی باتیں نہ تھیں۔ بے ہوشی کی بڑتھی۔ مصر ہوکر بولی۔ پھر بھی ہوشیار رہنے میں تو کوئی برائی نہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔

راجہ نے منورما کی طرف مشتبہ آنکھوں سے دیکھ کرکہا۔ نہیں نہیں۔ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کسی طرح نہیں۔ میں تم کو خوب جانتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے راجہ صاحب باہر چلے گئے۔ منورما کھڑی سوچتی رہ گئی۔ اس کا

کیا مطلب ہے۔ ان الفاظ میں جو بدگمانی چھپی ہوئی تھی۔ اگر اس کی بو بھی اسے مل جاتی تو شاید اس کا دل پھٹ جاتا۔ وہ وہیں کھڑی کھڑی چلاکر روپڑتی۔ اس نے سمجھا شاید راجہ صاحب کو اسے اپنے ساتھ رکھنے میں وہی تامل ہے۔ جو ہر ایک مرد کو عورتوں سے مدد لینے میں ہوتا ہے۔ اس وقت وہ لوٹ گئی۔ لیکن یہ کھٹکا اُسے برابر لگا ہوا تھا۔

رات بہت بھیگ چکی تھی۔ باہر برات کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ ایسا شاندار جلوس نکالنے کا انتظام ہورہا تھا۔ جیسا اس شہر میں کبھی نہ نکلا ہو۔ گوری فوج تھی۔ کالی فوج تھی۔ ریاست کی فوج تھی۔ فوجی بینڈ تھا۔ ریاست کا بینڈ تھا۔ کوتل گھوڑوں کی لمبی قطار۔ سجے ہوئے ہاتھیوں کی ایک پوری لائن پھولوں سے سجائے ہوئے۔ سواری گاڑیاں، خوبصورت پالکیاں سبھی قسم کے موٹر کار اتنا سامان تھا کہ شام سے پہر رات تک تانتا ہی نہ ٹوٹے صدہا تخت سجائے گئے تھے۔ اور پھلواریوں کی تو کوئی گنتی ہی نہ تھی۔ ساری رات دروازہ پر چہل پہل رہی۔ راجہ صاحب آرائش کے انتظام میں منہمک رہے۔ منورما کئی بار ان کے دیوان خانہ میں آئی اور انھیں وہاں دیکھ کر لوٹ گئی۔ اس کے جی میں بار بار آتا تھا کہ باہر ہی چل کر راجہ صاحب سے آرزو منت کروں۔ لیکن خوف یہی تھا کہ کہیں وہ سب کے سامنے بک جھک نہ کرنے لگیں۔ جو اپنے ہوش میں نہیں۔ اُسے کس کی شرم اور کس کا لحاظ۔ آخر جب کسی طرح جی نہ مانا تو دروازہ پر جاکر کھڑی ہوگئی کہ شاید راجہ صاحب اسے دیکھ کر اس کی طرف آئیں۔ لیکن اسے دیکھ کر راجہ صاحب اور دور نکل گئے۔

سارے شہر میں اس جلوس اور شادی کا مضحکہ اڑایا جارہا تھا۔ نوکر چاکر سب آپس میں ہنستے تھے۔ راجہ صاحب کی چٹکیاں لیتے تھے۔ لیکن اپنی دُھن میں مست راجہ صاحب کو کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔ ساری رات بیت گئی اور منورما کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملا۔ تب وہ اپنی کوٹھڑی میں لوٹ آئی اور ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ گویا اس کا کلیجہ باہر نکل پڑے گا۔ اُسے آج سے 20 سال پہلے کی بات یاد آئی جب اس نے شادی سے پہلے راجہ صاحب سے کہا تھا۔ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے، نہ ہوسکتی ہے۔ مگر آج وہ بڑی خوشی سے راجہ صاحب کے لیے اپنی جان نثار کررہی ہے۔ یہ اس لازوال

محبت کی برکت تھی۔ جس سے وہ پندرہ سال تک بہرہ اندوز رہی اور جس کی ایک ایک بات اس کے دل پر نقش ہو رہی تھی۔ ان نقوش کو کون اس کے دل سے مٹا سکتا ہے۔ سرد مہری میں اتنی طاقت نہیں، بے وفائی میں اتنی طاقت نہیں۔ بے عزتی میں اتنی طاقت نہیں، یہاں تک کہ موت میں بھی اتنی طاقت نہیں محبت لافانی ہے۔ زندہ جاوید ہے۔

دوسرے دن برات نکلنے سے پہلے منورما پھر راجہ صاحب کے پاس جانے کو تیار ہوئی۔ لیکن کمرہ سے نکلی ہی تھی کہ دو سو مسلح سپاہیوں نے اُسے روک لیا۔

رانی نے تند لہجہ میں کہا۔ ہٹ جاؤ نمک حرامو! میں نے تمھیں نوکر رکھا اور تم مجھ ہی سے گستاخی کرتے ہو!

ایک سپاہی بولا۔ حضور کے حکم کے تابعدار ہیں۔ مہاراج کا حکم ہے کہ حضور یہاں سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ ہمارا کیا قصور ہے سرکار!

منورما۔ تمھیں کس نے یہ حکم دیا؟

سپاہی۔ خود مہاراجہ صاحب نے۔

منورما۔ میں صرف ایک منٹ کے لیے راجہ صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔

سپاہی۔ بڑی کڑی تاکید ہے سرکار! ہماری جان نہ بچے گی۔

منورما اینٹھ کر رہ گئی۔ ایک دن ساری ریاست اس کے اشارہ پر چلتی تھی آج پہرہ کے سپاہی تک اس کی بات نہیں سنتے۔ تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے۔

منورما نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ برات نکلنے میں کتنی دیر ہے؟

سپاہی۔ اب کچھ دیر نہیں ہے۔ سب تیاریاں ہو چکی ہیں۔

منورما۔ راجہ صاحب کی سواری کے ساتھ پہرہ کا تو خاص انتظام کیا گیا ہے؟

سپاہی۔ ہاں حضور! مہاراج کے ساتھ ایک سو گورے ہوں گے۔ مہاراج کی سواری انھیں کے بیچ میں ہوگی۔

منورما۔ مطمئن ہوگئی۔ راجہ صاحب ہوشیار ہوگئے۔ یہی اس کا منشا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

چار بجتے بجتے برات نکلی۔ طرح طرح کے باجے بج رہے تھے۔ اشرفیاں روپے

لٹائے جارہے تھے۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔ شہر تماشہ دیکھنے کو پھٹا پڑتا ہے۔

اسی وقت اہلیااور شنکھ دھر شہر میں داخل ہوئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ راجہ بشال سنگھ کی برات ہے تو انھوں نے راجہ صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ دم کے دم میں ساری برات رُک گئی۔ کنور صاحب آگئے۔ یہ خبر ہوا کی جھونکے کی طرح اس سرے سے اُس سرے تک دوڑ گئی۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ راجہ صاحب شنکھ دھر کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کود کر اُسے سینہ سے لگالیا۔ وہ آرزو پوری ہوگئی۔ جس کے نام کو روچکے تھے۔ بار بار کنور کو چھاتی سے لگاتے تھے۔ پر آسودگی نہ ہوتی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ جب ذرا طبیعت کو سکون ہوا تو بولے۔ تم آگئے بیٹا! مجھ پر بڑی دیا کی۔ اپنے باپ کو بھی لائے ہو نا؟ شنکھ دھر نے کہا وہ تو نہیں آئے۔

راجہ۔ آئیں گے۔ میرا دل کہتا ہے۔ میں تو زندگی سے بالکل مایوس ہوچکا تھا۔ تم چلے گئے۔ تمھاری ماں بھی چلی گئی۔ پھر میں کس کا منہ دیکھ کر جیتا۔

شنکھ دھر۔ اماں تو میرے ساتھ ہیں۔

راجہ۔ اچھا! وہ بھی آگئی۔ واہ میرے ایشور! ساری خوشیاں ایک ہی دن کے لیے جمع کررکھی تھیں۔ دونوں اسی وقت اہلیا کے پاس آئے۔ باپ اور بیٹی کی ملاقات کا نظارہ نہایت مسرت انگیز تھا۔ جب آنسوؤں کا سیلاب کچھ کم ہوا۔ تو راجہ صاحب بولے۔ تمھیں یہ برات دیکھ کر ہنسی آئی ہوگی۔ سبھی ہنس رہے ہیں۔ لیکن بیٹا! یہ برات نہیں ہے۔ کیسی برات؟ اور کیسا دولہا؟ یہ ایک مجنوں دل کی تڑپ ہے۔ اور کچھ نہیں۔ دل کہتا تھا، جب ایشور کو میری پرواہ نہیں۔ وہ مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں کرتے۔ بے سبب مجھے ستاتے ہیں تو میں کیوں ان کا احترام کروں۔ جب آقا کو خادم کی فکر نہیں تو خادم کو آقا کی کیوں فکر ہونے لگی۔ میں نے خوب پیٹ بھر کے ظلم کیا۔ حق اور ناحق۔ روا اور ناروا کے سارے خیالات دل سے نکال ڈالے اور آخر میں میری اس پر فتح ہوئی۔

اہلیا۔ للو اپنے لیے رانی بھی لیتا آیا۔

راجہ۔ سچ کہنا یہ تو بڑا مزا رہا۔ وہ بھی ساتھ ہے؟ تب تو یہ میری برات کا جلوس نہیں۔ شنکھ دھر کی شادی کا جشن ہے!

(51)

کملا کو جگدیش پور میں آکر ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک جگ کے بعد گھر آئی ہے۔ وہاں کی سبھی چیزیں، سبھی آدمی اس کے جانے پہچانے تھے۔ اور ان کی حالتوں میں کتنا تغیر ہوگیا تھا۔ اس کا وسیع ناچ گھر بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ لتائیں خشک ہوگئی تھیں۔ فوارے سوکھے پڑے ہوئے تھے۔ صرف لمبے ستون باقی تھے۔ مگر کملا کو ناچ گھر کی بربادی کا ذرا بھی غم نہ ہوا۔ اس کے برعکس اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے ایک قسم کی راحت ہوئی۔ کتنی ہی پرانی باتیں اس کی آنکھوں میں پھر گئیں۔ کتنی ہی یادگاریں تازہ ہوگئیں۔ وہ مقام ہے جہاں اس بدنصیب نے اپنے شوہر کو نہ پہچان کر اس کے لیے اپنی محبت کا جال پھیلایا تھا۔ کاش! پرانی باتیں فراموش ہوجاتیں۔ اس عیش پروانہ زندگی کی یاد اس کے دل میں سے مٹ جاتی۔ ان باتوں کی یاد رکھتے ہوئے کیا اس کو اس زندگی میں سکون ہوسکتا تھا۔ قضا کا ظالم ہاتھ کہیں غائب سے نکل کر اسے ڈرانے لگا۔

ناچ گھر سے نکل کر دیوپریا رانی منورما کے گھر میں داخل ہوئی۔ حسن کی وہ لطافت اور شوخی رخصت ہوچکی تھی۔ جن زلفوں کو ہاتھ میں لے کر اس نے اپنے دل میں ایک کیفیت کا احساس کیا تھا۔ وہ اس طرح اُلجھی پڑی تھی۔ گویا مہینوں ان کی کسی نے خبر نہ لی ہو۔ جن آنکھوں میں شباب کی امنگیں رقص کرتی تھیں۔ وہاں حسرت ماتم کررہی تھی۔ یاس اور عبرت کی ایک تصویر تھی۔ جسے دیکھ کر دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔

منورما بولی۔ ناچ گھر دیکھنے گئی تھی؟ آج کل تو بے مرمت پڑا ہوا ہے۔ اس کی رونق تو رانی دیوپریا کے ساتھ گئی۔

کملا نے آہستہ سے کہا۔ وہاں آگ کیوں نہ لگ گئی۔ یہی تعجب ہے۔

منورما۔ کیا وہ داستان سن چکی ہو؟

کملا۔ ہاں جتنا جانتی ہوں اتنا ہی بہت ہے۔

یہاں سے وہ رانی رام پریا کے پاس گئی۔ اور اُسے دیکھ کر بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روک سکی۔ آہ! جس لڑکی کو اس نے ایک دن گود کھلایا تھا۔ وہ اس کی ماں سی معلوم ہوتی تھی۔

کملا نے بینا کو دیکھ کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو گانے سے بہت شوق ہے۔

رام پریا اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ شاید کملا کی بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔

کملا نے پھر کہا۔ میں بھی آپ سے کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔

رام پریا ابھی تک اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔

کملا پھر بولی۔ آپ کو بہت دردِ سر نہ لینا پڑے گا۔ میں کچھ کچھ گانا جانتی ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے بینا اُٹھالی اور گانے لگی۔

پربھو کے درشن کیسے پاؤں؟

☆☆☆
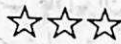
یہی گیت تھا جو رام پریا نے کتنی ہی بار دیوپریا کو گاتے سنا تھا۔ وہی آواز تھی وہی شیرینی تھی۔ وہی لوچ تھا۔ وہی دل میں چبھنے والی تان تھی۔ رام پریا نے ہیبت زدہ آنکھوں سے کملا کو دیکھا اور بے ہوش ہوگئی۔ کملا اُسے بے ہوش ہوتے دیکھ کر سہم اُٹھی۔ وہ رام پریا کو اسی حالت میں چھوڑ کر اس طرح اپنے محل کو چلی۔ گویا کوئی اسے ڈرا رہا ہو۔

منورما کو جیون ہی ایک لونڈی سے رام پریا کے غش کھانے کی خبر ملی۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ کئی منٹ کے بعد رام پریا نے آنکھیں کھولیں۔ وہ پھر سہم اُٹھی اور گھبرائی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔

منورما نے پوچھا۔ آپ کو یہ یکایک کیا ہوگیا؟ ابھی تو بہو جی یہاں بیٹھی گا رہی تھیں۔

رام پریا نے منورما کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ کچھ کہتے نہیں بنتا بہن! معلوم نہیں آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے یا کیا بات ہے؟ بہو کی صورت بالکل دیوپریا بہن سے ملتی ہے۔ رتی بھر کا بھی فرق نہیں۔

منورما۔ کچھ کچھ ملتی تو ہے۔ مگر اس سے کیا؟ ایک ہی صورت کے دو آدمی کیا نہیں ہوتے؟

رام پریا۔ نہیں منورما! بالکل وہی صورت ہے۔ رنگ ڈھنگ، بول چال، سب وہی ہے۔ گیت بھی اس نے ویسا ہی گایا۔ جو دیوپریا بہن گایا کرتی تھیں۔ بالکل وہی سر تھا، وہی آواز، تم سے کہا کیوں بہن! تل اور مسے کا بھی تو فرق نہیں۔ تم نے دیوپریا کو جوانی میں نہیں دیکھا۔ میری آنکھوں میں تو آج بھی ان کی وہ موہنی صورت پھر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہن خود کہیں سے آگئی ہے۔ کیا راز ہے۔ کہہ نہیں سکتی۔ مگر یہ دیوپریا ہے۔ اس میں ذرا بھر بھی شبہ نہیں!

منورما۔ راجہ صاحب نے بھی تو رانی دیوپریا کو جوانی میں دیکھا ہوگا؟

رام پریا۔ ہاں! دیکھا ہے۔ دیکھ لینا وہ بھی یہی بات کہیں گے۔ صورت کا ملنا اور بات ہے اور وہی ہو جانا اور بات ہے۔ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ دیوپریا بہن پھر اوتار لے کر آئی ہیں۔

منورما۔ ہاں! یہ بات ہو سکتی ہے۔

رام پریا۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس نے گیت بھی وہی گایا۔ جو دیوپریا کو بہت پسند تھا۔ اُسے جو کچھ عیش و آرام کرنا تھا کر چکی۔ اب یہاں کیا کرنے آئی ہے؟ مجھے تو شگون بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

منورما۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہی ہیں گویا وہ اپنی خوشی سے آئی ہیں۔

رام پریا۔ یہ تو ہوتا ہی ہے اور تم کیا سمجھتی ہو۔ میں نے کئی کتابوں میں پڑھا ہے۔ آدمی اپنی زندگی کا ادھورا کام پورا کرنے کے لیے اسی گھر میں جنم لیتا ہے۔ اس کی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں۔

منورما۔ لیکن رانی دیوپریا تو خود راج پاٹ چھوڑ کر تیرتھ یاترا کرنے گئی تھیں۔

رام پریا۔ کیا ہوا، ان کی ہوس باقی تھی۔ اگر وہی ہوس انھیں پھر کھینچ لائی ہے

تو خیریت نہیں۔

منورما۔ آپ کی باتیں سن کر تو مجھے بھی شبہ ہونے لگا۔

اسی وقت اہلیا سامنے نکل گئی۔ غرور آمیز مسرت سے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ مشیعت کس طرح اپنا جال پھیلاتی ہے۔ اُسے اس کی کیا خبر ؟

(52)

منشی بجردھر نے یہ مژدہ سنا۔ تو فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے اور قصر شاہی میں آپہنچے۔ شنکھ دھر ان کے آنے کی خبر پاکر ننگے پاؤں دوڑا۔ اور ان کے قدموں پر گر پڑا۔ منشی جی نے پوتے کو چھاتی سے لگالیا اور بولے۔ یہ مبارک دن دیکھنا بدا تھا۔ اسی سے اب تک زندہ ہوں۔ اب اتنی آرزو اور ہے کہ تمھارا راج تلک دیکھ لوں۔ تمھاری دادی بیٹھی تمھاری راہ دیکھ رہی ہے۔ کیا انھیں بھول گئے؟ شنکھ دھر نے شرماتے ہوئے کہا۔ جی نہیں۔ شام کو جانے کا ارادہ تھا۔ انھیں کی دعا سے تو میں منزل مقصود پر پہنچا۔ منشی جی نے پوچھا۔ تم للو کو اپنے ساتھ نہ کھینچ لائے۔

شنکھ دھروہ اس وقت میرے ساتھ نہ آتے۔ میں نے اپنے تئیں ظاہر نہیں کیا۔ ورنہ وہ مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کرتے۔ اس کے بعد شنکھ دھر نے اپنی سیاحت کا، اپنی مشکلات کا اور چکردھر سے ملنے کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ یوں باتیں کرتے ہوئے منشی جی راجہ صاحب کے پاس جا پہنچے۔ راجہ صاحب نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اور بولے۔ آپ تو ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔

منشی جی۔ مہاراج! اب آپ کا اور میرا رشتہ دوسری قسم کا ہے۔ زیادہ آؤں جاؤں تو آپ ہی کہیں گے۔ اب یہ کیا کرنے آتے ہیں۔ شاید کچھ لینے کی غرض سے آئے ہوں گے۔ زندگی میں کبھی صاحب ثروت نہیں رہا۔ لیکن اپنے وقار کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

راجہ۔ آخر آپ دن بھر بیٹھے وہاں کیاکرتے ہیں؟ دل بھی نہیں گھبراتا؟ (مسکراکر) سمدھن صاحبہ میں بھی تو اب وہ کشش نہ رہی۔

منشی جی۔ واہ! آپ اس کشش کا مزا کیا جانیں۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ میاں بیوی

کا رشتہ محبت عمر کے ساتھ میں مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اب تو راج کمار کا تلک ہو جانا مناسب ہے۔ آپ بھی کچھ دن بھگوت بھجن کر لیجیے۔

راجہ۔ خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے؟ کہ جب سے شنکھ دھر آیا ہے مجھے نہ جانے کیوں یہ وہم ہوتا ہے کہ اس تقریب میں کوئی نہ کوئی خلل واقع ہوگا۔ دل کو بہت سمجھاتا ہوں۔ لیکن یہ اندیشہ سے دور نہیں ہوتا۔

منشی۔ آپ ایشور کا نام لے کر تلک کیجیے۔ جب چھوٹی ہوئی آرزوئیں پوری ہو گئیں۔ تب سارے کام خیر وخوبی سے ہو جائیں گے۔ آج میرے یہاں محفل ہوگی آپ کو بھی دعوت دیتا ہوں۔

راجہ۔ نہیں منشی جی! مجھے تو معاف کیجیے۔ میرے دل کو سکون نہیں ہے۔ آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آج اگر مجھے موت آجائے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب آدمی دنیا میں نہ ہوگا۔ غم کی انتہا دیکھ لی۔ خوشی کی انتہا بھی دیکھ لی۔اب اور کچھ دیکھنے کی ہوس نہیں۔ ڈرتا ہوں۔ کہیں پلڑا پھر دوسری طرف نہ جھک جائے۔

منشی جی دیر تک بیٹھے راجہ صاحب کو تشفی دیتے رہے۔ پھر سب عورتوں کو اپنے یہاں آنے کا نیوتہ دے کر اور شنکھ دھر کو گلے لگا کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اس بے لوث آدمی نے فکروں کو کبھی اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ دولت کی خواہش تھی۔ ثروت کی بھی خواہش تھی۔ پر اس پر جان نہ دیتے تھے۔ جمع کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ تھوڑا ملا۔ تب بھی تنگی رہی۔ بہت ملاتب بھی تنگی رہی۔ تنگی سے آخر دم تک ان کا گلانہ چھوٹا۔ ایک زمانہ تھا۔ جب اچھے کھانے کو ترستے تھے۔ اب دل کھول کر خیرات کرنے کو ترستے تھے۔ کیا پاؤں اور کیا دے دوں؟ بس فکر تھی تو اتنی ہی۔ کمر جھک گئی تھی۔ آنکھوں سے سوجھتا بھی کم تھا۔ لیکن محفل روزانہ جمتی تھی۔ دل میں کسی سے کینہ نہیں رکھتے اور نہ کبھی کسی کے بدخواہ ہوئے۔ شام کو منشی جی کے گھر بڑی دھوم دھام سے جشن ہوا۔ نرملا پوتے کو چھاتی سے لگا کر خوب روئی۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ یہ میرے ہی گھر رہتا۔ اسے دیکھنے سے آنکھوں کو سیری نہ ہوتی تھی۔ اہلیا ہی کے باعث اس کا لڑکا ہاتھ سے گیا۔ پوتہ بھی اسی کے کارن ہاتھ سے جارہا ہے۔ اس لیے اب بھی اس کا دل اہلیا سے نہ ملتاتھا۔ وہ اب اس آخروقت میں کسی کو

آنکھوں کے اوٹ نہ کرنا چاہتے تھے۔ نہ جانے کب آنکھیں بند ہوجائیں۔ بے چاری کسی کو دیکھ بھی نہ سکے۔

باہر گانا ہورہا تھا۔ منشی جی دعوت کا انتظام کررہے تھے۔ اہلیا لالٹین لے کر گھر کے اثاثہ کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور دل میں اپنی چیزوں کے تہس نہس ہوجانے پر جھنجھلارہی تھی۔ ادھر نرملا چارپائی پر لیٹی شنکھ دھر کی باتیں سننے میں محو تھی۔ کملا پاؤں دبارہی تھی۔ شنکھ دھر پنکھا جھل رہا تھا۔ کیا جنت میں اس سے زیادہ دلچسپی کے سامان ہوں گے۔ اس سکھ سے اہلیا اسے محروم کررہی تھی۔ اس نے آکر اس کا گھر ملیا میٹ کردیا۔

علی الصبح جب شنکھ دھر رخصت ہونے لگا تو نرملا نے کہا۔ بیٹا! اب بہت دن نہ جیوں گی۔ جب تک جیتی ہوں ایک بار ضرور آجایا کرو!

منشی جی بولے۔ آخر سیر کرنے تو روز ہی نکلوگے۔ گھومتے ہوئے ادھر بھی آجایا کرو۔ یہ مت سمجھو کہ یہاں آنے سے تمھارا وقت برباد ہوگا۔ بزرگوں کی دعا اکارت نہیں جاتی۔ میرے پاس راج پاٹ نہیں ہے۔ پر ایسا کمال ہے کہ جو راج پاٹ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ بہت خدمت اور ریاض سے میں نے اسے حاصل کیا ہے۔ وہ مجھ سے لے لو۔ اگر سال بھر بھی بلاناغہ مشق کرتے رہو۔ تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہو۔ اسی علم کی بدولت تم نے پانچ سال میں کتنی ہی دیاروں کی سیاحت کی۔ کچھ دن اور مشق کرلو۔ تو پارس ہوجاؤ!

نرملا نے منشی جی کا منہ چڑھا کر کہا۔ بھلا رہنے دو۔ اپنی ودیا۔ آئے وہاں سے بڑے ودوان بن کر۔ مجھے تمھاری ودیا نہیں چاہیے۔ چاہے تو دنیا بھر کے استادوں کو بلاکر نچائے۔ اُسے کمی کس چیز کی ہے؟

منشی جی۔ تم تو ہو بے وقوف! تم سے کوئی کیا کہے۔ اس ودیا سے ایشور کے درشن تک ہوجاتے ہیں۔ تمھیں کچھ خبر بھی ہے؟ بڑے خوش نصیب ہیں وہ جنھیں یہ ودیا آتی ہے۔

نرملا۔ جبھی تو بڑے بھاگوان ہو۔

منشی جی۔ تو اور کیا ابھاگا ہوں؟ جس کے ایسا فرشتہ خصال پوتا ہو۔ ایسی دیوی

سی بہو ہو۔ مکان ہو۔ جائداد ہو۔ چار کو کھلا کر کھاتا ہو۔ کیا وہ ابھاگا ہے۔ جس کی عزت آبرو سے نبھ جائے۔ وہی خوش نصیب ہے۔

آج راجہ صاحب کے یہاں بھی تقرب تھی۔ اس لیے شنکھ دھر نہ ٹھہر سکا۔ جب وہ موٹر پر بیٹھ گیا۔ تو نرملا دروازے پر کھڑی ہوکر اسے دیکھنے لگی۔ بھگوان شنکھ دھر کے ساتھ ہی اس کا دل بھی اڑا چلا جاتا تھا۔ جوانوں کی محبت میں اضطراب ہوتا ہے۔ بوڑھوں کی محبت میں درد۔ جوان جس سے محبت کرتا ہے۔ اس سے محبت کی امید بھی رکھتا ہے۔ اگر اس سے محبت کے بدلے محبت ملے۔ تو محبت کو دل سے نکال کر پھینک دے گا۔ بوڑھوں کو بھی کیا یہی اُمید ہوتی ہے۔ وہ محبت کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کے بدلے میں انھیں کچھ نہ ملے گا۔ یا ملے گا تو رحم۔ شنکھ دھر کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ دل میں تڑپ نہ تھی۔ وہ یوں خوش خوش چلا جارہا تھا جیسے سیر کرکے لوٹا جارہا ہو۔

مگر نرملا کا دل پھٹا جاتا تھا، اور منشی بجردھر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھارہا تھا۔

(53)

کئی دن گذر گئے۔ راجہ صاحب عبادت اور پرستش میں مصروف تھے۔ ادھر چار پانچ سال سے انھوں نے کسی مندر کی طرف جھانکا نہ تھا۔ ریاست میں دھرم کا کھاتہ ہی توڑ دیا گیا تھا۔ مگر اب یکایک ان کا اعتقاد جی اٹھا تھا۔ دھرم کھاتہ پھر کھولا گیا۔ اور جو اوقات بند کردی گئی تھیں۔ وہ پھر جاری ہوئیں۔ راجہ صاحب نے پھر چولا بدلا۔ وہ کسی کی بے غرض عبادت نہ کرتے تھے۔ جب اہلیا اور شنکھ دھر نے آکر ان کی زندگی کو روشن کردیا۔ تو پھر پوجا پاٹھ، وان پُن کی انھیں دھن ہوئی۔

ان دنوں راجہ صاحب اکثر تنہائی میں بیٹھے کسی فکر میں غرق رہتے تھے۔ باہر بہت کم نکلتے کسی چیز سے رغبت نہ رہی تھی۔ اب اپنی زندگی کے کارنامے یاد کرکے ان کی تلافی کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

آدھی رات سے زیادہ بیت چکی تھی۔ رنواس میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ منورما اپنی

چھوٹی کوٹھری میں پڑی ہوئی تھی۔ دفعتاً راجہ صاحب اندر داخل ہوئے۔ منورما حیرت میں آکر کھڑی ہوگئی۔

راجہ صاحب نے کوٹھری کو نیچے سے اوپر تک دیکھ کر رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ نورا! میں آج تم سے اپنی خطائیں معاف کرانے آیا ہوں۔ مجھے اتنے دنوں تک کیا ہو گیا تھا۔ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا ہوں۔ طرح طرح کے ولولے پیدا ہوتے رہتے تھے۔ کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی مجھے کسی غیبی آفت کا خوف ہورہا ہے۔ تم میری حفاظت کے لیے جو کچھ کرتی تھیں اس میں مجھے دغا کی بو آتی تھی۔ تم نے مجھے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن میں نے اس کا مطلب کچھ اور ہی سمجھ لیا۔

منورما نے چشم پُر آب ہوکر کہا۔ ان باتوں کی یاد نہ کیجیے۔ آپ کو بھی رنج ہوتا ہے اور مجھے بھی رنج ہوتا ہے۔ میرا ایشور جانتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل مین بے وفائی کا خیال نہین آیا۔

راجہ۔ جانتا ہوں نورا! جانتا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہورہا ہے کہ مصیبت میں دل کے نازک جذبات فنا ہوجاتے ہیں۔ ثروت پاکر مجھے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، وہ کچھ نہ کیا۔ جو کچھ کیا الٹا ہی کیا۔ میں رانی دیوپریا کے طرز عمل پر ہنسا کرتا تھا۔ پر میں نے رعایا پر جتنے ستم ڈھائے۔ انھیں دیکھ کر دیوپریا بھی کانوں پر ہاتھ رکھتی۔ میں قرض کو کالاسانپ سمجھتا تھا۔ پر آج ریاست قرض کے بوجھ سے لدی ہوئی ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ مجھے یہ ریاست نہ ملی ہوتی۔ تو میری زندگی اس سے کہیں اچھی ہوتی۔

منورما۔ مجھے بھی اکثر یہی خیال ہوا کرتا ہے۔

راجہ۔ اب زندگی کے سب سے اونچے زینہ پر پہنچ کر جب گذرے ہوئے زمانہ پر نگاہ ڈالتاہوں تو افسوس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھ سے کسی کو فیض نہ پہنچا میں زندگی کی ان برکتوں سے بھی محروم رہا۔ جو عوام کے حصہ میں آتی ہیں۔ اگر میری زندگی میں کوئی میٹھی یاد ہے۔ تو وہ تمھاری ذات سے ہے اور وہ تمھارے ساتھ میں نے یہ برتاؤ کیا ہے۔ شنکھ دھر اپنے ساتھ میرے دل کی ساری نزاکتون کو بھول گیا تھا۔ اُسے پاکر آج پھر میں اپنے کو پاگیا تھا۔ لیکن میرا دل اندر ہی اندر کانپ رہا

ہے۔ میں اس خوف کو کسی طرح باہر نہیں نکال سکتا کہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ اس کا خیال کرکے ہی میں گھبرا جاتا ہوں۔ اور جی چاہتا ہے کہ زندگی کا خاتمہ کردوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے میں سونے کی گٹھری لیے خوفناک بیابان میں اکیلا چار جارہا ہوں ہر قدم پر رہزنوں کا خوف دل میں لرزہ پیدا کرتا ہے۔

یہ کہتے کہتے راجہ صاحب منورما کے اور قریب چلے آئے اور اس کے کان کے پاس منہ لے جاکر بولے۔ یہ خوف بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ نورا! رانی دیوپریا کے شوہر میرے بھائی ہوتے تھے۔ ان کی صورت شنکھ دھر سے بالکل ملتی ہے۔ جوانی میں میں نے ان کو دیکھا تھا۔ ہو بہو یہی صورت تھی۔ ان کی ایک تصویر میرے البم میں ہے۔ تم یہی کہوگی کہ یہ شنکھ دھر کی تصویر ہے۔ پہلے شنکھ دھر کی صورت ان سے اتنی ہی ملتی تھی۔ جتنی میری۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی آگئے۔

منورما۔ تو اس میں خوف کی کیا بات ہے؟ اسی شاخ کا پھل شنکھ دھر بھی تو ہے۔

راجہ۔ نہیں نورا! تم یہ بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ تمھیں کیسے سمجھاؤں۔ یہ پُر اسرار معاملہ ہے۔ میں نے اب کی شنکھ دھر کو دیکھا تو چونک پڑا۔ اسی وقت میرے رونئیں کھڑے ہوگئے۔

منورما۔ تعجب تو مجھے بھی ہورہا ہے۔ بہن رام پریا ابھی کہہ رہی تھیں کہ بہو کی صورت رانی دیو پریا سے بالکل ملتی ہے۔ وہ تو بہو کو دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔

راجہ نے گھبرا کر کہا۔ رام پریا نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی۔ نورا! اب خیریت نہیں ہے۔ میری بات گرہ باندھ لو۔ اب خیریت نہیں ہے۔

راجہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ فکر میں ڈوب گئے۔ ایک لمحہ کے بعد گویا دل میں یہ فیصلہ کرکے ایسی حالت میں انھیں کیا کرنا ہوگا۔ نہایت دردناک لہجہ میں منورما سے بولے۔ کیوں نورا! ایک بات تم سے پوچھوں۔ برا تو نہ مانوگی؟ میرے دل میں کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے مجھ سے کیوں شادی کی؟ اس وقت بھی میری عمر ڈھل چکی تھی۔ ثروت کی خواہش تمھیں کبھی نہیں رہی۔ کیا یہ محض غیبی تحریک تھی؟ جس کے ذریعے مجھے اچھے کاموں کا صلہ دیا گیا۔

منورما نے مسکرا کر کہا۔ بُرے کاموں کی سزا کہیے!

راجہ۔ نہیں نورا! میں نے زندگی میں جو کچھ راحت اور لذت پائی وہ تم میں پائی۔ یہ تقدیر کی نیرنگی ہے کہ تمھیں میرے ہاتھوں اتنی ایذا پہنچے۔ مگر وہ امتحان تھا۔ جس نے تمھاری وفا اور خلوص کو اور بھی روشن کردیا۔ کوئی دوسری عورت ایسی حالت میں میری خون کی پیاسی ہوجاتی۔ وہ روحانی کوفت، وہ تحقیر، وہ سفلہ پن دوسرا کون سہتا۔ اور سہہ کر دل میں میل نہ آنے دیتا۔ اس کا صلہ میں کیا دے سکتا ہوں۔

منورما۔ عورت کیا صلہ ہی کے لیے شوہر کی خدمت کرتی ہے؟

راجہ۔ اس مسئلہ پر میری زبان نہ کھلواؤ نورا! کہیں شاید تمھیں میرے منہ سے اپنی بہنوں کے متعلق ناگوار حقیقتیں سننی پڑیں۔ میرے اس سوال کا جواب دو جو میں نے ابھی تم سے کیا تھا۔ مجھ میں کون سی وہ بات تھی۔ جس نے تمھیں مجھ سے شادی کرنے کی تحریک دی۔

منورما۔ بتادوں۔ آپ ہنسیں گے تو نہیں؟ میں رانی بننا چاہتی تھی۔

راجہ۔ رانی کس لیے بننا چاہتی تھی؟

منورما۔ جس لیے آپ راجہ بننا چاہتے تھے۔ نام اور نمود، خدمت اور اصلاح میری نظروں میں بھی ثروت کی نعمتیں ہیں۔

راجہ۔ لیکن میں تو عیش اور حکومت کے لیے راجہ بننا چاہتا تھا۔ تمھارا معیار کچھ اور ہے، میرا کچھ اور۔ اب میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ کون جانتا ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟ تم نے خدمت کے لیے زندگی کے اور سبھی مسرتوں کو قربان کردیا۔ اس لیے میں کوئی ایسا نظام کرجانا چاہتا ہوں کہ ریاست کا ایک حصہ تمھارے نام لکھ دوں۔ میری بات سن لو نورا! میں نے دنیا دیکھی ہے اور دنیا کا بیوہار جانتا ہوں۔ اس میں نہ میرا کچھ نقصان ہے، نہ تمھارا۔ اور نہ شنکھ دھر کا۔ تمھیں اس کا اختیار ہوگا کہ جب مرضی ہو۔ اپنا حصہ شنکھ دھر کو دے دو۔ لیکن ایک حصہ پر تمھارا نام ہونا ضروری ہے۔ میں کوئی عذر نہ سنوں گا۔

منورما۔ میری نجات اب اسی میں ہے کہ آپ کی خدمت کرتی رہوں۔

راجہ۔ تم اب بھی میری باتیں نہیں سمجھیں۔ مجھے آثار برے نظر آرہے ہیں۔

منورما۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے شکوک باطل ہیں۔ لیکن ایشور کو برا کرنا ہی منظور ہو۔ تو بھی میں شنکھ دھر کی ہمسری نہ کروں گی۔ جسے میں نے لڑکے کی طرح پالا ہے۔

راجہ نے زانو پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ نورا! تم اب بھی نہیں سمجھیں۔ خیر کل سے تم نئے محل میں رہو گی۔ یہ میرا حکم ہے۔

راجہ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بجلی کی شفاف روشنی میں منورما ان کی تمتماتی ہوئی صورت کو کھڑی دیکھتی رہی۔ غرور سے اس کا دل پھولا نہ سماتا تھا۔ اس بات کا غرور نہ تھا کہ اب ریاست میں پھر اس کی طوطی بولے گی۔ اسے پھر سیاہ وسفید کا اختیار ہوگا۔ غرور اس بات کا تھا کہ وہ امتحان میں پوری اتری۔ آج بشال سنگھ نے منورما کے دل پر فتح پائی۔ ان کی ہمدردی نے منورما کو جیت لیا۔ محبت ہمدردی ہی کی رنگین صورت ہے۔

(54)

راجہ صاحب کو اب کسی طرح اطمینان نہ تھا۔ ایک نامعلوم دہشت ہمیشہ ان پر غالب رہتی۔ دوچار آدمیوں کو زور زور سے باتیں کرتے سنتے انھیں کسی حادثہ کا گمان ہوجاتا تھا۔ شنکھ دھر کہیں جاتا۔ تو جب تک وہ خیرت سے لوٹ نہ آئے انھیں اضطراب رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی راتوں کو اُٹھ کر ٹھاکر دوارہ میں چلے جاتے اور گھنٹوں ایشور کی استتی کرتے۔ شنکھ دھر کا چہرہ دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پُر آب ہوجاتی تھیں۔ جو خوف ان کے دل میں سمایا ہوا تھا۔ وہ ظاہر نہ کرسکتے تھے۔ شاید اس کی حقیقت سے بے خبر تھے۔

شام ہوگئی تھی۔ راجہ صاحب نے موٹر منگوائی۔ اور منشی بجردھر کے مکان پر جا پہنچے۔ منشی جی کی مجلس آراستہ ہوگئی تھی۔ ان کی ساری فکریں ساری پریشانیاں نغمہ کی تانوں میں روپوش ہوجاتی تھیں۔ راجہ صاحب کے دیکھتے ہی بولے۔ آیئے مہاراج! آج گوالیار کے ایک استاد کا گانا سناؤں۔ یہ اس زمانہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

راجہ صاحب دل میں منشی جی کی رنگین مزاجی پر جھنجھلائے۔ دنیا میں ایسے

مخلوق بھی ہیں۔ جنھیں اپنے عیش کے سامنے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ شنکھ دھر سے میرا ان کا یکساں تعلق ہے۔ اگر یہ اپنے گانے بجانے میں مست ہیں۔ میں تفکرات کا شکار ہورہا ہوں۔ بولے۔ اسی لیے تو آیا ہی ہوں۔ لیکن آپ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

دونوں آدمی الگ ایک کمرہ میں جا بیٹھے۔ راجہ صاحب سوچنے لگے۔ کس طرح بات چیت شروع کروں۔ منشی جی نے ان کا رُخ دیکھ کر کہا۔ میرے لائق جو خدمت ہو فرمایئے! آپ بہت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔

راجہ۔ مجھے آپ کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ آپ مجھے بھی یہ فن کیوں نہیں سکھادیتے؟

منشی جی۔ یہ تو کوئی مشکل نہیں۔ اتنا ہی سمجھ لیجیے کہ ایشور نے ہی کائنات کو پیدا کیا اور وہی اسے چلاتا ہے۔ جو کچھ اس کی مرضی ہوگی۔ وہی ہوگا۔ اس کا فکر کا بوجھ ہم کیوں اپنے سر لیں۔

راجہ۔ یہ تو بہت دنوں سے جانتا ہوں مگر اس سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا اب مجھے معلوم ہورہا ہے کہ دنیا پرستی ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ میں نے اپنی زندگی پر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہیں کیا۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کبھی اس کا دھیان ہی نہ گیا۔ جب راج نہ تھا۔ تو کچھ دنوں کے لیے خدمت کا خیال دل میں پیدا ہوا تھا۔ راج ملتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ شنکھ دھر کو پاکر میں نہال ہوگیا تھا۔ لیکن اب کی جب سے وہ لوٹا ہے۔ اس کی طرف سے ایک عجیب فکر پیدا ہوگئی ہے۔

منشی۔ جی نہیں! ان دنوں تو میں باہر نوکر تھا۔ تب علم کی قدر تھی۔ مڈل پاس کرتے ہی سرکاری نوکری مل گئی۔

میرے بڑے پنڈت جی کہا کرتے تھے۔ یہ لڑکا ایک دن اعلیٰ منصب پر پہنچے گا۔ ان کی پیشین گوئی اس دن پوری ہوئی جب میں تحصیلداری پر پہنچا۔

راجہ۔ بھائی صاحب کی صورت آج تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ یہ دیکھیے اُن کی تصویر ہے۔

راجہ صاحب نے ایک فوٹو نکال کر منشی جی کو دکھلایا۔ منشی جی اسے دیکھتے ہی

بولے۔ یہ تو شنکھ دھر کی تصویر ہے۔

راجہ۔ نہیں صاحب! یہ تو میرے بڑے بھائی کی تصویر ہے شنکھ دھر نے تو ابھی تصویر ہی نہیں کھچوائی۔

منشی۔ میں اسے کیسے مان لوں۔ یہ تصویر صاف شنکھ دھر کی ہے۔

راجہ۔ تو تحقیق ہوگیا کہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھارہی تھیں۔

منشی۔ کیا یہ فی الواقعی آپ کے بھائی صاحب کی تصویر ہے؟

راجہ۔ جی ہاں! یقین مانئے۔

منشی۔ یہ معمہ سمجھ میں نہیں آتا۔

راجہ۔ اب آپ سے کیا عرض کروں۔ دو صورتوں میں اتنی مشابہت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ فکر مجھے مارے ڈالتی ہے۔ بھائی صاحب نے یہ پھر میرے گھر میں اوتار لیا ہے۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں۔ ایشور ہی جانے۔ کیوں ایشور نے یہ عنایت کی ہے۔

منشی۔ ایشور چاہیں گے تو سب خیریت ہوگی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔

راجہ۔ اگر ایشور کو خیریت منظور ہوتی۔ تو یہ صورت ہی کیوں پیدا ہوتی۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی کرشمہ دکھائیں گے۔ بہو کی صورت بھی رانی دیوپریا سے مل رہی ہے۔ رام پریا تو بہوجی کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ اُسے یقین ہے کہ دیوپریا ہی نے اوتار لیا ہے۔ بھائی اور بھاوج کا پھر اس گھر میں آنا اپنے اندر کوئی معنی رکھتا ہے۔

منشی جی نے اب کی کچھ متفکر ہوکر کہا۔ یہ تو عجیب راز ہے۔

راجہ۔ عجیب نہیں ہے منشی جی! یہ ریاست فنا ہونے والی ہے۔ لیکن آپ دیکھ لیجیے گا۔ میں اپنے کو تقدیر کے ہاتھوں کھلونا نہ بننے دوں گا۔ اگر میں نے برے کام کیے ہیں۔ تو مجھے جو سزا چاہے دو۔ اندھا کردو۔ میرا ایک ایک عضو گل گل کر گر پڑے۔ دانہ دانہ کو محتاج ہوجاؤں۔ مجھے یہ سب منظور ہے۔ لیکن شنکھ دھر کے سر میں درد بھی ہو۔ یہ میرے لے ناقابل برداشت ہے۔

منشی۔ آپ نے کسی جوتشی سے اس معاملہ میں صلاح نہیں لی۔

راجہ۔ جی نہیں۔ کسی سے نہیں۔ جو بات صریح دیکھ رہا ہوں اسے کسی سے کیا پوچھوں۔ کوئی کفارہ اس بلا کو رد نہیں کر سکتا۔ کفارہ سے مشیت میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ دفعیات کی حقیقت خوب سمجھتا ہوں منشی جی! لیکن کچھ بھی ہو۔ میں تقدیر کی کٹھ پتلی نہ بنوں گا۔ میں اسے کچل دوں گا۔ جیسے کوئی زہریلے سانپ کو کچل دیتا ہے۔ اپنی تباہی اپنی آنکھوں دیکھنے سے قلق ہوتا ہے۔ میں اس مکارہ کو یہ موقعہ نہ دوں گا۔ وہ مجھے رلا کر آپ ہنسے۔ میں آج دنیا کے سب سے خوش نصیب آدمیوں میں سے ہوں۔ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میرے بعد میری تعمیر کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا مجھے غم نہیں۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ اس حالت میں بھی آپ نغمہ کا لطف کیوں کر اٹھا سکتے ہیں۔

منشی جی نے عالمانہ انداز سے کہا۔ میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں رویا۔ ایشور نے جس حالت میں رکھا۔ اسی میں خوش رہا۔ فاقے بھی کیے ہیں۔ اور آج خدا کے فضل سے دس کو کھلا کر کھاتا ہوں۔ پر رہا ایک ہی رس۔ نہ ساتھ کچھ لایا ہوں نہ لے جاؤں گا۔ فضول کیوں روؤں؟

راجہ۔ آپ ایشور کو رحیم سمجھتے ہیں؟ رحم اُسے چھو بھی نہیں گیا۔

منشی۔ میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔

راجہ۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ وہ انتہا درجہ کا ظالم ہے۔ بے رحم اور مکار ہے۔ جسے اپنے ہی بنائے ہوئے مخلوق کو ستانے میں مزا آتا ہے۔ جو اپنے بچوں کے بنائے ہوئے گھروندے روندتا پھرتا ہے۔ آپ اسے رحیم کہیں۔ سنسار اسے رحیم کہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اگر میرے ہاتھوں میں قوت ہوتی۔ تو میں اس کا یہ سارا نظام الٹ پلٹ دیتا۔ اس میں دنیا کو پیدا کرنے کی قوت ہے۔ اسے چلانے کی نہیں۔

راجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چلتے چلتے تشویشناک لہجہ میں بولے۔ جو بات پوچھنے آیا تھا۔ وہ تو بھول ہی گیا۔ آپ نے سادھو سنتوں کی بہت خدمت کی ہے۔ مرنے کے بعد روح کو کسی قسم کا تکلیف تو نہیں ہوتی۔

منشی۔ سنا تو یہی ہے کہ ہوتی ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ جتنی قید حیات میں۔

راجہ۔ جھوٹی بات ہے۔ بالکل جھوٹی۔ یقین نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے دکھ سکھ

اور ہی قسم کے ہوں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کسی بات کی یاد ہی نہ رہتی ہوگی۔ جنت دوزخ یہ سب دنیا داروں کے گورکھ دھندے ہیں۔ میں ان میں نہ پڑوں گا۔ اپنے تئیں ایشور کے رحم اور قہر کے دھوکے میں نہ ڈالوں گا۔ میرے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ آپ سے اتنا کہنا ہے کہ اہلیا کو تسلی دیتے رہئے گا۔ منورما کی طرف سے میں بے فکر ہوں۔ وہ ہر ایک حالت میں مستقل رہ سکتی ہے۔ اہلیا اس بجلی کی چوٹ کو نہ سہ سکے گی۔

منشی جی نے مضطرب ہوکرراجہ صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور باچشم تر بولے آپ اتنے مایوس کیوں ہورہے ہیں۔ ایشور پر توکل رکھئے۔ سب خیریت ہوگی۔

راجہ۔ کیا کروں۔ میرا دل آپ کا سا نہیں ہے۔ شنکھ دھر کی صورت دیکھ کر میرا خون سرد ہوجاتا ہے۔ وہ میرا نواسا نہیں دشمن ہے۔ اس سے کہیں اچھا ہوتا کہ میں بے اولاد رہتا۔

راجہ صاحب دروازہ کی طرف چلے۔ منشی جی بھی ان کے ساتھ موٹر تک آئے۔ راجہ صاحب کے ان صبر شکن الفاظ نے ان کے حواس مختل کردیے تھے۔ لیکن نظروں سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ گویا جان بخشی کی التجا کررہے ہوں۔

راجہ نے موٹر پر بیٹھ کر کہا۔ آپ تکلیف نہ کیجیے۔ میں نے جو التجا کی ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔

منشی جی صورت تصویر کھڑے رہے۔ موٹر چلی گئی۔

(55)

شنکھ دھر زاہد صفت شاہزادہ تھا۔ عیش کی کسی چیز کی طرف اس کی طبیعت مائل نہیں۔ دوسروں سے وہ بہت شفقت اور محبت سے پیش آتا ہے۔ اہلیا اور منورما کے پاس وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ دادا اور دادی کے پاس جاکر اس کے قہقہوں کی پٹاری کھل جاتی ہے۔ لیکن سیروشکار سے ذرا بھی ملتفت نہیں ہوتا۔ گوشہ تنہائی میں بیٹھا ہوا وہ ہمیشہ کسی گہرے خیال میں محو رہتا ہے۔ اس کے جی میں بار بار آتا ہے کہ

باپ کے پاس چلا جائے۔ مگر گھر والوں کے رنج و غم کے خوف سے جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جب اس کے باپ نے راہ حق میں اپنے آپ کو قربان کردیا۔ تو وہ کس دل سے دنیا کی لذتوں کا لطف اٹھائے۔ نرم تکیے اس کے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں۔ لذیذ کھانے اُسے زہر کی طرح لگتے ہیں۔

پر سب سے پر اسرار پہلو یہ ہے کہ وہ کملا سے مطلق ملتفت نہیں ہوتا۔ حسن وشباب کی رانی کملا وہ تقویٰ وطہارت کی رانی کملا نہیں ہے۔ شباب اپنے ساتھ شباب کی امنگیں بھی لایا ہے۔ وہ نت نئے روپ بدل کر شنّاہ دھر کے پاس جاتی ہے۔ پر عین اسی وقت شنّاہ دھر کو کسی اشد ضرورت سے باہر جانا پڑتا ہے۔ یا کوئی علمی اور مذہبی بحث چھڑ جاتی ہے۔ راتوں کو بھی شنّاہ دھر مطالعہ یا تصنیف میں غرق رہتا ہے۔ کملا اس کے پاس بار بار آتی ہے اور دعوتِ حسن دے کر لوٹ جاتی ہے۔ اسے دورِ ماضی کی ساری داستان یاد ہے۔ پر وہ اس قصے کو بھول جانا چاہتی ہے۔ اس سے اُسے رنج ہوتا ہے۔

نصف شب گذر چکی ہے۔ فطرت مترنم خموشی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سنہری چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ درختوں کے نیچے کتنا خوبصورت جال بچھا ہوا ہے۔ ندیوں میں کسی دلآویز گلگاریاں ہورہی ہیں۔ کائنات حسن کے نغمہ میں سرشار ہے۔

رانی کملا نے آج اپنے مرصع زیورات اُتار دیے ہیں۔ گیسوئے عنبریں کھول دیے ہیں۔ اور جوگنی کے روپ میں پریم کی بھکشا مانگنے جارہی ہے۔ آرائیشوں سے بے نیاز ہوکر اس کا حسن چاند کے سادہ حسن کی طرح چمک اٹھا ہے۔ وہ آئینہ کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ آئینہ جگمگا اُٹھا۔ کمرہ سے باہر نکلی۔

دفعتاً اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں سے آواز آئی۔ خبردار! اس کے پاؤں رُک گئے۔ اس نے سہمی ہوئی آنکھوں سے ادھرادھر دیکھا۔ پھر آگے بڑھی۔

ہوا تیز ہوگئی۔ کمرہ میں کوئی چیز کھٹ کھٹ کرتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ کملا نے کمرہ میں جاکر دیکھا۔ شنّاہ دھر کی روغنی تصویر سنگ مرمر کے فرش پر گر کر چور ہوگئی تھی۔ کملا کے عضو مفلوج سے ہوگئے۔ فضائے دل میں ایک طوفانی تلاطم

ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ دم بخود کھڑی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔

شنکھ دھر دیوان خانہ میں بیٹھا محو خیال تھا۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟ میری زندگی اوروں سے مختلف کیوں ہے؟ کیا اسی لیے کہ مجھے جو علم غیب ہے اس سے دوسرے محروم ہیں۔ اسی لیے کہ میں دوسروں کے مرگ وحیات کے دور سے بے خبر ہوں۔ کیا ہر خاص وعام کے لیے یہ دور مقرر ہیں۔ اس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا؟

کملا دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئی۔

شنکھ دھر اس کا فطری حسن دیکھ کر وجد میں آگیا۔ اب تک اس نے اس کا آرائشی حسن دیکھا تھا۔

کملا نے پوچھا اندر آؤں؟

شنکھ دھر کے دل کی گہرائیوں میں کہیں سے آواز آئی۔ خبردار! اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

کملا نے پھر پوچھا۔ اندر آؤں؟

شنکھ دھر از خود رفتہ ہوگیا۔ فضائے دل میں گونجتی ہوئی وہ صدا طوفانی تلاطم میں غرق ہوگئی۔

وہ بولا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ!

کملا کے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ مگر شنکھ دھر بے خودی کے عالم میں کمرہ سے نکلا۔ اور کملا کے ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اسی وقت ہوا تند ہوگئی۔ بجلی کی روشنی ٹھنڈی ہوگئی۔ کمرہ میں تاریکی مسلط ہوگئی۔

کملا پنجہ صیاد میں پھنسے ہوئے طائر کی طرح اکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔ مجھے چھوڑ دو۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ شنکھ دھر نے اسے آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا۔ گھر آئی لکشمی کو کون چھوڑتا ہے؟

کملا پر بھی بے خودی طاری ہوگئی۔ بولی۔ میں خود نہ آتی تو تم التفات بھی نہ کرتے۔

شنکھ دھر نے بجلی کا بٹن دبا کر کہا۔ لکشمی بغیر بلائے نہیں آتی کملا! کبھی نہیں۔

عاشق کے دل سے ہمیشہ تمناؤں کی صدا نکلتی رہتی ہے۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہے۔ پر اس کے روئیں روئیں سے التجا نکلتی رہتی ہے۔

کملا کا فرقت نصیب دل بے تاب ہوگیا۔ ہجرازل سے تڑپتی ہوئی حسرتیں شمع کے دم آخر کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے اپنا سر شنکھ دھر کے سینہ پر رکھ دیا۔ اور اس کے گلے کو بازوؤں سے گویا ہمیشہ کے لیے باندھ لیا۔

شنکھ دھر کو ایسا معلوم ہوا کہ زمین نیچے بیٹھی جاتی ہے اور آسمان اوپر اُڑا جاتا ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر پر ایک بجلی سی گری۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔

کملا کے منہ سے ایک جان سوز آہ نکل گئی۔ کتنی عارضی بہار تھی۔ اس نے شنکھ دھر کے زرد منہ کی طرف پر خوف آنکھوں سے دیکھا۔ چراغ کی روشنی ماند ہورہی تھی۔ گھبرا کر بولی۔ پیارے! تمھیں کیا ہوگیا؟ ہائے! تم یہ کیسے ہوئے جاتے ہو؟ ذرا آنکھیں کھول دو! دیکھو تمھاری کملا رورہی ہے۔

شنکھ دھر نے آنکھیں کھولیں۔ ان میں ناقابل بیان درد تھا۔ ناقابل برداشت غم اور ناقابل اظہار تشنگی! اس نے پر حسرت لہجہ میں کہا۔ دیوی! رخصت! ہم پھر اپنی آرزوئیں لیے جدا ہوتے ہیں۔ ہم آزمائش میں پھر ناکام رہے۔ مرگ وزیست کے یہ دور اس وقت تک چلتے رہیں گے۔ جب تک محبت نفس کی آلائیشوں سے پاک نہ ہوگی۔ ہرانسانی وجود کسی نہ کسی غیبی مشیعت کا حامل ہوتا ہے۔ ہماری زندگی اسی آزمائیش کے لیے مخصوص ہے۔

چاندنی اب بھی چھٹکی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے اب بھی چاندنی کا جال بچھا تھا۔ لہروں پر اب بھی چاندنی ناچ رہی تھی۔ مگر رانی کملا کے لیے دنیا تاریک تھی بے حیات!

دفعتا راجہ بشال سنگھ آکر دروازے پر کھڑے ہوگئے۔

رانی کملا ماتم کررہی تھی۔ وہ ماتم جس کا یہ تیسرا دور تھا۔ اس کی شہرت اور تلخی اور جنون کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

راجہ صاحب یہ صدائے درد سنتے ہی گویا ندی میں پھسل پڑے۔ ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئیں۔ ہونٹ کھلے ہوئے۔ گویا جان کے نکلنے کا دروازہ کھول دیا

گیا ہو۔

انھوں نے ہونہار کو زیر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ہونہار نے انھیں خاک میں ملادیا۔ وہ ہونہار کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بننا چاہتے تھے۔ ہونہار نے دکھادیا۔ تم مٹی کے کھلونے ہو۔ جس چوٹ سے بچنے کے لیے وہ موت کے دامن میں چھپتے رہے تھے۔ وہ چوٹ برقی تندی اور تیزی سے ان کے سر پر پڑگئی۔ آج ہی وہ منشی بجردھر کے پاس سے دل کے پھپھولے پھوڑ کر لوٹے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کریں غیب نے ان کی آرزوئیں کا خاتمہ کردیا۔

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد راجہ صاحب کو ہوش آیا۔ کمرہ میں جاکر شنکھ دھر کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ان کی زندگی کا چراغ بجھا پڑا تھا۔ آج سے پچاس سال قبل انھوں نے انھیں آنکھوں سے یہی نظارہ دیکھا تھا۔ یہی شنکھ دھر تھا۔ ہاں! یہی شنکھ دھر تھا۔ یہی کملا تھی۔ یہی سب کچھ تھا۔ اس وقت دل کی خواہشیں بھری ہوئی تھیں۔ آج وہ خواہشیں فنا ہوگئی تھیں۔

ان کی زبان سے ماتم کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گری۔ کھڑے کھڑے زمین پر گر پڑے اور زندگی کا پردہ گرگیا۔

(56)

شنکھ دھر کے چلے آنے کے بعد چکردھر کو یہ عالم ویران نظر آنے لگا۔ خدمت کا وہ جوش رخصت ہوگیا۔اسی خوش رونوجوان کی صورت آنکھوں میں پھرا کرتی۔ کھانا کھانے بیٹھتے تو اس کی جگہ خالی دیکھ کر ان کے حلق میں لقمہ نہ جاتا۔ ہر وقت کچھ کھوئے سے رہتے۔ بار بار یہی جی چاہتا کہ اس کے پاس چلاجاؤں۔ شنکھ دھر جس کمبل پر سوتا تھا۔ اسے روز جھاڑ پونچھ کر رکھ دیتے ہیں۔ گویا وہ آنے والا ہے۔ صرف چند دنوں کے لیے چلا گیا ہے۔ شنکھ دھر اپنی خنجری چھوڑ گیا ہے۔ وہ بڑی حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ کوئی اسے چھونے نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ چکردھر کے پرانے کرتے اور پھٹی ہوئی دھوتیاں بھی دُھلا کر رکھ دی گئی ہیں۔

شام ہوگئی ہے۔ چکردھر رخصتی کی تیاری کررہے ہیں۔ اب یہاں نہیں رہا

جاتا۔ اس نوجوان کے دیدار کا اشتیاق اب روکے نہیں رکتا۔

گاؤں کے چودھری نے آکر کہا۔ مہاراج! آپ فضول گٹھڑی باندھ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کی محبت آپ کو راستے سے کھینچ لائے گی۔ آپ ہماری غرض نہ سنیں۔ لیکن پریم کی رسی کو کیسے ترائیے گا۔

چودھری کا چھوٹا بچہ نیچے رکھی ہوئی خنجری اٹھاکر بجانے لگا۔ چکردھر نے اس کے ہاتھ سے خنجری چھینتے ہوئے کہا۔ ہمیں دے دو۔ بیٹا پھٹ جائے گی۔

لڑکے نے روکر کہا۔ ہم خنجری لیں گے۔

چودھری نے چکردھر کی طرف دیکھ کر کہا۔ بابو جی کے چرن چھوؤ۔ تو دلادوں۔

چکردھر بولے۔ نہیں بھائی یہ خنجری اسی لڑکے کی ہے۔ جو کئی دنوں میرے پاس رہا تھا۔ دوسرے کی چیز کیسے دے دوں؟

گاؤں کے بہت سے آدمی جمع ہوگئے۔ چکردھر روکر اور رُلاکر رخصت ہوئے۔

لیکن دوسرے دن علی الصبح جب لوگ مندر میں پوجا کرنے آئے تو دیکھا۔ بابا بھگوان داس چبوترے پر جھاڑو لگارہے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا۔ ہم کہتے تھے مہاراج نہ جائیے۔ آخر ہماری بھگتی آپ کو کھینچ لائی نا۔ اب اسی گاؤں میں آپ کو کٹی بنانی پڑے گی۔

چکردھر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ابھی کچھ دن یہاں اور دانہ پانی ہے بھائی!

چکردھر نے دل میں ارادہ کیا۔ اب شنکھ دھر کا خیال دل میں نہ لاؤں گا۔ وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہو۔ ممکن ہے۔ اس کا تلک بھی ہوگیا ہو۔ اب اسے میری یاد بھی نہ آتی ہوگی۔ میں فضول اس کے لیے اتنا پریشان ہوں۔

پھر سوچا۔ ایک بار دیکھ آنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ کوئی مجھے باندھ تو رکھے گا نہیں ذرا دیکھوں۔ کس شان سے راج کرتا ہے۔ میری نصیحتوں کا کچھ اثر ہوا یا نہیں۔ دُھن کا پکا تو ہے۔ مگر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ انسان ایک معمہ ہے۔ مجھے دیکھ کر شاید جھینپے۔ مگر میں اس کے پاس جاؤں ہی کیوں۔ دور ہی سے۔ دیکھ کر کیوں نہ چلا آؤں!

یہی سوچتے سوچتے چکردھر سوگئے۔ رات کو انھیں ایک ہولناک خواب نظر آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شنکھ دھر ندی کے کنارے ان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ دفعتاً دور سے

ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس میں سے منا سنگھ اتر پڑا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ بابو جی! یہی راجکمار ہے نا؟ میں بہت دنوں سے انھیں تلاش کر رہا ہوں۔ راجہ صاحب انھیں بلا رہے ہیں۔ شنکھ دھر اُٹھ کر منا سنگھ کے ساتھ چلا۔ دونوں کشتی پر بیٹھے۔ منا سنگھ ڈانڈ چلانے لگا۔ شنکھ دھر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انھیں بلایا۔ وہ دوڑے پر کشتی ڈوب گئی۔ ایک لمحہ میں کشتی اوپر آگئی۔ منا سنگھ سابق کی طرح ڈانڈ چلا رہا تھا۔ مگر شنکھ دھر کا پتہ نہ تھا۔

چکر دھر زور سے چیخ مار کر جاگ اُٹھے۔ ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:۔ ایشور! یہ خواب ہے یا شدنی؟

اسی وقت اُٹھ بیٹھے بقچہ اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی قطاریں گور غریباں کی طرح سنسان تھیں۔ چکر دھر قدم بڑھائے ہوئے پتھریلی پگ ڈنڈیوں پر چلے جا رہے تھے۔ ان کی حالت وہ تھی جب اپنے کو اپنی خبر نہیں ہوتی۔ وہ ساری رات پتھریلے راستہ پر چلتے رہے۔ صبح سویرے ریلوے اسٹیشن ملا۔ گاڑی آئی۔ اس پر جا بیٹھے۔ گاڑی میں کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چکر دھر کو دیکھ کر وہ آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے۔ ان سے کیسے کیسے سوالات کر رہے تھے۔ ان سوالات کا وہ کیا جواب دیتے تھے۔ راستہ میں کون کون اسٹیشن ملے۔ کب دوپہر۔ کب شام، ان کی کیفیات کی انھیں بالکل خبر نہ تھی۔ مگر وہ کر وہی رہے تھے جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔ کسی بات کا الٹا پلٹا جواب نہ دیتے تھے۔ جن گاڑیوں پر بیٹھنا چاہیے تھا۔ ان پر نہ بیٹھتے تھے۔ جن اسٹیشنوں پر نہ اُترنا چاہیے وہاں نہ اترتے تھے۔ عادت اکثر ہوش کی قائم مقام ہو جایا کرتی ہے۔

تیسرے دن سویرے گاڑی کاشی جا پہنچی۔ جوں ہی گاڑی گنگا کے پُل پر پہنچی۔ چکر دھر جیسے ہوش میں آگئے۔ سنبھل بیٹھے۔ گنگا کے بائیں کنارے پر ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ دوسری طرف کاشی کی سر بفلک عمارتیں، مندروں کی کلس اور مسجدوں کے مینار نستعلیق تحریر کی طرح اپنی موزوں پستی وبلندی کے ساتھ شفق صبح میں منقوش تھے۔ وسط میں گنگا کا حاشیہ تھا۔ آفتاب کی گلکاریوں سے مرصع۔ آج بہت دنوں کے بعد یہ دلآویز منظر دیکھ کر چکر دھر کے دل میں عقیدت کا ایک دریا موجزن ہو گیا۔ ایک لمحہ

کے لیے وہ اپنے سارے تفکرات بھول گئے۔ بچپن کا ماضی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جب انھیں گھاٹوں پر کھیلتے تھے۔ گنگا کی گود میں غوطے لگاتے تھے۔ خوش فعلیاں کرتے تھے۔ ایک بار اس رسم کہن کو تازہ کرنے کا اشتیاق پیدا کیا۔ شاید اس گود میں وہ سکون ملے۔ جس کے لیے روح تڑپ رہی تھی۔

اسٹیشن پر کئی پرانے احباب سے ملاقات ہوگئی۔ ان کی صورتیں کتنی تبدیل ہوگئی تھیں۔ وہ چکردھر کو دیکھ کر چونکے۔ خیریت پوچھی اور چلے گئے۔ چکردھر نے دل میں کہا۔ کتنے روکھے لوگ ہیں کسی کو دوچار باتیں کرنے کی بھی فرصت نہیں !

وہ گنگا شنان کرنے چلے گئے۔ راستہ میں گروسیوک سنگھ موٹر پر سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ موٹر روک کر پوچھا۔ کیا ابھی آرہے ہیں؟

جی ہاں! چلا ہی آتا ہوں۔

گروسیوک نے فوراً موٹر بڑھادی۔ چکردھر کو ان سے اتنی بے اعتنائی کی امید نہ تھی۔ اس کا بہت ملال ہوا۔

دشا سمیدھ گھاٹ پر وہ تانگے سے اُترے۔ اسی گھاٹ پر وہ پہلے بھی شنان کیا کرتے تھے۔ سبھی پنڈے انھیں جانتے تھے۔ پر آج کسی نے بھی خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم نہ کیا۔ کسی نے پوچھا۔ کہاں کہاں کی سیر کی۔ اتنے دن کہاں پھرتے رہے؟

وہ پھر تانگے پر آبیٹھے۔ اور راجہ صاحب کے محل کی طرف چلے۔ جوں جوں محل قریب آتا تھا۔ ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ تانگہ صدر دروازہ پر پہنچا۔ وہ ریاست کا جھنڈا جو سر اونچا کیے لہراتا تھا جھکا ہوا تھا۔

تانگہ دیکھتے ہی بوڑھا دربان آکر کھڑا ہوگیا۔ چکردھر کو غور سے دیکھ کر اور اندر کی طرف دوڑا۔ ایک لمحہ میں محل میں کہرام مچ گیا۔

کس سے پوچھیں۔ کیا قیامت برپا ہوئی ہے۔ کوئی قریب نہیں آتا۔ سب کے سب دور سر جھکائے کھڑے ہیں۔ وہ کون لاٹھی ٹیکتا چلا آتا ہے۔ ارے یہ تو منشی بجردھر ہیں۔ چکردھر تانگے سے اُتر کر ان کے قدموں پر گر پڑے۔

منشی جی نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ دوچار دن پہلے نہ آتے بنا کہ لڑکے کا منہ دیکھ لیتے۔ اب آئے ہو۔ جب ستیاناس ہوگیا۔ کیا بیٹھے بیٹھے یہی منا رہے تھے؟

چکردھر روئے نہیں۔ مستقل انداز سے بولے۔ ایشور کی مرضی میں کسی کو کیا دخل۔ مجھے کسی نے ایک خط بھی تو نہ لکھا۔ بیماری کیا تھی؟

منشی۔ بیماری کیا تھی۔ سر میں درد تک نہ ہوا۔ بس ہونہار! تقدیر! رات کو کھانا کھاکر بیٹھے۔ کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ بہوجی سے باتیں کرتے کرتے جنت کی راہ لی۔ جو سنتا ہے دانتوں انگلی دبا کر رہ جاتا ہے۔ بچارے راجہ صاحب بھی اسی غم میں چل بسے۔ تم نے لڑکے کو بھلادیا۔ پر اُسے مرتے دم تک تمھارے نام کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بچارے کے دل میں کیسے کیسے ارمان تھے۔ ہم اور تم کیا روئیں گے روتی ہے رعیت۔ اتنے ہی دنوں میں ساری ریاست اس پر جان دینے لگی تھی۔ اس دنیا میں کوئی کیا رہے۔ جی سیر ہوگیا۔ اب تو جب تک رونا ہے۔ ایشور بڑا ظالم ہے۔

چکردھر نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ایشور کو الزام نہ دیجیے!

منشی۔ تو تم نے ایسے اعمال کیے ہوں گے۔ میں نے نہیں کیے۔ مجھے کیوں اتنی بڑی چوٹ لگائی۔ میں بھی اب تک ایشور کو منصف اور رحیم کہتا تھا۔ لیکن اب وہ اعتقاد نہیں رہا۔ بھجن کرتے ساری عمر ختم ہوگئی۔ اس کا یہ حاصل۔ اس پر کہتے ہو ایشور کو الزام نہ دیجیے۔ اپنی بہتری ہی کے لیے تو آدمی بھجن کرتا ہے یا کسی کی زبان کھجلاتی ہے۔ قسم لے لو۔ جو آج سے کبھی ایک پد بھی گاؤں۔ توڑ ڈالا ستار۔ سارنگی۔ سرود۔ پکھاوج چور چور کرڈالے۔ ایسے ظالم کے گن کون گائے اور کیوں گائے۔ بھلے آدمی! کھڑے تاک رہے ہو۔ تمھاری آنکھوں سے آنسو کیوں نہیں نکلتے۔ میں کہتا ہوں رولو۔ نہیں تو کلیجہ میں ناسور پڑجائے گا۔ بڑے بڑے تیاگی دیکھے ہیں۔ لیکن جو پیٹ بھر کر رویا نہیں۔ اُسے پھر ہنستے نہیں دیکھا۔ آؤ اندر چلو۔ بہو نے دیوار سے سر پٹک دیا۔ پٹی باندھے پڑی ہے۔ تمھیں دیکھ کر شاید اُسے کچھ تسکین ہو۔

یہ کہتے ہوئے منشی جی نے ان کا ہاتھ پکڑلیا اور محل میں لے گئے۔ اہلیا کو ان کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ اُٹھنا چاہتی تھی۔ پر اُٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

چکردھر نے سامنے آکر کہا۔ اہلیا!

اہلیا نے لیٹے لیٹے شوہر کی جانب دیکھا۔ کتنی حسرت تھی۔ کتنا شکوہ۔ کتنی یاس

اور کتنی ندامت! چکردھر رو پڑے۔ اہلیا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انھیں نمسکار کیا۔ اور پھر آنکھیں بند ہوگئیں۔

اسی وقت منورما آگئی۔ اہلیا کی طرف دیکھ کر بولی۔ بس آپ ہی کا انتظار تھا۔ جان توکب کی نکل چکی تھی۔ ہائے! دُکھیا کی آرزو نہ پوری ہوئی۔

تتمہ

کئی سال گذر گئے ہیں۔ منشی بجردھر اب قید حیات میں نہیں رہے۔ گھوڑے کی سواری کا انھیں بے حد شوق تھا۔ نرگھوڑے ہی پر سوار ہوتے تھے۔ بگھی۔ موٹر۔ پالکی کو وہ زنانہ سواری کہتے تھے۔ ایک دن جگدیش پور سے بہت رات گئے لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں ایک نالا پڑتا تھا۔ نالے میں اترنے کے لیے راستہ بھی بنا ہوا تھا۔ لیکن منشی جی نالے میں اُتر کر اسے پار کرنا شان جوانمردی کے خلاف سمجھتے تھے۔ گھوڑے کو جست کرادیا۔ گھوڑے نے جست ماری۔ اس پار نکل گیا۔ پر اُس کے پاؤں ایک گڑھے میں جاپڑے۔ منشی جی بھی گرے اور پھر نہ اٹھے۔ ہنس کھیل کر زندگی کاٹ دی۔ نرملا بھی اس صدمہ سے باہر نہ ہوسکی۔ اس کی آخری آرزو کہ چکردھر پھر شادی کرلیں۔ ناتمام رہ گئی۔

رانی کملا پھر جگدیش پور میں راج کررہی ہے۔ عیش پسند دیوپریا اب عبادت گذاردیوپریا ہے۔ اس کا مستقبل اب تاریکی میں مستور نہیں ہے۔ نورسحر کی پُرامید سرخی اس کی منزل حیات کو روشن کررہی ہے۔

رانی منورما اب نئے محل میں رہتی ہیں۔ انھوں نے کتنی ہی چڑیاں پال رکھی ہیں انھیں کی نگرانی اورپرورش میں اب وہ زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔ طیور کے نغموں میں اپنے خلش ہائے باطن کو دُبا دینا چاہتی ہیں۔ اس کی آرام گاہ میں سونے کے چوکٹوں میں جڑی ہوئی ایک لوح دیوار سے لٹکی ہوئی ہے۔ جس پر دیوان ہری سیوک سنگھ کے آخری الفاظ منقوش ہیں:۔

لونگی کو دیکھو!

چکردھر بہت دنوں گھر پر نہ رہے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد وہ گھر گھر ہی نہ رہا۔ پھر دکن کی راہ لی۔ لیکن اب وہ صرف عوام کی خدمت نہیں کرتے انھیں طیور سے خاص شفقت ہوگیا ہے۔ عجیب وغریب طائروں کی انھیں ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ ان کی چڑیوں کا ایک چڑیا گھر ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ منورما باغ میں ٹہل رہی تھی۔ دفعتاً حوض کے پاس ایک خوبصورت پنجرا نظر آیا۔ اس میں ایک پہاڑی مینا بیٹھی ہوئی تھی۔ منورما کو تعجب ہوا یہ پنجرا یہاں کیسے آیا۔ ایسی خوبصورت چڑیا اس کے پاس ایک بھی نہ تھی۔ وہ قریب گئی۔ تو مینا بولی۔

نورا! ہمیں بھول گئیں؟ تمھارا پُرانا خادم ہوں۔

منورما کے استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ اُسے کچھ خوف ہوا۔ اسے میرا نام کس نے پڑھایا؟ کس کی چڑیا ہے؟ یہاں کیسے آئی؟ اس کا آقا ضرور یہیں کہیں ہوگا۔ آتا ہوگا۔ دیکھوں کون ہے؟

وہ بڑی دیر تک کھڑی اس آدمی کا انتظار کرتی رہی۔ جب کوئی نہ آیا۔ تو اس نے باغبان کو بلاکر پوچھا۔ یہ پنجرا باغ میں کون لایا؟ مالی نے کہا۔ پہچانتا تو نہیں سرکار! پر ہیں کوئی بھلے مانس۔ مجھ سے دیر تک ریاست کی باتیں پوچھتے رہے۔

آج پھر آویں گے؟

ہاں سرکار! کہہ تو گئے ہیں۔

آئیں تو مجھے خبر دینا۔

بہت اچھا سرکار!

صورت کیسی ہے؟ بتا سکتا ہے؟

لمبا قد ہے۔ سانولا رنگ۔ لمبا منہ۔ دُبلے دبلے سے ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔

منورما نے اشتیاق سے کہا۔ مجھے ضرور بلالینا۔ جانے نہ دینا سمجھا؟

وہ پنجرا لے کر چلی گئی۔ رات بھر وہی مینا اس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔ وہی

جملہ کانوں میں گونجتا رہا۔

صبح وہ اٹھ کر باغ میں آئی۔ شاید وہ آئے ہوں گے۔ مگر مالی ابھی تک سوتا تھا

وہ آدمی کون ہے؟ یہ اب منورما سے پوشیدہ نہ تھا۔

ہر آدھ گھنٹے میں رانی کی لونڈی مالی کے پاس آکر پوچھتی تھی۔ وہ آئے؟ ہر بار جواب ملتا۔ ابھی نہیں!

سہ پہر کو منورما سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ اپنے بالاخانہ پر جاکر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ وہاں سے مالی کا مکان اور باغ صاف نظر آتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے بڑی دیر ہوگئی۔ اندھیرا ہونے لگا۔ رانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ شاید اب نہ آویں گے۔

یکایک اس نے دیکھا۔ ایک آدمی دو پنجرے دونوں ہاتھوں میں لٹکائے باغ میں آیا۔ منورما کا سینہ بانسوں اچھلنے لگا۔ ہزاروں گھوڑوں کی طاقت والا انجن اسے اس آدمی کی طرف کھینچتا ہوا معلوم ہوا۔ پر دونوں ہتھوں سے تھامے سانس بند کیے وہ کھڑی رہی۔ مالی ابھی اسے بلانے آتا ہوگا۔ مگر مالی نہ آیا۔ اور وہ آدمی وہیں پنجرا رکھ کر چلا گیا۔ منورما اب وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ ہائے ! وہ چلے جارہے ہیں! اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے!

مالی نے آکر کہا۔ سرکار! وہی آدمی دو پنجرے رکھ گیا ہے اور کہہ گیا ہے۔ پھر کبھی اور چڑیاں لاؤں گا۔

منورما نے غضبناک ہوکر پوچھا۔ تو نے اسی وقت مجھے کیوں اطلاع نہیں دی؟

مالی پنجرے کو زمین پر رکھتے ہوئے بولا۔ سرکار! میں تبھی آرہا تھا پر اُسی آدمی نے منع کیا۔ کہنے لگا۔ ابھی انھیں کیوں بلاؤ گے۔ میں پھر کبھی آکر ان سے ملوں گا۔

رانی کچھ نہ بولی۔ پنجرے کی دونوں چڑیوں کو پُراشک آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے۔ پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعد ازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے علاوہ دینک ٹریبون چنڈی گڑھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔